دعوت الی اللہ

اور

انبیاءِ کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طریقِ کار

تصنیف

الاستاذ محمد سرور بن نایف زین العابدین

ترجمہ

محمد خالد سیف

طارق اکیڈمی

ایس اے سنٹر چنیوٹ بازار فیصل آباد

☎ 34307-642958

آئینہ فہرست

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیغام

حافظ محمد یحیٰ عزیز میر محمدی حفظہ اللہ تعالی

دعوت الی اللہ امت مسلمہ کا فریضہ ہے اس جہاد اکبر کی قبولیت اور کامیابی کے لئے انبیاء علیہم السلام کا طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے کیونکہ وہ اللہ تعالی کی پسند اور ہدایات کے مطابق ہوتا ہے سنت انبیاء سے ہٹ کر جو تبلیغ کی جائے گی وہ کسی کے لئے تفریح طبع اور کان کا چسکا ہوگی یا کسی کی دل آزاری اور تنفر کا سبب بنے گی۔

شیخ محمد سرور بن نایف زین العابدین نے اس موضوع پر کتاب لکھ کر امت پر بڑا احسان فرمایا اور مولانا محمد خالد سیف نے اس کو اردو زبان میں ڈھال کر ہمارے لئے آسانی پیدا کر دی ہے ہر وہ مسلمان جس کے دل میں تبلیغ کا شوق ہے اسے اس کتاب سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہیے اور مصنف و مترجم کیلئے قبول و رفع درجات کی دعا کرنی چاہیے۔

محمد یحیٰ عزیز میر محمدی

بسم الله الرحمن الرحيم

وما توفيقي إلا بالله

منهج الانبياء في الدعوة إلى الله

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرضِ مترجم

اگرچہ دُنیا کے اس سٹیج پر لاکھوں قسم کے کروڑوں اصحابِ کمال گزرے ہیں چشمِ فلک نے بارہا بڑے بڑے شاہانِ عالم کا نظارہ کیا ہے۔ شجاعتوں اور بسالتوں کے جوہر دکھانے والے سپہ سالاروں کو دیکھا ہے۔ بڑے بڑے دانشوروں، حکماء اور فلسفیوں کا مشاہدہ کیا ہے فاتحینِ عالم کی پُرہیبت صفیں دیکھی ہیں، شعراء و ادباء کی رنگین محفلوں کو دیکھا ہے، شان و شکوہ کے قصرِ زرنگار اور زر و جواہر کے انبار کے مالک دولت مندوں کو دیکھا ہے اور یہ بھی دیکھا ہے کہ اپنے اپنے میدان کے ان شہسواروں اور اپنے اپنے فن کے ان ماہروں نے بنی نوعِ انسان کی سعادت کے لیے کچھ نہیں کیا؟ ان میں سے کوئی طبقہ ایسا نہیں اور کسی طبقہ کا کوئی بھی فرد ایسا نہیں جس کی زندگی انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ اور نمونہ قرار پاسکتی ہو!

سکندر، سیزر، دارا اور نپولین کی زندگی کسی کے لیے کیا اُسوہ ہو سکتی ہے؟ سقراط، بقراط، افلاطون اور ارسطو کی زندگی ہر انسان کے لیے کیسے نمونہ قرار پاسکتی ہے؟ نمرود، فرعون اور ابوجہل کی زندگی کس کا آئیڈیل بن سکتی ہے؟ ان فاتحینِ عالم نے اپنے لشکر ہائے جرار سے دنیا میں تہلکے تو مچا دیئے، مگر انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے کیا کیا؟ ادباء اور شعراء نے اگرچہ رنگِ محفل تو جمائے، مگر عملی دنیا میں یہ خود بے رنگ ثابت ہوئے، حکماء، فلاسفر اور دانشوروں نے اگرچہ بڑے بڑے حیرت انگیز افکار و نظریات پیش کیے، مگر سچی بات یہ ہے کہ یہ انسانیت کی ہدایت کے لیے کوئی قابلِ عمل نقشہ پیش نہ کر سکے۔ بڑے بڑے حکمرانوں اور جاہ و جلال کے مالک بادشاہوں نے بڑی بڑی حکومتیں تو قائم کرلیں اور وہ اپنی قوتوں اور طاقتوں کے باعث لوگوں کے جسموں اور قوموں کی جانوں اور مالوں پر حکم چلانے میں تو کامیاب ہو گئے، مگر کیا دلوں کی دُنیا تک بھی انہیں کوئی رسائی

نصیب ہو سکی۔؟

آج کا یہ دور سائنس اور ٹیکنالوجی کا ترقی یافتہ دور ہے۔ سائنس دانوں نے بڑی بڑی حیرت انگیز ایجادات کے ذریعے اپنے کمالات کا لوہا منوالیا ہے، تسخیر قمر کے بعد اب دیگر اجرام فلکی پر اپنی کمندیں پھینکنا شروع کردی ہیں، مگر آہ۔۔! ؎

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دُنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں اُلجھا ایسا
آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاؤں کو گرفتار کیا
زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

سائنس دانوں نے نت نئی ایجادات کے تو انبار لگا دیئے، دریاؤں اور سمندروں میں مچھلیوں کی طرح تیرنا اور فضاؤں میں پرندوں کی طرح اُڑنا تو سکھا دیا، مگر افسوس کہ یہ انسان کو انسان بن کر زمین پر چلنا نہ سکھا سکے۔ انسان کی سعادت کے لیے شاید یہ اتنا ایجاد نہیں کر سکے، جس قدر انھوں نے انسانیت کی شقاوت اور تباہی و بربادی کے سامانوں کے انبار لگا دیئے ہیں۔

انسانیت کے ان بلند پایہ طبقوں میں سے کوئی ایک طبقہ بھی ایسا نہیں جس کی زندگی ساری انسانیت کے لیے مشعلِ راہ، جس کی سیرت بنی نوع انساں کے لیے باعثِ ہدایت اور جس کے افکار و نظریات سعادتوں اور کامرانیوں کا موجب ہوں، مگر ٹھہریئے۔۔! ایک طبقے کا ذکرِ خیر ابھی باقی ہے۔ یہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کا مقدس طبقہ ہے۔ دنیا میں جہاں کہیں بھی روشنی ہے، وہ حضرات انبیاء کرام ہی کی بدولت ہے۔ دُنیا میں جہاں جہاں بھی ایمان کا نور ہے، وہ انہی کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔ انہی کے دم قدم سے کرن کرن اجالا ہوا، انہی کی کوششوں سے انسانیت کو اس کا اصل مقام و مرتبہ ملا۔ انہی کی کاوشوں سے دلوں کی دُنیا آباد ہوئی اور انہی کی برکتوں سے تباہ حال انسانیت شاد کام ہوئی۔

یہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہی کی مقدس تعلیمات تھیں، جن سے عقائد کی اصلاح ہوئی، اعمال میں نکھار پیدا ہوا، اوہام اور خیالاتِ فاسدہ کی بیڑیاں کٹ گئیں، ہدایت کے نظام قائم ہوئے، معاشرے امن، چین اور سکون کا گہوارہ بن گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ شیطانی پگڈنڈیوں پر ٹامک ٹوئیے مارتے ہوئے انسانوں کا اپنے رب تعالیٰ سے تعلق قائم ہوگیا۔

حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی زندگیاں ہی اپنے اپنے دور اور علاقے کے لوگوں کے لیے مشعل راہ تھیں، جبکہ عالمگیر اور دائمی نمونۂ عمل صرف سید الاولین و سید الآخرین، سرورِ دنیا و دین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے لہٰذا معیشت ہو یا معاشرت، حکومت ہو یا سیاست، زندگی سے متعلق ہر ہر شعبہ میں ہمیں حضرات انبیاء کرام علیہم السلام ہی کے نقشِ قدم پر چلنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے "منهج الانبياء في الدعوة الى الله" کے فاضل مصنف فضيلة الشيخ الاستاذ محمد سرور بن نايف زين العابدين حفظه الله تعالیٰ کو جنہوں نے اپنی اس کتاب میں اس بات کو موضوعِ سخن بنایا ہے کہ عصرِ حاضر میں دعوتِ دین کا کام کرنے والے افراد، جماعتوں اور تحریکوں کے لیے بھی یہ بات ازبس ضروری ہے کہ وہ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی مقدس سیرتوں کے مینارۂ نور سے کسبِ نور کریں تاکہ دعوتِ دین کے میدان میں ہماری یہ کوششیں مفید، مؤثر اور موجبِ خیر و برکت ثابت ہو سکیں۔

محمد خالد سیف

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

إن الحمد لله، نحمدہٗ ونستعینہٗ ونستغفرہٗ و
نعوذ باللہ من شرور أنفسنا وسیّاتِ اعمالنا، من
یہدہ اللہ فلا مضل لہٗ ومن یضلل فلا ھادی لہٗ
واشھد أن لا الہ الّا اللہ وحدہ لاشریک لہٗ
وأشھد ان محمّدا عبدہ ورسولہٗ۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ حَقَّ تُقَاتِہٖ وَلَا
تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ہ

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ
نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا
رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰہَ الَّذِیْ تَسَآءَلُوْنَ
بِہٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰہَ کَانَ عَلَیْکُمْ رَقِیْبًا ہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا يُصْلِحْ لَكُمْ أَعْمَالَكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ فَقَدْ فَازَ فَوْزًا عَظِيمًا۔

أَمَّا بَعْدُ:

اس کتاب کی تصنیف وتالیف کے لیے مجھے دو باتوں نے مجبور کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ میں نے دیکھا ہے کہ جمہور مسلمانوں میں جہالت کا دور دورہ ہے اور ان میں سے بہت سے اچھے لوگ بھی دعوت الی اللہ کے میدان میں حضرات انبیاء کرام کے طریق کار سے ہٹ کر ایسے لوگوں کے اقوال کو اختیار کر لیتے ہیں جن کی بات غلط بھی ہو سکتی ہے اور صحیح بھی، لیکن یہ لوگ انہی پر اکتفا کرتے ہیں، چھوٹے بڑے مسائل میں اپنے شیوخ اور اساتذہ کی تقلید کرتے ہیں اور اس قدر شدید تعصب کے ساتھ ان کے افکار و آراء سے وابستہ ہو جاتے ہیں کہ یہ تعصب حد درجہ قابلِ مذمت بھی ہے اور دینِ اسلام کے مزاج اور رُوح کے منافی بھی، اس تعصب اور تنگ نظری کے باعث مسلمانوں میں اختلاف اور انتشار کی خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جا رہی ہے اور اسے پاٹنے والوں کو بے پناہ دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہی وہ سبب ہے جس کے باعث میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے۔ اُمید ہے کہ دعوت الی اللہ کے میدان میں سرگرم عمل حضرات انبیاء کرام کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں گے جو کہ معصوم تھے اور انبیاء کرام کے علاوہ دیگر لوگوں کے طریقِ کار اور اُن کے آراء و افکار کو خیر باد کہہ دیں گے۔

دوسرا سبب جس کے باعث میں نے اس موضوع پر قلم اٹھایا وہ یہ ہے کہ عقائد کی کتب ہمارے زمانہ سے بہت پہلے لکھی گئی ہیں اور ان میں اسی دور کے مسائل و مشکلات کا حل ہے جس میں وہ تصنیف کی گئی تھیں ۔۔۔ ان کتب کی اہمیت سے قطع نظر اور اس بات سے قطع نظر کہ ماضی اور حال کی بہت سی مشکلات میں مشابہت بھی ہے، ہمارے دور کی

مشکلات کا تقاضا ہے کہ انہیں ہم جدید انداز و اسلوب سے حل کریں۔ قدیم کتبِ عقیدہ کا اسلوب حد درجہ خشک بھی ہے، کیونکہ ان میں محض نصوص و احکام کے ذکر پر اکتفا کیا گیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نوجوان نسل ان کتب سے اعراض کر رہی ہے اور ان میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں پا رہی۔

ان کتبِ عقیدہ کے مقابلہ میں مجھے قرآن حکیم کا اسلوبِ بیان بہت ہی زیادہ پسند آیا ہے، کیونکہ قرآن کریم اعتقاد کے مسائل کو حضرات انبیاء کرام کی پاک سیرتوں اور مشرکوں کے ساتھ راہِ خدا میں ان کے جہاد کی تفصیلات کے ضمن میں بیان کر دیا گیا ہے، مثلاً اصنام (بتوں) کا تذکرہ کتبِ عقیدہ میں ہم اس طرح پڑھتے ہیں کہ صنم (بت) کے لغوی و شرعی معنی کیا ہیں؟ اصنام کی کتنی قسمیں ہیں؟ ان کی حرمت کے سلسلہ میں کتاب وسنت کے دلائل اور علماء کے اقوال کیا کیا ہیں؟ نیز وہ سب کچھ بیان کیا جاتا ہے، جس سے یہ معلوم ہو کہ ان کے ساتھ اعتقاد رکھنا شرک ہے۔

اس کے مقابلہ میں جب قرآن کریم بتوں کا تذکرہ کرتا ہے، تو اس کے اسلوب بیان کی شان ہی کچھ اور ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں انبیاء کرام کی اپنی اپنی امتوں سے گفتگو نقل کی گئی ہے۔ اس ضمن میں ہم دیکھتے ہیں کہ نبی کبھی تو اپنی امت کو یہ سمجھا رہا ہے کہ یہ بت کسی کام کے نہیں، ان کے قبضہ اختیار میں کوئی نفع یا نقصان نہیں اور کبھی ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ نبی بتوں کو پاش پاش کر رہا ہے —— جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کیا۔ اور کبھی ہمیں یہ منظر نظر آتا ہے کہ قوم نبی کے خون کی پیاسی اور اس کے قتل کے درپے ہے مگر وہ جرأت و استقامت کا پہاڑ بنے، اپنے موقف سے ذرہ بھر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ..... اور پھر قرآن کریم نے یہ سب کچھ منفرد اسلوب میں بیان کیا ہے، جو بڑا جاندار، بڑا پرکشش اور بہت جاذبِ نظر ہے۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے بھی قرآن کریم کے اسلوب کی اتباع کی ہے اور بحث کو درج ذیل دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

(۱) اس حصہ میں ان عظیم المرتبت انبیاء کرام علیہم السلام کی سیرتوں کو بیان کیا گیا ہے، جن کا قرآن حکیم میں ذکر آیا ہے اور اس سلسلہ میں میں نے حسب ذیل طریق کار کو پیش نظر رکھا ہے:

- قرآن کریم اور صحیح احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتماد کیا ہے اور آیات و احادیث کی شرح میں محققین علماء سلف کے اقوال کو بیان کیا ہے۔
- اہل کتاب کی روایات اور ان تمام مصادر و مآخذ سے اجتناب کیا ہے، جن پر اہل کتاب کا اعتماد ہے، کیونکہ موجودہ اناجیل تو حضرت مسیح کے صدیوں بعد لکھی گئیں، حتیٰ کہ مغربی نقاد ابھی تک اس بات پر بھی متفق نہیں ہو سکے کہ ان اناجیل کو کس نے مرتب کیا تھا۔ اسفارِ توراۃ کا بھی یہی حال ہے۔
- سیرتِ انبیاء کے سلسلہ میں جو سب کچھ وارد ہے، میں اسے ذکر نہیں کرتا اور نہ ان تمام روایات و اخبار کے بیان کرنے کا اہتمام کرتا ہوں، جن کے بارے میں عام لوگ بکثرت سوال کیا کرتے ہیں، مثلاً:
- حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کا نام کیا تھا، جس نے آپ کے ساتھ کشتی میں سوار ہونے سے انکار کر دیا تھا؟
- حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کا نام کیا تھا؟ کیا اللہ تعالیٰ نے اسے طوفان میں ہلاک کیا یا اس سے پہلے ہی اسے ہلاک کر دیا گیا تھا؟
- حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار ہونے والوں کی تعداد کتنی تھی؟

علیٰ ہٰذا القیاس اس قسم کے سوالوں کو میں نے ذکر نہیں کیا، جن کے جواب کے لیے قابلِ اعتماد صحیح روایات موجود نہیں ہیں اور پھر یہ کہ اگر ہمیں حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹے کا نام معلوم ہو بھی جائے، تو اس سے حقیقت میں کوئی تبدیلی نہیں آتی، بلکہ اس

سلسلہ میں اہم اور قابلِ غور بات یہ ہے کہ یہ عورت چونکہ مشرک تھی، اس لیے حضرت نوحؑ جیسے جلیل القدر نبی کی بیوی ہونے کے باوصف ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہے گی۔ قرآن کریم نے سابقہ امتوں کے حالات بیان کرتے ہوئے جو کچھ ذکر کیا ہے، بس اسی میں خیر و بھلائی ہے، لہٰذا ہمارے لیے یہ جائز نہیں کہ ہم اپنی تسکین کے لیے کتاب اللہ کو افسانوں میں بدل دیں۔

میں نے حضرات انبیاء کرامؑ کے واقعات کی روشنی میں اپنے دور کے حالات کا جائزہ لینے کی بھی کوشش کی ہے، مثلاً انبیاء کرام نے اپنے دور کے جن طاغوتوں سے جنگ کی، میں نے ان میں اور موجودہ دور کے طاغوتوں میں جو مشابہت پائی جاتی ہے، اسے ذکر کیا ہے اور یہ بھی بیان کیا ہے کہ ان میں سے کون سے طاغوت زیادہ خطرناک اور ظالم ہیں؛ علاوہ ازیں میں نے ان مشکلات جن سے حضرات انبیاء کرام کو سابقہ پیش آیا اور ان مشکلات میں مشابہت دکھائی ہے جو عصرِ حاضر میں دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والوں کو پیش آتی ہیں۔ ہر اس نبی کی سیرت سے جس کا اس کتاب میں ذکر آیا ہے، جو سبق حاصل ہوتے ہیں اور جو نصیحت آمیز باتیں معلوم ہوتی ہیں، میں نے ان کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور اس سلسلہ میں بھی علمی دلائل پر اعتماد کیا ہے، البتہ جو کچھ بھی لکھا ہے، اس میں میرے اپنے جذبات اور تاثرات کی جھلک بھی موجود ہے۔

(۲) دوسرے حصہ میں میں نے لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے معانی اور مدلولات کو موضوعِ سخن بنایا ہے، کیونکہ یہ ارکانِ اسلام میں سے پہلا رکن ہے، بلکہ کہنا یوں چاہیے کہ سارے کا سارا اسلام یہی ہے، اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے جملہ انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا اور اسی کے لیے جہاد کو مشروع قرار دیا گیا ہے۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ کے سلسلہ میں جن موضوعات پر میں نے قلم اٹھایا ہے، ان میں سے اُلوہیت، عبودیت، نفی واثبات اور نواقض لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اے اللہ! اس اُمت کو رُشد و بھلائی عطا فرما، اپنے اطاعت شعاروں کو عزت اور اپنے نافرمانوں کو ذلت عطا فرما، اُمت کو توفیق عطا فرما کہ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اے اللہ! مسلمانوں کو اپنے دین کی طرف لوٹا دے۔ انہیں منہاجِ نبوت سے وابستگی کی توفیق و ہدایت فرما اور ان کی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا فرما دے۔ انك سميعٌ مجيب!

۱۰ محرم ۱۴۰۳ھ

انبیاءِ کرامؑ کا طریقِ کار کیوں؟

آج سب لوگوں میں موضوعِ بحث مسلمانوں کی بیداری ہے۔ مسلمان یہ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کے حضور سجدۂ شکر بجالا رہے ہیں کہ مسجدیں نوجوان نمازیوں سے بھری ہوتی ہیں۔ سڑکوں پر بکثرت باریش مسلمان نظر آرہے ہیں۔ نوجوان لڑکیاں طویل شرعی لباس زیبِ تن کیے ہوتے نظر آرہی ہیں۔ اسلامی لٹریچر بڑی کثرت سے پھیلتا اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بنتا چلا جارہا ہے' لیکن دشمنانِ اسلام اس بیداری کو بڑے شک وریب کی نظروں سے دیکھتے ہیں اور اپنے تمام ذرائعِ ابلاغ کو اسلام اور مسلمانوں کے کردار کو مسخ کرنے کے لیے وقف کیے ہوتے ہیں' اور چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کی بیداری اور اسلام کی نشاۃِ ثانیہ سے قبل ہی اسے زندہ در گور کردیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَیَمْکُرُوْنَ وَیَمْکُرُ اللّٰہُ ۖ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ ۝	(اِدھر تو) وہ چال چل رہے تھے اور (اُدھر) خدا چال چل رہا تھا اور خدا سب سے بہتر چال چلنے والا ہے۔

دشمنانِ اسلام کے خوف و اضطراب میں یہ بات اضافہ کیے جارہی ہے کہ یہ نسل جو اپنے آقا و مولیٰ کی بارگاہ کی طرف رجوع کررہی ہے۔ اس نے ان مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی تھی، جنہیں لادینی جماعتوں اور ظلم و استبداد کی مالک عسکری شخصیتوں نے بنایا تھا، جن کا مقصود اسلام کے خلاف جنگ اور دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والے کارکنوں کا خاتمہ تھا۔

لہ سورۃ انفال، آیت ۳۰

اس عالمی اسلامی بیداری کا اوّل و آخر سبب اللہ تعالیٰ ہی کی ذاتِ گرامی ہے کہ وہی ان ظالموں کو خائب و خاسر کر رہے ہیں جو لوگوں کے خدا بنے ہوئے تھے۔ دوسری جانب اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اب اس امت میں ایسے نوجوان داعیِ دین پیدا فرما دیئے ہیں جنہوں نے درآمد شدہ افکار و آراء کو رد کر دیا ہے۔ دنیا کی لذات و شہوات سے منہ موڑ لیا ہے۔ ان کے دل حب و رضاءِ الٰہی سے سرشار ہو گئے ہیں اور ظالموں کی وعید و تہدید کا خوف ان کے پاؤں میں اب کوئی جنبش پیدا نہیں کر سکتا۔

نوجوان داعیان دین نے سابقہ طرزِ عمل کو جو خیرباد کہا ہے، بحث و مناقشہ کا موضوع بناتے وقت وہ اسے "تبدیلی" سے تعبیر کرتے ہیں اور اس تبدیلی کی مشکلات کے حل کے لیے انہوں نے اجتماعات منعقد کیے ہیں، کتابیں تصنیف کی ہیں اور خطوط و بیانات جاری کیے ہیں، لیکن افسوس کہ اس مسئلہ میں داعیان دین کے ہاں کافی اختلاف ہے اور موقف کافی مختلف ہے کہ دیگر نوجوانوں میں یہ انقلاب اور تبدیلی کیسے پیدا کی جا سکتی ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ عقلی دلائل اور سیاسی بیداری ہی سے یہ تبدیلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ انتخابات اور دیگر تمام مروجہ ڈیموکریسی طریقوں کو اپنائے بغیر یہ تبدیلی ممکن نہیں۔ کچھ دیگر نوجوانوں نے اس مقصد کے حصول کے لیے مکمل تیاری کیے بغیر جنگ کے طبلوں پر چوٹ لگا دی اور عجلت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ایسا موقف اختیار کیا کہ بہتر یہ تھا کہ اس پر عمل سے پہلے وہ خوب خوب غور و فکر کرتے۔ افسوس کہ انہوں نے اس بات کو پیشِ نظر نہ رکھا کہ جس اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کا ہم سے وعدہ فرمایا ہے، اُس نے ہمیں یہ حکم بھی تو دیا ہے کہ مادی اسباب و وسائل سے استفادہ کے سلسلہ میں بھی کسی کوتاہی و کمی کا ثبوت نہ دیں۔

اس انقلاب و تبدیلی کے سلسلہ میں مختلف مواقف اور متعدد افکار و آراء کے باوصف نوجوان داعیانِ دین کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ یہ اپنے بزرگوں کی تقلید کرتے ہیں،

خواہ اُن کے کام غلط ہوں یا درست۔ ہر اُس چیز کو بھلے لیتے ہیں جس کا انھوں نے حکم دیا ہو یا جس کی دعوت دی ہو اور اپنے ان بزرگوں کے مقابلہ میں یہ کسی تنقید یا نصیحت کو خاطر میں نہیں لاتے۔ اسی طرح ان کی اپنی یہ کوشش بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے شیخ اور بزرگ کے مرتبہ کے قریب قریب پہنچ جائیں، قریب قریب اس لیے کہ شیخ یا مرحوم قائد کے مرتبہ تک پہنچنا یہ محال سمجھتے ہیں، بلکہ جو اس قسم کا سوچے، اس کے بارہ میں یہ نہایت بُرا ظن رکھتے ہیں، لیکن ان تمام امور کے باوصف داعیانِ دین کا اس بات پر ایمان ہے کہ تجدید اور تبدیلی کی ضرورت ہے اور دلائل و براہین کو اختیار کرنا واجب ہے۔

غور فرمایئے کہ اگر صلاح الدین ایوبی صرف اسی قسم کے افکار ہی کے پابند ہوتے، تو کیا وہ دشمن کی قوتوں کو نیست و نابود کر سکتے تھے اور قدس اور بلادِ شام کو صلیبیوں، باطنیوں اور عبیدیوں کی نجاستوں سے پاک کر سکتے تھے؟ یا شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ اس بات پر قادر ہو سکتے تھے کہ لوگوں کے اس قدر بگڑے ہوئے عقائد کی اصلاح کرتے۔ تاتاریوں کے مقابلے میں مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد و اتفاق پیدا کرتے اور اس کے نتیجہ میں اس فتح و نصرت کو حاصل کرتے جس سے انہیں سرفراز کیا گیا؟

سبحان اللہ! آج معاملات کو کس طرح خلط ملط کیا جا رہا ہے! یہ داعیان دین اگر رشد و بھلائی کو اختیار کریں، اپنی عقلوں کو تبعیت و انقیاد اور اپنے نفسوں کو ضعف و جمود سے آزاد کر لیں، تو ان پر یہ حقیقت منکشف ہو جائے گی کہ وہ بھی ان مراتب بلند کو حاصل کر سکتے ہیں جن پر اُن کے شیوخ اور قائدین فائز تھے۔ اس بلند مقصود کو حاصل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ اپنے رب پر سچا یقین رکھیں اور ان اسباب سے استفادہ کریں جن کی شریعت نے اجازت دی ہے، تو پھر دیکھیں گے کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کو زمین و آسمان کی کوئی چیز عاجز و درماندہ نہیں کر سکتی کہ وہ پھر سے وہ جلوہ دکھا دے، جو اُس نے پہلے دکھائے تھے۔

بخدا! یہ بہت بڑی مصیبت ہے کہ یہ شیوخ اور قائدین، جن کی نوجوان تقلید کر رہے ہیں

یہی مسلمانوں کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کا سبب بن جائیں جیسا کہ وہ اس انقلاب کے برپا کرنے اور زمین میں نفاذِ شریعت کے سلسلہ میں ناکام رہے ہیں تو ان کے شاگرد تو بطریق اولیٰ کسی فتح و نصرت کے حصول میں ناکام رہیں گے، کیونکہ یہ اپنے شیوخ اور قائدین کے پروگرام سے اعلیٰ وارفع کسی پروگرام کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے، حالانکہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے ہمیں مذموم مذہبی تعصب سے منع فرمایا ہے اور اسے ان اسباب میں سے شمار کیا ہے جنہوں نے عیسائیوں کو شرک میں مبتلا کر دیا تھا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا وَّاحِدًا لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ۝[1]

انہوں نے اپنے علماء اور مشائخ اور مسیح ابن مریم کو اللہ کے سوا خدا بنا لیا، حالانکہ اُن کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں، اس کے سوا کوئی معبود نہیں اور وہ ان لوگوں کے شریک مقرر کرنے سے پاک ہے۔

حدیث صحیح میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کے سامنے اس مذکورہ آیت کی تلاوت فرمائی، تو انہوں نے عرض کیا یا رسول اللہ! ہم ان کی عبادت تو نہیں کیا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا: کیا یہ بات نہ تھی کہ وہ جب اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرا دیتے، تو تم بھی انہیں حلال سمجھتے تھے اور جب حلال کردہ اشیاء کو حرام ٹھہرا دیتے تو تم بھی انہیں حرام سمجھنے لگ جاتے؟ انہوں نے عرض کیا جی ہاں، یہ بات تو تھی۔ آپ نے فرمایا: بس یہی اُن کی عبادت تھی[2]

حضرت ابن عباسؓ ان صحابہ کرامؓ سے شدید ناراض ہوئے جنہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ گرامی کے مقابلہ میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے اقوال کو پیش کیا تھا اور فرمایا:

---

[1] سورۃ توبہ، آیت ۳۱ [2] اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

يوشك ان تنزل عليكم حجارة من السماء اقول قال رسول الله صلى الله عليه وسلم وتقولون قال ابوبكر وعمرؓ؟	مجھے خدشہ ہے کہ تم پر کہیں آسمان سے پتھر نہ برسیں کہ میں تو کہتا ہوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے اور تم کہتے ہو کہ ابوبکرؓ و عمرؓ نے یہ کہا ہے۔

تو غور فرمایئے کہ ہمارے دور کے شیوخ اور قائدین کے اقوال کو حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ کے ارشادات سے کیا نسبت ہو سکتی ہے؟ جب انہیں ارشاداتِ نبوی کے مقابلہ میں کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے، تو انہیں کیا ہوگی؟ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جس نے دوستی اور دشمنی کے لیے کسی شخص خواہ وہ کوئی بھی ہو، کے قول و فعل کی موافقت کو معیار بنایا تو یاد رکھیے کہ اس کا تعلق ان لوگوں میں سے ہے، جنہوں نے دین میں تفرقہ بازی پیدا کی اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔[2]

آج بہت سی اسلامی جماعتوں اور تنظیموں کا یہی حال ہے کہ انہوں نے جن شخصیتوں کو اپنا قائد مقرر کر رکھا ہے۔ یہ انہی کے دوستوں سے دوستی اور صرف انہی کے دشمنوں سے دشمنی رکھتی ہیں، یہ اُن کے تمام فتووں کی بلاچون وچراں اطاعت کرتی ہیں اور کتاب و سنت کی طرف رجوع کی قطعاً زحمت نہیں کرتیں اور جو یہ کہتے یا فتوی دیتے ہیں، اس کے دلائل کی بابت بھی قطعاً کوئی سوال نہیں کرتیں۔

یہ طریق کار کسی بھی بڑے انقلاب یا کم از کم مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد کی اساس نہیں بن سکتا، بلکہ ایسا کبھی بھی نہیں ہوا کہ کسی ایک مذہب یا گروہ کی بنیاد پر سب مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دیا گیا ہو، حالانکہ اس سلسلہ میں بعض حکومتوں نے بہت سی کوششیں بھی کیں، مگر انہیں کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔

---

[1] فتح المجید ص ۳۸۳، فتاوی شیخ الاسلام ۲۰/۲۱۵

[2] ایضاً، ص ۲/۲۳۹-۲۴۰

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر ہم مختصر راہ کیوں نہ اختیار کریں اور اس اوّلین طریق کار کو کیوں نہ اپنالیں، جس سے پہلے بھی اس امت کی اصلاح ہوئی تھی اور آج بھی اس کے بغیر امت کی اصلاح ممکن نہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا:

ان الاسلام بدأ غریبًا وسیعود غریبا کما بدأ[1]

اسلام کا آغاز حالتِ غربت میں ہوا تھا اور عنقریب اسی حالت پر آجائے گا، جس سے اس کا آغاز ہوا تھا۔

اس حدیث کے جملہ "وسیعود غریبا کما بدأ" سے ہمارا استدلال ہے کہ اسلام کی نشاتِ ثانیہ اُس وقت تک ہو نہیں سکتی، جب تک ہم اس طریق کار کو اختیار نہ کریں جسے حضرت محمد مصطفےٰ علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم نے اختیار فرمایا تھا اور اُس کے لیے ہمیں رجوع کرنا ہوگا حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، سابقہ انبیاء کرام اور مرسلین عظامؑ کی پاک سیرتوں کی طرف تاکہ ہمیں اس بات کا علم ہو کہ:

- دعوت الی اللہ کا آغاز کس طرح ہوتا ہے اور زیادہ اہم بات کو دوسری باتوں کی نسبت کس طرح مقدم رکھا جاتا ہے؟
- اس راہ میں پیش آنے والی صعوبتوں اور مشکلات سے کس طرح عہدہ برا ہونا پڑے گا اور وہ کونسا بہترین اسلوب ہے جسے اپنی قوم کے مشرکوں اور منافقوں کو دعوت دیتے ہوئے اختیار کرنا چاہیے؟
- ہمارے سامنے اہداف اور اغراض ومقاصد کیا ہونے چاہئیں؟

اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ ہم بھی اسی شیریں وشفاف چشمے سے اپنی پیاس بجھائیں، جس سے تمام انبیاء ورسل کرام اپنی تشنگی کو تسکین بخشتے رہے، کیونکہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

[1] اس حدیث کو امام مسلم نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے۔ مختصر صحیح مسلم۔ منذری، باب الایمان ۲۷/۱

سُنَّۃَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَنْ تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِیْلًا ۝[1]

جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے تھے، ان کا (اور اُن کے بارے میں ہمارا یہی) طریق رہا ہے اور تم ہمارے طریق میں تغیر و تبدل نہ پاؤ گے۔

یاد رکھیے کہ یہ بات نہیں کہ ہمیں اختیار ہے کہ ہم انبیاء کرام کے طریقِ کار کو اختیار کریں یا نہ کریں، بلکہ بات یہ ہے کہ ہمارے لیے اس کے بغیر اور کوئی طریقۂ کار ہی نہیں اور اس کے حسبِ ذیل اسباب ہیں:

۱۔ انبیاء کرام کی اطاعت ہر مسلمان کے لیے فرضِ عین ہے

اللہ تعالیٰ نے سورۃ انعام میں کئی انبیاء کرام کا تذکرہ فرمایا اور پھر آخر میں بات کو ختم کرتے ہوئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطب ہو کر فرمایا:

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ ھَدَی اللّٰہُ فَبِھُدٰھُمُ اقْتَدِہْ ۚ[2]

یہ وہ لوگ ہیں، جن کو خدا نے ہدایت دی تھی؛ تو تم انہیں کی ہدایت کی پیروی کرو۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب بندے اور عظیم المرتبت پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا کہ آپ بھی اسی راستہ پر چلیں، جس پر سابقہ انبیاء کرام چلتے آتے ہیں —— اور آپ انہیں کے نقشِ قدم کو اختیار فرمادیں۔ ایک دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر سے یُوں خطاب فرمایا:

ثُمَّ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّۃَ اِبْرٰھِیْمَ حَنِیْفًا وَمَا کَانَ مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۝[3]

پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیم کی پیروی اختیار کرو جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

---

[1] سورۃ الاسراء، آیت ۷۷

[2] سورۃ الانعام، آیت ۹۱

[3] سورۃ النحل، آیت ۱۲۳

اور ایک تیسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے تمام مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کے ساتھ ایمان لانے والوں کے اُسوۂ کو اختیار کریں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ فِیْٓ اِبْرٰھِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِھِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْکُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ [1]	تمہیں ابراہیم اور ان کے رفقاء کی نیک چلنی (ضرور) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں۔

خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کو فرض قرار دیتے ہوئے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا ہے:

لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ لِّمَنْ کَانَ یَرْجُوا اللّٰہَ وَالْیَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَکَرَ اللّٰہَ کَثِیْرًا ہ [2]	تم کو پیغمبرِ خدا کی پیروی (کرنی) بہتر ہے (یعنی) اس شخص کو جسے خدا (سے ملنے) اور روزِ قیامت (کے آنے) کی امید ہو اور وہ خدا کا ذکر کثرت سے کرتا ہو۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں امین اور بے داغ جوانی کے مالک نوجوان کے لیے بھی اُسوۂ حسنہ ہے۔ دعوت الی اللہ کے میدان میں سرگرمِ عمل داعی کے لیے بھی، سرخاوند اور باپ کے لیے بھی کہ اُس نے آپ کے اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں کس طرح شفقت و محبت، حُسنِ سُلوک اور اہل و عیال کے حقوق و واجبات کا خیال رکھنا ہے۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ ایک مُربّی کے لیے بھی اُسوہ ہے کہ اُس نے اپنے رفقاءِ کار کی کس طرح تربیت کرنا ہے۔ اسی طرح بہادر مجاہد، فاتح قائد، کامیاب سیاست دان، امین پڑوسی، سچا عہد کرنے والے، بہترین حاکم اور عالمِ باعمل، ہر ایک کے لیے آپ کی سیرتِ مبارکہ میں بہترین نمونہ موجود ہے۔ مختصر یہ کہ حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی پاک سیرت اس قدر جامعیت کی حامل ہے

---

[1] سُورۂ ممتحنہ، آیت ۴ [2] سورۂ احزاب، آیت ۲۱

کہ وہ ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور روزِ آخرت کا اُمیدوار ہو، ایک نہایت ارفع و اعلیٰ اسوہ حسنہ ہے اور یہ کیوں نہ ہو جبکہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی ذاتِ بابرکات میں اس قدر صفاتِ حمیدہ جمع ہو گئی ہیں کہ کوئی بڑے سے بڑا مصلح اور ریفارمر آپ کی گردِ پا کو بھی نہیں پہنچ سکتا۔

ایک شخص عالم تو ہوگا، مگر سیاست دان نہیں ہوگا، یا ایک شخص سیاست دان ہوگا اور اُسے علم کی بھی شد بُد ہوگی، مگر اُس کی زندگی شادی کے بغیر اُدھوری ہوگی۔ اسی طرح ایک شخص عالم و مُربی ہوگا، تو اُسے فنونِ جنگ میں کوئی مہارت نہ ہوگی۔ ہم نے کتنے ہی علماء اور مصلحین دیکھے ہیں جو قوتِ حجت، غزارتِ علم اور کثرتِ نشاط و تحریک کے اعتبار سے بہترین نمونے تھے۔ لیکن اولاد کی تربیت یا مادی معاملات یا تصورات و عقائد کے اعتبار سے وہ کچھ نہ تھے۔

لیکن اس کے برعکس حضور سرورِ کائنات صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور دیگر حضرات انبیاء کرام (علیہم الصلاۃ والسلام) زندگی و موت سے متعلق ہر ہر مسئلہ میں تمام انسانیت کے لیے بہترین نمونہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی اطاعت اور اُن کے احکام کی اتباع کو واجب قرار دیا اور فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ [2]

اور ہم نے جو پیغمبر بھیجا ہے، اس لیے بھیجا ہے کہ خدا کے فرمان کے مطابق اس کا حکم مانا جائے

نیز فرمایا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ

اے اہلِ ایمان! اپنی آوازیں پیغمبر کی آواز سے اُونچی نہ کرو اور جس طرح آپس میں ایک دوسرے سے زور سے بولتے ہو (اس طرح) اُن کے روبرو زور سے نہ بولا کرو (ایسا نہ ہو)

---

[1] السیرۃ النبویہ، دروس و عبر، ڈاکٹر مصطفےٰ سباعی، ص ۱۵، ۱۶ قدرے تصرف کے ساتھ

[2] سورۃ النساء، آیت ۶۵

وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ۝ [1]

کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تم کو خبر بھی نہ ہو۔ جو لوگ پیغمبرِ خدا کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، خدا نے اُن کے دل تقویٰ کے لئے آزما لیے ہیں، ان کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔

جو شخص انبیاءِ کرام میں سے کسی بھی نبی کی مخالفت کرے یا ان کی دعوت کا انکار کرے یا اُن کی لائی ہوئی شریعت کے اکثر حصے کو تو مانے، مگر امورِ دین میں سے صرف کسی ایک امر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے، تو وہ کافروں اور ہمیشہ کے لیے جہنمیوں میں سے ہو جائے گا۔

والعیاذ باللہ! ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَہُ الْھُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّہٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِہٖ جَھَنَّمَ وَسَآءَتْ مَصِیْرًا ۝ [2]

اور جو شخص سیدھا رستہ معلوم کرنے کے بعد پیغمبر کی مخالفت کرے اور مومنوں کے رستے کے سوا اور رستے پر چلے تو جدھر وہ چلتا ہے، ہم اُسے ادھر ہی چلنے دیں گے اور (قیامت کے دن) جہنم میں داخل کریں گے اور وہ بُری جگہ ہے۔

نیز فرمایا:

فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا ۝ [3]

تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ جب تک اپنے تنازعات میں تمہیں منصف نہ بنائیں اور جو فیصلہ تم کر دو، اس سے اپنے دل میں تنگ نہ ہوں بلکہ اس کو خوشی سے مان لیں، تب تک مومن نہیں ہوں گے۔

---

[1] سورۃ الحجرات آیت ۲، ۳ [2] سورۃ النساء آیت ۱۱۵ [3] سورۃ النساء آیت ۶۵

بلکہ جو شخص حبِ رسول کا دعویٰ کرے اور اس بات کا بھی مدعی ہو کہ اس کے دل میں قرآن کریم کی بے پناہ محبت ہے اور پھر وہ دن رات تلاوت میں بھی مصروف رہے اور پھر جانتے بوجھتے ہوئے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے لوگوں کے اقوال کو مقدم قرار دے اور شریعتِ اسلام پر جاہلیت کی شریعتوں کو ترجیح دے، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قرآن اور حضور کی محبت کے دعوؤں میں وہ جھوٹا ہے اور اسلام کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کی زبانی یہ اعلان فرمایا ہے:

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ	(اے پیغمبر! لوگوں سے) کہہ دو کہ اگر تم خدا کو
فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَ	دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی
یَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ وَ اللّٰهُ	تمہیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف
غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ [1]	کر دے گا اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اور آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے:

لا یؤمن احدکم حتّٰی اکون	اُس وقت تک تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں
احب الیہ من ولدہ ووالدہ	ہو سکتا، جب تک میں اُسے اس کے بیٹے،
وَالنّاس اجمعین ۝ [2]	باپ اور سب لوگوں سے زیادہ محبوب بن جاؤں

سو حضرات انبیاء کرام کے علاوہ باقی جو شیوخ اور قائدین ہیں، ان کی ہم ان امور میں اطاعت کریں گے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے مطابق ہوں گے اور جن میں اللہ تعالیٰ کی معصیت ہوگی انہیں نہ ماننا فرض ہے۔ ہم ان سے امورِ دین دلائل کے بغیر اخذ نہیں کر سکتے اور نہ ان کے ہر ہر فتویٰ کو صحیح تسلیم کر سکتے ہیں اور جو اس کے علاوہ کوئی اور عقیدہ رکھتے، تو پھر اُس نے گویا خدا کو چھوڑ کر اپنے ان بزرگوں اور راہنماؤں کو خدا بنالیا ہے۔

---

[1] سورۃ آل عمران آیت ۳۱

[2] اس حدیث کو بخاری و مسلم نے روایت کیا ہے، مگر یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں ملاحظہ فرمائیے حدیث ۱۳

۲۔ عصمتِ انبیاء

اللہ تعالیٰ نے حضرات انبیاء کرام کو شرک و ضلالت سے بچایا ہے، کج روی اور خواہشاتِ نفسانی کی پرستش سے محفوظ رکھا ہے، فسق و معصیت سے پاک رکھا ہے اور اللہ تعالیٰ نے نبوت کے لیے ان نفوسِ قدسیہ کو منتخب فرمایا جو حسب و نسب کے اعتبار سے اشرف، اخلاق کے افضل، علم سے بہرہ وافر رکھنے والے، صد درجہ امین، نہایت مضبوط دلائل کے مالک اور ذہانت و فطانت کے بلند مرتبہ پر فائز تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ[1] اس کو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ اپنی پیغمبری کسے عنایت فرمائے

حضرات انبیاء کرام میں سے کبھی بھی کسی نے کبیرہ گناہ کا ارتکاب نہیں کیا، بلکہ کبھی کسی سے کسی ایسی بات کا صدور بھی نہیں ہوا، جو مروت کے منافی ہو، اگرچہ یہ اپنی اپنی قوم میں غریب وطن کے مانند تھے، مگر اللہ تعالیٰ کی عنایت و رعایت ہر حال میں ان کے سروں پر جلوہ فگن رہتی تھی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ۝ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ۝ وَاذْكُرْ إِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ وَكُلٌّ مِنَ الْأَخْيَارِ ۝[2]

اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحٰق اور یعقوب کو یاد کرو جو قوت والے اور صاحب نظر تھے: ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا اور وہ ہمارے نزدیک منتخب اور نیک لوگوں میں سے تھے اور اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یاد کرو، وہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔

ملاحظہ فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے پاک پیغمبر کو کس طرح یہ حکم دیا ہے کہ آپ بھی انہی

---

[1] سورۃ الانعام آیت ۱۲۵ [2] سورۃ ص آیت ۴۵، ۴۶، ۴۷، ۴۸

انبیاء کرام کے نقشِ قدم پر چلیں، جنہیں اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان ہی سے منتخب فرمایا تھا اور وہ صداقت، اخلاص اور للہیت کے باعث اس انتخاب کے لیے واقعی موزوں تھے۔
سورۂ طٰہٰ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ولادت اور حیات کے واقعات بیان فرماتے ہیں۔ ان آیات کی تلاوت سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں اللہ تعالیٰ کی رحمت و حفاظت کا سایہ موسیٰ علیہ السلام کے سر پر رہتا تھا اور اسی راز کو حسبِ ذیل ارشادِ باری تعالیٰ میں بیان کیا گیا ہے:

وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِي [1] — اور میں نے تم کو اپنے (کام کے) لیے بنایا ہے

یعنی میں نے اپنی وحی و رسالت کے لیے آپ کو منتخب کیا ہے۔ صداقت، استقامت اور اخلاص جیسی بہت سی قدریں ایسی ہیں جو تمام انبیاء کرام کی سیرتوں میں مشترک ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ ابتدائی مرحلہ ہی میں انبیاء کرام کی نبوت کی تصدیق کر دیا کرتے ہیں، حالانکہ انہوں نے کسی قسم کے معجزات بھی ابھی تک نہیں دیکھے ہوتے، لیکن انبیاء کرام چونکہ قبل از نبوت بھی امانت و دیانت میں معروف ہوتے ہیں اور اُن کی حق گوئی کا چرچا ہوتا ہے اور لوگوں کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زبان صداقت ترجمان سے کبھی کوئی غلط بات نہیں سُنی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ذکر فرمایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے کہا تھا:

يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ۝ [2]

میری قوم! میں نے تم کو خدا کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی مگر تم (ایسے ہو کہ) خیر خواہوں کو دوست ہی نہیں رکھتے۔

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ حَقِيْقٌ

اور موسیٰ نے کہا کہ اے فرعون! میں رب العالمین کا پیغمبر ہوں، مجھ پر واجب ہے کہ خدا کی طرف

[1] سورۂ طٰہٰ، آیت ۴۱ [2] سورۂ اعراف، آیت ۷۹

عَلٰٓی اَنْ لَّآ اَقُوْلَ عَلَی اللّٰہِ اِلَّا الْحَقَّ ؕ [1] — سے جو کچھ کہوں سچ ہی کہوں

ان صفات کے باعث جن کی وجہ سے انبیاء کرام دیگر لوگوں سے ممتاز تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم پر یہ فرض قرار دیا ہے کہ ہم ان کے مطیع فرمان بن جائیں اور ان کے ہر ہر ارشاد کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دیں، خواہ وہ غصے اور ناراضگی ہی کی حالت میں فرما رہے ہوں، کیونکہ ان کا ہر ہر ارشاد برحق اور وحیِ الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ؕ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ؕ [2] — اور نہ خواہشِ نفس سے منہ سے بات نکالتے ہیں، یہ (قرآن کریم) تو حکم خدا ہے جو ان کی طرف بھیجا جاتا ہے۔

انبیاء کرام کے علاوہ باقی جس قدر بھی شیوخ اور قائدین ہیں، وہ چونکہ معصوم نہیں ہیں لہٰذا ہم ان کی صرف اسی بات کو لیں گے جو حق کے موافق ہوگی، ان کے اقوال بذاتِ خود دلیل نہیں ہیں۔ عالمِ مجدد احمد دہلوئی (حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی) کا عصمتِ انبیاء سے متعلق کلام مجھے بے حد پسند آیا ہے، لہٰذا اس کی اہمیت کے باعث اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے،

"پھر ایسے عالم کے لیے ضروری ہے کہ برملا لوگوں کے سامنے یہ ثابت کر دے کہ وہ راہِ راست کا عالم ہے، اپنے اقوال میں خطاء اور گمراہی سے معصوم اور محفوظ ہے اور وہ اس سے بھی محفوظ ہے کہ اصلاح کے ایک حصہ کو ترک کر دے، اس کی دو صورتیں ہیں،

(۱) یہ کہ کسی ایسے شخص سے کلام کو نقل کرے، جس پر سلسلۂ کلام ختم ہوتا ہے، کیونکہ لوگ اس کے کمالات اور عصمت پر متفق ہوتے ہیں اور لوگوں میں اس کی روایت محفوظ ہوتی ہے۔ پس وہ انہی کے اعتقاد کے موافق لوگوں سے مواخذہ کرتا ہے اور انہی کی دلیل پیش کر کے ان کو ساکت کر دیتا ہے۔

(۲) یہ کہ خود وہ شخص ہو جس پر بات ختم ہو جاتی ہے اور وہ سب کا متفق علیہ ہو۔ حاصل کلام یہ

---

[1] سورۃ اعراف آیت ۱۰۴، ۱۰۵ [2] سورۃ النجم آیت ۳-۴

ہے کہ لوگوں کے واسطے ایک ایسے شخص کی ضرورت ہے جو معصوم ہو اور اس کی عصمت پر سب کا اتفاق ہو یا اس سے روایت محفوظ ہو۔ اب رہا اس بات کا معلوم کرنا کہ اس شخص کو اطاعت کے علوم حاصل ہیں اور ان سے اچھے طریقے پیدا ہوتے ہیں اور یہ شخص ان طریقوں کی بھلائی، برائی کی وجوہات سے واقف ہے، سو یہ بات نہ تو دلیل سے معلوم ہوتی ہے، نہ اس عقل سے جو معاش میں تصرف کرتی ہے اور نہ حس سے، بلکہ یہ وہ امور ہیں، جن کو خاص وجدان ہی جانتا ہے۔ پس جس طرح بھوک، پیاس اور دوا کا حار یا بارد کی تاثیر بغیر وجدان کے معلوم نہیں ہوتی۔ اسی طرح کسی شئی کا روح کے موافق یا مخالف ہونا بغیر ذوقِ سلیم کے دریافت نہیں ہو سکتا اور اس شخص کی خطا سے محفوظ ہونے کی صورت یہ ہے کہ خدا تعالیٰ اس کی ذات میں علمِ بدیہی پیدا کرتا ہے کہ وہ چیزیں جن کا اس نے ادراک کیا ہے۔ بالکل حق اور واقع کے مطابق ہیں جیسے کہ دیکھنے والے کو دیکھنے ہی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے۔ اس کو کچھ احتمال نہیں ہوتا کہ میری بینائی میں کچھ فرق ہے یا خلافِ واقع چیزوں کو میں دیکھ رہا ہوں اور جیسے زبان کے موضوع الفاظ کا علم ہوتا ہے مثلاً عربی دان کو اس میں شک نہیں ہوتا کہ ماء (پانی) اس عنصر کے لیے موضوع ہے اور "ارض" (زمین) کا لفظ اس عنصر کے لیے موضوع ہے، حالانکہ اس علم کے لیے نہ کوئی عقلی دلیل ہے اور نہ اس لفظ اور معنی میں کوئی لزوم عقلی ہے، تاہم خدا تعالیٰ ان امور کا بدیہی علم طبیعتوں میں پیدا کرتا ہے اور اکثر لوگوں میں یہ علم اس طرح سے پیدا ہوتا ہے کہ ان کے نفوس میں ایک ملکہ جبلیہ پیدا ہوتا ہے، جس سے ان کو صحیح صحیح طریقہ پر ہمیشہ علم وجدانی حاصل ہوتا ہے۔ اور وہ تجربہ سے اپنے وجدان کو سچا پاتے ہیں اور عام لوگوں کو اس رہبر کے معصوم ہونے کا اس طرح سے علم ہوتا ہے کہ ان کو بہت سے یقینی یا مشہور دلائل سے خوب ثابت ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جن امور کی طرف ہم کو بلاتا ہے، وہ سب حق پر ہیں اور اس کی عادتِ حمیدہ سے جھوٹ بولنا بعید ہے اور کبھی اس کے معصوم ہونے کا اس طرح علم ہوتا ہے کہ اس کی ذات میں تقرب کے آثار دیکھتے ہیں۔ معجزات اس سے صادر ہوتے ہیں، اس کی دعائیں مقبول

ہوتی ہیں، جن سے ان کو یقین ہو جاتا ہے کہ سماوی تدابیر میں اس کا بڑا مرتبہ ہے اور اس کا نفس ان نفوس قدسیہ میں سے ہے جو ملائکہ سے ملحق ہیں۔ ایسے شخص سے کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ خدا کی طرف جھوٹی بات منسوب کرے اور کسی گناہ کو عمل میں لاتے۔ اس کے بعد اس شخص سے ایسے ایسے امور ظاہر ہوتے ہیں، جن سے وہ لوگ باہم مجتمع ہو کر اس شخص کو اپنے مال سے اولاد سے اور سرد پانی سے جس کو پیاس کے وقت بہت پسند کرتے ہیں، زیادہ محبوب رکھتے ہیں، بغیر ایسے شخص کے کسی فرقہ اور قوم میں حالتِ مقصودہ کا رنگ نہیں چڑھ سکتا ہے۔ اس وجہ سے لوگ اس قسم کی عبادت میں مصروف رہا کرتے ہیں اور اپنے تمام امور کی ایسے شخص کی طرف نسبت کرتے ہیں جس میں ایسے امور کے ہونے کا ان کو اعتقاد ہوا کرتا ہے۔ خواہ اس اعتقاد میں وہ صحیح ہوں یا غلط۔ واللہ اعلم!

۳۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو دینِ اسلام کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے:

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح، ابراہیم، موسیٰ، عیسیٰ، حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے تمام نبیوں اور رسولوں کو اس لیے منتخب فرمایا تھا تاکہ وہ اپنی اپنی قوم کو اسلام کا پیغام پہنچا دیں، لہٰذا اب اگر کوئی شخص اسلام کو چھوڑ کر یہودیت، عیسائیت یا کسی اور دین کو اختیار کرتا ہے، تو وہ ان کافروں میں سے ہے جو ہمیشہ ہمیشہ جہنم میں رہیں گے جو کہ انتہائی بدترین ٹھکانا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ [1]

ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (خدا) کے ہو رہے تھے اور اس کے فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں نہ تھے۔

---

[1] سورۃ آل عمران، آیت ۶۷

نیز فرمایا:

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَاۤ اُنْزِلَ عَلٰۤى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَاۤ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ [1]	کیا یہ کافر، خدا کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں، حالانکہ سب اہلِ آسمان و زمین خوشی یا زبردستی سے خدا کے فرماں بردار ہیں اور اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں، کہو کہ ہم خدا پر ایمان لائے اور جو کتاب ہم پر نازل ہوئی اور جو صحیفے ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اُترے اور جو کتابیں موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے انبیاء کو پروردگار کی طرف سے ملیں، سب پر ایمان لائے، ہم ان پیغمبروں میں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے اور ہم اسی (خدائے واحد) کے فرماں بردار ہیں اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا، وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ارشادِ باری تعالیٰ:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے

کی تفسیر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ وہ اسلام کے سوا اور کسی دین کو ہرگز کسی سے قبول نہیں فرمائے گا۔ اسلام یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن انبیاء کرام

---

[1] سورۃ آل عمران، آیات ۸۳، ۸۴، ۸۵

کو مبعوث فرمایا، ان کی اتباع کی جائے۔ انبیاء کرام کے سلسلہ کو اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیا گیا ہے، یعنی اب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ آپ کی بعثت کے بعد اب اگر کوئی شخص کسی اور دین و شریعت کو لے کر اللہ کے پاس جائے گا، تو وہ ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگا، جیسا کہ اُس نے فرمایا ہے:

وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُقْبَلَ مِنْهُ۔

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا، وہ اس سے ہرگز قابل قبول نہیں کیا جائیگا

یعنی اس آیتِ مبارکہ میں اس بات کی خبر دی گئی ہے کہ اب اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت اور پذیرائی صرف اور صرف دینِ اسلام کو ہے۔ [1]

اگر حضرت عیسیٰ و موسیٰ علیہما السلام بھی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے زمانہ کو پاتے، تو وہ بھی سب سے پہلے آپ کی دعوت و نبوت پر لبیک کہنے والوں میں سے ہوتے اور آپ کی جماعت میں شریک ہو جاتے، جیسا کہ ہمیں صادق و مصدوق علیہ السلام نے یہ خبر دی ہے کہ حضرت عیسیٰ السلام آخری زمانہ میں جب آسمان سے نزول فرمائیں گے، تو سب سے پہلا یہ کام کریں گے کہ صلیب کو توڑ دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، بخدا! ابنِ مریم، حاکم عادل کی حیثیت سے ضرور نزول فرمائیں گے، صلیب کو توڑ دیں گے، خنزیر کو قتل کر دیں گے، جزیہ کو ختم کر دیں گے، کثرت مال کے باعث لوگ زکوٰۃ جمع کرنا چھوڑ دیں گے لہذا اسکی بابت کوئی کوشش نہ کی جاسکے گی، آپ کے دور میں دشمنی، بغض اور حسد ختم ہو جائے گا۔ آپ مال کی طرف لوگوں کو بلائیں گے، مگر اُسے کوئی قبول نہیں کرے گا۔ [2]

"صحیح مسلم" کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام مقتدی بن کر نماز پڑھیں گے، جبکہ حضرت مہدی علیہ السلام اس وقت اس امت کے امام ہوں گے۔

یہ حدیث اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام ان عیسائیوں کے موجودہ عقائد سے

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۱/۳۵۴، مطبعۃ الحلبی [2] مختصر صحیح مسلم، منذری ۲/۳۰۸

بری ہیں، جو بزعم خویش اپنے تئیں حضرت مسیح علیہ السلام کے امتی سمجھتے ہیں۔ اس حدیث سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ وہ مسلمان ہوں گے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ماننے والے ہوں گے، بلکہ اس بات کے بھی معترف ہوں گے کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں کے قائل ہیں۔

۴۔ انبیاء کرام حزب اللہ کے داعی ہیں

اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب حکمتوں میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ تمام انبیاء کرام حضرت خاتم الانبیاء والرسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کو جانتے تھے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے جس قدر بھی انبیاء کرام مبعوث فرمائے۔ سب سے یہ عہد لیا کہ اگر اُن کی زندگی میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو گئے تو وہ اُن کی نبوت پر ضرور ایمان لائیں گے اور ان کی یقیناً مدد کریں گے اور ہر نبی کو یہ بھی حکم دیا گیا کہ وہ اپنی اپنی امت کو بھی یہ پیغام پہنچا دیں کہ اگر اُن کی زندگی میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آئیں تو انہیں بھی اُن کی ضرور مدد کرنا اور اُن پر ایمان لانا ہو گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا

اور جب خدا نے پیغمبروں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی پیغمبر آئے، جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے، تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہو گا اور ضرور اس کی مدد کرنی ہو گی اور (عہد لینے کے بعد) پوچھا کہ بھلا تم نے اقرار کیا اور اس اقرار پر میرا ذمہ (یعنی مجھے ضامن ٹھہرایا) انہوں نے کہا (ہاں) ہم نے اقرار کیا (خدا نے)

وَاَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشّٰھِدِیْنَ[1] فرمایا کہ تم (اس عہد و پیمان کے) گواہ رہو، اور میں بھی تمہارے ساتھ گواہ ہوں۔

انبیاء کرام کو شبِ معراج بھی آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی معرفت حاصل ہوئی، جبکہ وہ سب بیت المقدس میں جمع ہوئے اور آپ نے امام بن کر اُن کو نماز پڑھائی تھی[2]

جہاں تک معاملہ ہے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر سب مسلمانوں کا تو وہ دن رات اللہ تعالیٰ کی کتاب کی تلاوت میں مصروف رہتے ہیں جس میں اللہ تعالیٰ کے نبیوں اور رسولوں کے بہترین حالات درج ہیں۔ قرآن کریم کی تلاوت کرتے ہوئے مسلمان شخص کے عجیب جذبات و تاثرات ہوتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے گویا اس وقت نبیوں کے قریب کھڑا ہے، جب وہ اپنی قوم کو دعوت دے رہے ہیں۔ ان کی مشکلات کو دیکھ رہا ہے اور حد درجہ تعجب کا اظہار کر رہا ہے۔ دورانِ تلاوت قاری کا گزر جب اس آیت کے پاس سے ہوتا ہے جس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے کنوئیں میں گرائے جانے کا ذکر ہے، تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اے کاش! یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اچھے بھائیوں میں سے ہوتا اور انہیں ایسا نہ کرنے دیتا اور جب قاری کا گزر ان آیات پر ہوتا ہے جن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کا تذکرہ ہے، تو وہ تمنا کرتا ہے کہ اے کاش! وہ آپ کے محافظوں میں سے ہوتا اور جان و اولاد کو آپ پر نثار کر دیتا۔ اسی طرح ایک مسلمان جب کفر کے بڑے بڑے سرغنوں مثلاً نمرود، فرعون، قارون، حضرت لوطؑ کی بیوی، حضرت نوحؑ کے بیٹے، ابولہب اور عبداللہ بن ابی کے تذکروں کو قرآن حکیم میں پڑھتا ہے، تو اُن کے خلاف اُس کے دل میں عداوت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

قرآن حکیم کی تلاوت کرتے ہوئے ہم ہر روز کئی کئی بار حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ، حضرت موسیٰؑ

---

[1] سورۃ آل عمران ۸۱ [2] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے امام بن کر نبیوں کو جو نماز پڑھائی اس کا ذکر اس حدیث میں ہے جسے امام مسلم نے بروایت ابوہریرہؓ اور امام احمد نے بروایت ابن عباسؓ بیان کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے زاد المعاد ۳/ ۳۴ تحقیق شعیب و عبدالقادر الأرنوط

سیدنا حضرتِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرتِ نوحؑ، حضرت شعیبؑ اور دیگر انبیاء کرام کے قدموں میں گویا لوٹ جاتے ہیں اور اپنے آپ کو حزب رحمان کے ارکان سمجھنے لگ جاتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ ۭ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ۭ اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ اللّٰهِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ [1]	جو لوگ خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، تم ان کو خدا اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے، خواہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں، یہ وہ لوگ ہیں، جن کے دلوں میں خدا نے ایمان (پتھر پر لکیر کی طرح) تحریر کر دیا ہے اور فیضِ غیبی سے ان کی مدد کی ہے اور وہ ان کو بہشتوں میں جن کے تلے نہریں بہہ رہی ہیں داخل کرے گا، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ خدا ان سے خوش اور وہ خدا سے خوش، یہی گروہ خدا کا لشکر ہے (اور) سن رکھو کہ خدا ہی کا لشکر مراد حاصل کرنے والا ہے۔

لیکن دشمنانِ دین جو دین میں فتنہ و فساد برپا کرتے رہتے ہیں اور اولیاء اللہ سے اپنی عداوت کا اعلان کرتے رہتے ہیں، ان کے نام خواہ کچھ بھی ہوں اور خواہ کسی دور سے اُن کا تعلق ہو، وہ شیطان کی جماعت کے ارکان ہیں:

اُولٰۗىِٕكَ حِزْبُ الشَّيْطٰنِ ۭ اَلَآ اِنَّ حِزْبَ الشَّيْطٰنِ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ [2]	یہ (جماعت) شیطان کا لشکر ہے اور سن رکھو کہ شیطان کا لشکر نقصان اٹھانے والا ہے۔

---

[1] سورۃ المجادلہ آیت ۲۲ [2] سورۃ المجادلہ آیت ۱۹

اور ان دونوں جماعتوں کی نہ ملاقات ممکن ہے، نہ یہ ایک دوسرے کی حلیف بن سکتی ہیں اور نہ ان کے درمیان کوئی مصالحت ممکن ہے۔ قرآن کریم میں بہت سی آیات ہیں، جو ان قدروں کی طرف اشارہ کرتی ہیں جو انبیاء اللہ کے درمیان مشترک ہیں، ان میں قرابت و نسب اور دین و عقیدہ کی قدریں بطورِ خاص ملی ہوئی نظر آتی ہیں،

إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى اٰدَمَ وَنُوحًا وَّاٰلَ إِبْرَاهِيمَ وَاٰلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعٰلَمِينَ ۔ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ۚ[1]

خدا نے آدم اور نوح اور خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمایا تھا، ان میں سے بعض بعض کی اولاد تھے اور خدا سننے والا اور جاننے والا ہے

اور فرمایا،

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا وَّاِبْرَاهِيمَ وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتَابَ ۝[2]

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو (پیغمبر بنا کر) بھیجا اور اُن کی اولاد میں پیغمبری اور کتاب (کے سلسلے) کو وقتاً فوقتاً جاری رکھا۔

اور اللہ عزوجل نے حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرمایا،

وَإِنَّ مِنْ شِيعَتِهِ لَإِبْرَاهِيمَ إِذْ جَاءَ رَبَّهُ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ ۝[3]

اور انہی کے پیروؤں میں ابراہیم تھے، جب وہ اپنے پروردگار کے پاس (عیب سے) پاک دل لے کر آئے۔

ان آیاتِ مبارکہ سے معلوم ہوا کہ تمام انبیاء کرام کا عقیدہ ایک ہے، جماعت ایک ہے، خاندان ایک ہے اور بخدا! یہ اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے اور فضلِ عظیم ہے جس کا اللہ تعالیٰ نے اپنے مومن بندوں پر احسان فرمایا ہے۔ انہی اسباب کے باعث اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر اس بات کو واجب قرار دیا ہے کہ وہ انبیاء کرام کے طریق کار کو نہایت سختی سے

---

[1] سورۃ آل عمران، آیت ۳۳، ۳۴ [2] سورۃ الحدید، آیت ۲۶ [3] سورۃ الصافات، آیت ۸۳، ۸۴

اپنالیں اور اُن لوگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی سخت ممانعت کر دی جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ بازی پیدا کی اور مختلف گروہوں میں تقسیم ہو گئے اور پھر ہر گروہ اپنے اپنے نظریات پر خوش ہے لیکن یاد رہے کہ زندۂ جاوید ربانی طریق کار کے بغیر اور کوئی بھی طریقہ ایسا نہیں جو مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کر کے انہیں ایک پلیٹ فارم پر جمع کر سکے۔

درج ذیل حدیث میں اس طریق کار کے لیے "منہاجِ نبوت" کی اصطلاح استعمال ہوئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم میں جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا، نبوت رہے گی، پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا اسے ختم کر دے گا۔ پھر خلافت علیٰ منہاجِ نبوت ہو گی جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا یہ خلافت رہے گی، پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا، اسے ختم کر دے گا۔ پھر بادشاہت ہو گی، جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا یہ بادشاہت رہے گی۔ پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا، اسے ختم کر دے گا۔ پھر جبری بادشاہت ہو گی، جب تک اللہ تعالیٰ چاہے گا، یہ جبری بادشاہت رہے گی، پھر جب اللہ تعالیٰ چاہے گا، اسے بھی ختم کر دے گا۔ پھر خلافت علیٰ منہاجِ نبوت ہو گی، پھر آپ نے

---

[1] اس آخری دور میں بعض دُعاۃ علماء متاخرین کے اقوال و فتاویٰ پر عمل کرتے ہیں اور انہی کو دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے منہاج قرار دیتے ہیں، حالانکہ یہ ایک بے کار کوشش ہے کیونکہ ان میں سے اگر اکثر باتیں صحیح بھی ہوں — کیونکہ ان میں سے جو صحیح اقوال ہیں وہ کتاب و سنت میں موجود ہیں تو دقتِ نظر سے جائزہ لینے سے اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ وہ آیاتِ قرآنیہ اور احادیثِ نبویہ سے خالی ہیں۔ علماء معاصرین تو کیا ہم تو اس بات کی بھی اجازت نہیں دے سکتے کہ مسلمان تابعین کے تمام کے تمام اقوال کو فرض سمجھ لیں کیونکہ ہمارے پاس اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں کہ یہ اقوال واقعی صحیح ہوں گے۔ داعیانِ دین کو بھی اپنی اس غلطی سے باخبر ہونا چاہیے اور اس سے قطعاً فریب خوردہ نہیں ہونا چاہیے کہ بہت سے نوجوان ان سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں۔ اگر کثرت ہی معیار ہو تو پھر قصہ کہانیوں اور ناولوں کی کتابیں ان کی کتابوں سے زیادہ مقبول و مروج ہیں

سکوت فرمالیا"۔ [1]

انہی اسباب کے باعث وہ قرآنی قصے جو انبیاء کرام سے متعلق ہیں، قرآن کریم کی اکثر سورتوں میں بیان ہوئے ہیں اور اس موضوع کی آیات ہر موضوع سے زیادہ ہیں اور یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ طریق کار کس قدر اہمیت کا حامل ہے اور دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والوں کو اس کی کس قدر ضرورت و حاجت ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے،

لَقَدْ كَانَ فِي قَصَصِهِمْ عِبْرَةٌ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ مَا كَانَ حَدِيثًا يُفْتَرَىٰ وَلَٰكِن تَصْدِيقَ الَّذِي بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيلَ كُلِّ شَيْءٍ وَهُدًى وَرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُونَ ۝ [2]

ان کے قصے میں عقلمندوں کے لیے عبرت ہے، یہ (قرآن) ایسی بات نہیں ہے جو (اپنے دل سے) بنائی گئی ہو، بلکہ جو (کتابیں) اس سے پہلے نازل ہوئی ہیں۔ ان کی تصدیق (کرنے والا) اور ہر چیز کی تفصیل (کرنے والا) ہے اور مومنوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔

نیز فرمایا:

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ أَنبَاءِ الرُّسُلِ مَا نُثَبِّتُ بِهِ فُؤَادَكَ وَجَاءَكَ فِي هَٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ وَذِكْرَىٰ لِلْمُؤْمِنِينَ ۝ [3]

(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور پیغمبروں کے سب حالات جو ہم تم سے بیان کرتے ہیں ان سے ہم تمہارے دل کو قائم رکھتے ہیں اور ان (قصص) میں تمہارے پاس حق پہنچ گیا اور (یہ) مومنوں کے لیے نصیحت اور عبرت ہے۔

---

[1] احمد ۴/۲۷۲، ہیثمی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے اور بزار نے ان سے بھی زیادہ مکمل طور پر اور اس حدیث کا کچھ حصہ طبرانی نے "اوسط" میں روایت کیا ہے۔ اس حدیث کے رجال ثقہ ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ، البانی، حدیث ۵

[2] سورۃ یوسف، آیت ۱۱۱ [3] سورۃ ہود، آیت ۱۲۰

جی ہاں انبیاء کرام کے ان قصص میں ہر طرح کی تفصیل موجود ہے۔ عقیدہ، دعوت اور طریق کار کے تمام پہلوؤں کی مکمل تفصیل ...... وہ تمام مشکلات جن کا ہمیں سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب اس بات سے غمگین ہوئے کہ مشرکین آپ کی تکذیب کرتے ہیں اور آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہتے، حالانکہ آپؐ ان میں امین کے لقب سے معروف تھے، تو اس لمحہ آپ کی تسکین قلب کی خاطر اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا تھا:

وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ فَصَبَرُوا عَلَىٰ مَا كُذِّبُوا وَأُوذُوا حَتَّىٰ أَتَاهُمْ نَصْرُنَا وَلَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِ اللَّهِ وَلَقَدْ جَاءَكَ مِنْ نَبَإِ الْمُرْسَلِينَ[1]

اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے رہے تو وہ تکذیب اور ایذا پر صبر کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچتی رہی اور خدا کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں اور تم کو پیغمبروں (کے احوال) کی خبریں پہنچ چکی ہیں (تو تم بھی صبر سے کام لو)

نیز فرمایا:

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُو الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَهُمْ كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِنْ نَهَارٍ بَلَاغٌ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفَاسِقُونَ[2]

پس (اے محمدؐ) جس طرح اور عالی ہمت پیغمبر صبر کرتے رہے ہیں، اسی طرح تم بھی صبر کرو اور اُن کے لیے (عذاب) جلدی نہ مانگو جس دن یہ اُس چیز کو دیکھیں گے جس کا ان سے وعدہ کیا جاتا ہے تو (خیال کریں گے کہ) گویا (دُنیا میں) رہے ہی نہ تھے، مگر گھڑی بھر دن

---

[1] سورۃ الانعام، آیت ۳۴

[2] سورۃ الاحقاف، آیت ۳۵

(یہ قرآن) پیغام ہے سو (اب) وہی ہلاک
ہوں گے، جو نافرمان تھے۔

اس راستہ پر چلنے والوں سے اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کا وعدہ فرمایا ہے،

كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ۝[1]

خدا کا حکم ناطق ہے کہ میں اور میرے پیغمبر ضرور غالب رہیں گے، بے شک خدا زور آور (اور) زبردست ہے۔

اور فرمایا،

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ۝ اِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ ۝ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ۝[2]

اور اپنے پیغام پہنچانے والے بندوں سے ہمارا وعدہ ہو چکا ہے کہ وہی (مظفر و) منصور ہیں اور ہمارا لشکر غالب رہے گا۔

نیز فرمایا،

اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ ۝[3]

ہم اپنے پیغمبروں کی اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، اُن کی دُنیا کی زندگی میں مدد کرتے ہیں اور جس دن گواہ کھڑے ہوں گے (یعنی قیامت کو بھی)

ہمیں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ قرآن کریم سے رابطہ اور تعلق استوار کریں اور کھلے، دل اور آنکھوں کے ساتھ انبیاء کرام کے واقعات کو ملاحظہ کریں، جن کی بابت ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

---

[1] سورۃ المجادلہ آیت ۲۱،
[2] سورۃ الصافات آیات ۱۷۱، ۱۷۲، ۱۷۳
[3] سورۃ المؤمن، آیت ۵۱،

وَجَعَلْنَا هُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عَابِدِيْنَ ۙ[1]

اور اُن کو پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور اُن کو نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا، اور وہ ہماری عبادت کیا کرتے تھے۔

---

[1] سورۃ الانبیاء۔ آیت ۷۳

استدراک

اس فصل کو ختم کرنے سے پہلے درج ذیل ارشادِ باری تعالیٰ کی تفسیر ضروری سمجھتا ہوں،

وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَا اٰتٰكُمْ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۞ [1]	اور (اے پیغمبر!) ہم نے تم پر سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور اُن (سب) پر شامل ہے تو جو حکم خدا نے نازل فرمایا ہے، اس کے مطابق اُن کا فیصلہ کرنا اور حق جو تمہارے پاس آچکا ہے اُس کو چھوڑ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرنا ہم نے تم میں سے ہر ایک (فرقے) کے لیے ایک دستور اور طریقہ مقرر کیا ہے اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی شریعت پر کر دیتا، مگر جو حکم اُس نے تم کو دیے ہیں، ان میں وہ تمہاری آزمائش کرنی چاہتا ہے، سو نیک کاموں میں جلدی کرو، تم سب کو خدا کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ پھر جن باتوں میں تم کو اختلاف تھا، وہ تم کو بتا دے گا۔

اس آیت میں محلِ شاہد یہ جملہ ہے: "لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا"

حضرت ابنِ عباسؓ فرماتے ہیں کہ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا کے معنی ہیں سُنّت اور طریقہ۔

---

[1] سورۃ المائدہ، آیت ۴۸

ضحاک، مجاہد، حسن اور قتادہ سے بھی اس کی یہی تفسیر منقول ہے، یعنی اس پورے جملہ کے معنی یہ ہیں ہم نے تم میں سے ہر قوم کے لیے ایک طریقہ مقرر کیا ہے جسے اختیار کر کے وہ حق کو پا سکتی ہے اور یک ایسا واضح راستہ مقرر کر دیا ہے جس کے مطابق عمل کرنا چاہیئے[1]

ابو جعفر طبریؒ اس مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے وہ ذکر کیا کہ جو توراۃ میں بنی اسرائیل کے لیے فرض قرار دے دیا گیا تھا اور انہیں حکم دیا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرو۔ پھر ذکر فرمایا کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے سب سے آخر میں حضرت عیسیٰ بن مریم کو بھیجا۔ ان پر انجیل نازل فرمائی۔ ان کی اُمت کو حکم دیا کہ انجیل کے مطابق عمل کریں۔ پھر ہمارے پیارے نبی جی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ فرمایا اور آپ کو یہ خبر دی کہ آپ کی طرف ایک ایسی کتاب نازل فرمائی ہے جو تمام سابقہ آسمانی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے۔ آپ کو بھی یہ حکم ہوا کہ اس کے مطابق عمل کریں اور باقی کتب کے بجائے صرف اسی کی تعلیمات کے مطابق عمل کریں۔ آپ کو یہ بھی بتایا کہ آپ اور آپ کی اُمت کے لیے سابقہ انبیاء کرام و اُمم کی شریعتوں کے بجائے ایک الگ اور مستقل شریعت مقرر فرمائی ہے۔ سابقہ انبیاء اور اُن کی اُمتوں کے قصص و واقعات سے بھی آپ کو آگاہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے اگرچہ اللہ کی توحید شریعت کے اقرار اور اللہ تعالیٰ کے امر و نہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کے اعتبار سے آپ کا اور سابقہ تمام انبیاء کا دین ایک ہی ہے، لیکن آپ کی اُمت اور سابقہ امتوں میں حلت و حُرمت کے مسائل میں اختلاف ہے[2]

حضرت ابن عباسؓ کے قول سے بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اگر دین سے جُدا نہیں تو اس سے اخص ضرور ہے، یعنی شریعت سے مُراد وہ عملی احکام ہیں جو مختلف انبیاءؑ کے دَور میں مختلف رہے ہیں اور بعد کے ادوار میں پہلی شریعتوں کے کئی اعمال منسوخ ہوتے رہے ہیں، جبکہ دین ان اصولِ ثابتہ کا نام ہے جن میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں ہوتا۔ دین کی تعریف آج بھی

---

[1] تفسیر طبری ۱۰/۳۸۸ دارالمعارف [2] ایضاً ۱۰/۳۸۶

تمام اُمتوں میں معروف ہے۔ تمام اُمتیں شریعت کا اطلاق عملی احکام ہی پر کرتی ہیں۔ قضاء سے متعلق احکام اور وہ مسائل جن میں حکام کی طرف رجوع کیا جاتا ہے، وہ بھی شریعت میں داخل ہیں، لیکن احکام حلال و حرام کو دین سے تعبیر کیا جاتا ہے۔[1]

جب موضوعِ بحث دین ہو تو پھر تمام انبیاء کرام کا دین ایک ہی ہے جسے اللہ جل شانہٗ نے نازل فرمایا تھا۔ اس کی دلیل حسبِ ذیل ارشاد باری تعالیٰ ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَيَهْدِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ ۝[2]

اُس نے تمہارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس (کے اختیار کرنے) کا حضرت نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی (اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی ہے اور جس کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا (وہ یہ) کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔ جس چیز کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو، وہ اُن کو دشوار گزرتی ہے، اللہ جس کو چاہتا ہے، اپنی بارگاہ کا برگزیدہ کر لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرے، اسے اپنی طرف رستہ دکھا دیتا ہے۔

نیز ارشاد ہے:

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۔[3]

کیا وہ اُن کے شریک ہیں، جنہوں نے ان کے لیے ایسا دین مقرر کیا ہے جس کا خدا نے حکم نہیں دیا۔

علامہ رشید رضا لکھتے ہیں:

---

[1] تفسیر المنار ۱۳/۱۴۶ دار المعرفۃ، بیروت [2] سورۃ الشوریٰ آیت ۱۳ [3] ایضاً آیت ۲۱

"ہمارے فقہاء اور عوام میں یہ بات مشہور و معروف ہے کہ دین، شرع اور شریعت کے الفاظ ایک ہی معنی میں استعمال ہوتے ہیں، لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے علم شرع، علماء شریعت اور کتب شریعت کے الفاظ فقہ، کتب فقہ اور علماء فقہ کے لیے زیادہ موزوں ہیں۔ علم عقائد و اخلاق اور ان کے علماء و کتب کے لیے ان الفاظ کا استعمال اتنا موزوں نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ فقہاء کئی مسائل کی بابت کہا کرتے ہیں کہ دیانۃً تو جائز ہے، مگر قضاءً جائز نہیں۔ خلاصہ کلام یہ کہ شریعت احکام عملیہ کا نام ہے اور یہ کلمہ دین سے اخص ہے اور یہ اس حیثیت سے دین میں بھی داخل ہے کہ اسی شریعت پر عمل کی بدولت انسان اللہ تعالیٰ کے دین پر عمل پیرا ہوا کرتا ہے اور اس کی رضا اور ثواب کے حصول کے لیے اسی کی طرف متوجہ ہوتا اور عاجزی و انکساری کا اظہار کرتا ہے۔"[1]

اس مسئلہ میں فیصلہ کن ارشادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے ہیں، چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"دین تو درحقیقت ایک ہی اصلیت و حقیقت کا نام ہے جس پر تمام انبیاء کرام متفق تھے۔ اختلاف شریعتوں اور طریقوں میں ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ تمام انبیاء کرام کا اللہ تعالیٰ کی توحید، عبادت، استعانت، ایسی باتوں سے تنزیہہ جو اس کی شان کے شایاں نہیں اور اس کے اسماء کے بارہ میں الحاد کی حرمت پر اتفاق تھا اور اس بات پر بھی وہ سب متفق تھے کہ اللہ تعالیٰ کا بندوں پر یہ حق ہے کہ وہ اس کی اس انداز سے تعظیم کریں کہ اس میں تفریط کا کوئی شائبہ تک نہ ہو، اپنے چہروں اور دلوں کو مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ کردیں۔ شعائر اللہ کے

---

[1] تفسیر المنار ۱۴۱/۶

ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف تقرب حاصل کریں۔ اس بات پر ایمان رکھیں کہ تمام حوادث کو ان کے وقوع سے قبل ہی اس نے تقدیر میں لکھ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا فرمایا ہے جو سر مو اُس کی نافرمانی نہیں کرتے، بلکہ جو انہیں حکم دیا جاتا ہے، فوراً سراپا اطاعت بن جاتے ہیں۔ اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہیے اپنی کتاب نازل فرماتا ہے۔ لوگوں پر اپنی اطاعت کو فرض قرار دیتا ہے۔ قیامت، بعثت بعد الموت، جنت اور دوزخ برحق ہیں۔ اسی طرح نیکی کی مختلف اقسام مثلاً طہارت، نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج اور نفلی عبادتوں مثلاً دُعا، ذکر اور تلاوتِ کتاب اللہ سے تقربِ الٰہی کے حصول پر بھی تمام انبیاء کرام کا اتفاق ہے اور اس بات پر بھی اتفاق ہے کہ نکاح مسنون ہے، زنا حرام ہے۔ لوگوں کے درمیان عدل و انصاف کرنا چاہیے، ظلم کرنا حرام ہے، مجرموں پر حدود قائم کرنا چاہئیں، اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ساتھ جہاد کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ کے دین میں سرگرم عمل ہونا چاہیے۔ یہ سب مسائل ہیں دین کی اصلیت اور حقیقت لہٰذا قرآن عظیم میں ان مسائل سے زیادہ بحث نہیں کی گئی الا ماشاء اللہ[1] کیونکہ یہ تو ان لوگوں کے ہاں بھی مسلم تھے جن کی زبان میں اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم کو ہم پر نازل فرمایا۔ اختلاف جو تھا وہ ان امور کی صورتوں میں تھا، مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں رجم کا حکم تھا، جبکہ ہماری شریعت میں ہے کہ شادی شدہ افراد کو رجم کیا جائے اور غیر شادی شدہ کو کوڑے لگائے جائیں۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں صرف قصاص کا حکم تھا اور ہماری شریعت میں قصاص اور دیت کا حکم ہے۔ اسی قبیل میں سے عبادات کے اوقات اور آداب و ارکان کا اختلاف ہے۔ مختصر یہ کہ وہ مخصوص کیفیات جو نیکی کی مختلف صورتوں اور ارتفاقات کی ہیں، انہیں شریعت و منہاج کہتے ہیں۔ یہ بھی یاد رکھنے

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ، حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ ۱/ ۸۶–۸۷، دار المعرفۃ بیروت

کے قابل ہے کہ جن عبادات اور نیک اعمال پر سب ادیان متفق ہیں۔ ان کے متفق علیہ ہونے کا فلسفہ یہ ہے کہ ان کا منبع وہ ملکات اور ہیأتِ نفسانیہ ہیں، جن کا معاد میں انسان کی سعادت اور شقاوت پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔ یہ اعمال ان کو تقویت دیتے ہیں، کیونکہ یہ ان کی ظاہری صورت اور تمثیلات ہیں، لیکن بہر حال ان اعمال کا وزن اور ان کی قدر و قیمت اسی پر موقوف ہے کہ وہ کہاں تک ان ملکات کے حصول میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں جس کو ان ملکات اور ہیأتِ نفسانیہ کا علم نہیں۔ اس کا عمل بصیرت کی بنا پر نہیں ہوتا۔ بعض اوقات آدمی کسی عبادت یا عمل صالح کی صرف اتنی مقدار کو کافی سمجھ لیتا ہے جو در حقیقت کافی نہیں، مثلاً نماز میں قرآت ہی نہیں پڑھتا اور نہ ہی اُس کی نماز دعا پر مشتمل ہوتی ہے تو اس قسم کی نماز کچھ بھی مفید نہیں (اس لیے عوام کو کسی ایسے عارف باللہ کی راہنمائی کی ضرورت ہے جس کا علم تمام حقائق پر حاوی ہو اور سیاستِ اُمت کا فرض با حسن وجوہ انجام دے سکتا ہو، اس کو اللہ نے ایسا علم دیا ہو کہ اعمال کے لیے کوئی ایسی صورت متعین کرے جس میں اشتباہ کا شائبہ تک باقی نہ رہے اور وہ ایک ایسا امر محسوس بن کر رہ جائے، جس کو ہر ایک کہ و مہ سمجھ سکے۔ ایسے ہی کھلے احکام پر مؤاخذہ اور مطالبہ مترتب ہوتا ہے اور اسی سے اللہ تعالیٰ کی حجت پوری ہوتی ہے۔)

ہر قسم کے التباس سے بچنے کے لیے درج ذیل دو باتوں کی طرف توجہ مبذول کرانا ازبس ضروری ہے۔

۱۔ قدیم و جدید ہر دور میں ہمارے علماء کرام نے اسلام کو کئی قسموں میں تقسیم کیا ہے جن میں سے اہم ترین اقسام شریعت، دین، حدیث، تفسیر، عقائد، فقہ اور مصطلحات (اصول) ہیں۔ بعض لوگ اس وہم میں بھی مبتلا ہوئے کہ شریعت دین سے الگ کوئی مستقل چیز ہے یا یہ کہ اسلام کے کچھ حصہ پر عمل کیا جا سکتا ہے اور کچھ پر عمل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن یاد رہے کہ یہ اوہام مطلقاً صحیح نہیں ہیں۔ فروعِ دین اصول سے الگ نہیں۔ فقہ قرآن و حدیث سے

کوئی الگ شیئ نہیں ہے۔ اس عبادت اور قربانی کی کوئی قدر وقیمت نہیں جس میں نیت فاسد ہو یا جسے اللہ تعالیٰ نے مشروع ہی قرار نہ دیا ہو، بلکہ اس کا تعلق بدعات و خرافات سے ہو۔ علماء کرام کے ہاں یہ تقسیم محض فنی نوعیت کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ تعلیم و تدریس اور بحث وتمحیص کے لیے سہولت اور آسانی پیدا ہو جائے۔ جو شخص ان علماء کے اقوال سے جنہیں ہم نے استدراک میں پیش کیا ہے، کوئی ایسا مفہوم اخذ کرے جو اُن کی اپنی مرضی و منشا اور ارادے کے مطابق نہ ہو تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی صحرا میں صدا لگائے یا راکھ میں پھونکیں مارے۔

۲۔ میں نے اس کتاب کو "منہج الانبیاء فی الدعوۃ الی اللہ" کے نام سے موسوم کیا ہے تو اس سے میرا مقصود ان اصول اور اغراض و مقاصد کو بیان کرنا ہے جو تمام انبیاء کرام کے درمیان قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس دور میں اکثر مصنفین بھی ان اقدار کو مشترک ہی سمجھتے ہیں اور اگر اسے میری خاص اصطلاح سمجھ لیا جائے تو پھر بھی کوئی حرج نہیں، کیونکہ لوگ کہا کرتے ہیں، "لا مشاحۃ فی الاصطلاحات" اصطلاحات میں کوئی مضائقہ نہیں۔ خصوصاً جبکہ یہ اصطلاح ارشادِ باری تعالیٰ، لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَمِنْهَاجًا کی تفسیر سے متعارض بھی نہیں ہے کہ دین دراصل ایک ہی ہے، البتہ شریعتیں مختلف ہیں۔
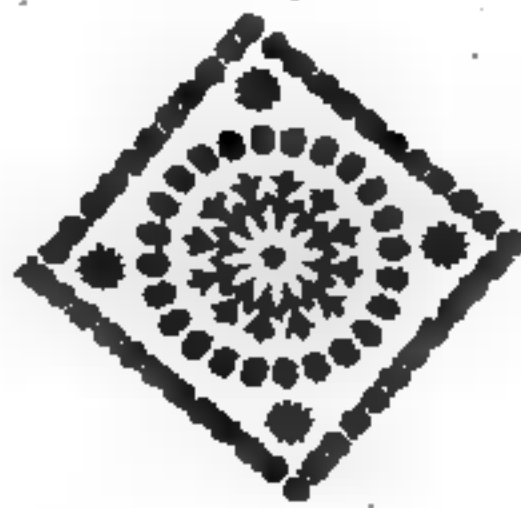
حضرت نوح علیہ السلام

- حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت
- شرک کا آغاز کیسے ہوا؟
- دعوت نوح علیہ السلام
- سرداران قوم کا موقف
- خاندان نوح علیہ السلام
- طوفان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ ۝

سورۃ ال عمران ۳۳

اللہ نے آدم اور نوح اور خاندانِ ابراہیم اور خاندانِ عمران کو تمام جہان کے لوگوں میں منتخب فرمالیا تھا۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت

حضرت آدم علیہ السلام کی زمین پر تشریف آوری اور اللہ تعالیٰ کی توحید اور عدم شرک لازم و ملزوم ہیں یعنی اُس وقت رُوئے زمین پر اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شرک کرنے والا نہ تھا۔ آدم علیہ السلام کے بعد بھی دس صدیوں تک توحید جاری و ساری رہی جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے:

"آدمؑ اور نوحؑ کے مابین دس صدیاں ہیں، ان صدیوں کے سب لوگ دینِ اسلام کے پابند تھے۔"[1]

اگر صدی سے مراد سو سال ہو جیسا کہ اکثر لوگ اس سے یہی سمجھتے ہیں تو پھر لامحالہ حضرت آدمؑ و نوحؑ کے مابین ایک ہزار سال کی مدت ہے، لیکن اس سے اس بات کی بھی نفی نہیں ہوتی کہ اس سے زیادہ عرصہ بھی ہو، کیونکہ ابن عباسؓ نے اسے اسلام کے ساتھ مقید کیا ہے، جبکہ اس بات کا بھی احتمال ہے کہ اس عرصہ میں بعد کی کچھ ایسی صدیاں بھی ہوں، جو اسلام پر عمل پیرا نہ ہوں، لیکن حدیث ابی امامہؓ دس صدیوں کے حصر ہی پر دلالت کرتی ہے۔ ابنِ عباسؓ نے ان الفاظ کا بھی اضافہ کیا ہے کہ یہ سب کے سب لوگ مسلمان تھے۔ اس سے اس بات کی بھی یقینی طور پر تردید ہوتی ہے جو بعض اہلِ کتاب مؤرخین نے ذکر کیا ہے

---

[1] صحیح بخاری، البدایۃ والنہایۃ ۱/۱۰۱ [2] حدیث ابی امامہ کو حافظ ابو حاتم بن حبان نے اپنی صحیح میں بیان کیا ہے کہ ایک شخص نے پوچھا یا رسول اللہ! کیا آدمؑ بھی نبی تھے؟ فرمایا ہاں نبی تھے، ان سے اللہ نے کلام فرمایا۔ اس نے پوچھا کہ ان کے اور حضرت نوحؑ کے درمیان کتنا عرصہ ہے؟ فرمایا دس صدیاں، یہ روایت مُسلم کی شرط کے مطابق ہے، لیکن امام مسلم نے اسے بیان نہیں فرمایا۔

کہ قابیل اور اُس کے بیٹے آگ کی پُوجا کرتے تھے، واللہ اعلم![1]

ان نیک صدیوں کے بعد کچھ ایسے امور پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے دور کے لوگوں کو بُت پرستی کی طرف مائل کر دیا۔ اس کا سبب اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے جسے امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں بروایتِ ابن جریج از عطاؔ از ابنِ عباسؓ، آیت کریمہ:

وَقَالُوا لَا تَذَرُنَّ اٰلِهَتَكُمْ وَلَا	اور کہنے لگے کہ اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا
تَذَرُنَّ وَدًّا وَّلَا سُوَاعًا وَّلَا	اور وَدّ اور سواع اور یغوث اور یعوق اور نسر
يَغُوْثَ وَيَعُوْقَ وَنَسْرًا ۝	کو کبھی ترک نہ کرنا۔

کی تفسیر میں بیان کیا ہے کہ نوح علیہ السلام کی قوم کے بُت عربوں میں بہت بعد میں آئے، وَدّ کی پرستش دومۃ الجندل کا قبیلہ کلب کرتا تھا۔ سُواع خاندانِ ہُذیل کا معبود تھا۔ یغوث کی عبادت بنو مراد کرتے تھے۔ پھر سبا کے قریب مقام جرف کے ایک خاندان بنو غطیف نے اسے خدا بنا لیا تھا۔ یعوق کی پوجا بنو ہمدان کرتے تھے۔ اسی طرح نسر کے پجاری آلِ ذی کلاع کے بنو حمیر تھے۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے کچھ نیک لوگوں کے نام ہیں۔ جب یہ فوت ہو گئے تو شیطان نے قومِ نوح سے کہا کہ جن مجلسوں میں بیٹھ کر یہ عبادت کیا کرتے تھے، ان میں اب ان کے بُت بنا کر رکھ دو اور انہیں کے نام سے انہیں موسوم کر دو؛ چنانچہ قوم نوح نے شیطان کی اس بات کو تسلیم کر کے اسی طرح کیا، لیکن ان کی پرستش ان لوگوں کے فوت ہونے کے بعد ہوئی، جبکہ بعد میں آنے والوں کو ان کی بابت صحیح علم نہ تھا۔[2]

ابن جریرؒ رقمطراز ہیں:

"یغوث ولیعوق . . . . یہ نیک لوگ تھے، آدمؑ اور نوحؑ کے درمیان ہوئے ہیں، اُن کے متبعین اُن کی اقتدا کرتے تھے۔ جب یہ فوت ہوئے تو اُن کے متبعین نے کہا کہ اگر ہم ان کی تصویریں بنا لیں تو انہیں دیکھ کر ہمیں عبادت کا

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ۱/۱۰۱ [2] فتح الباری ۱۰/۲۹۳

زیادہ شوق پیدا ہوتا رہے گا، چنانچہ انہوں نے اپنے بزرگوں کی تصویریں بنا لیں اور جب یہ فوت ہو گئے اور دوسرے لوگ پیدا ہو گئے تو ابلیس نے ان کے دل میں وسوسہ پیدا کر دیا کہ تمہارے آباؤ اجداد انہی کی عبادت کرتے اور انہیں سے بارش وغیرہ مانگتے تھے۔ شیطان کا یہ وسوسہ کارگر ثابت ہوا اور ان لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی۔[1]

جب مصیبت عام ہو گئی اور فساد پھیل گیا تو لوگوں نے اللہ تعالیٰ کے بجائے اپنے خود تراشیدہ بتوں کی پرستش شروع کر دی، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے حضرت نوح علیہ السلام کو نبوت سے سرفراز فرما کر ان لوگوں کی طرف مبعوث فرما دیا تاکہ وہ اپنی قوم کو عذاب الٰہی سے ڈرائیں، آپ وہ پہلے رسول تھے جن کی زمین پر بعثت ہوئی جیسا کہ صحیحین کی اس حدیث سے ثابت ہے جو بروایت ابوحیان، حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگ میدانِ حشر میں حضرت نوحؑ کے پاس آئیں گے اور کہیں گے کہ اے حضرت نوح اہلِ زمین کی طرف آپ اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عبد شکورؔ کے نام سے آپ کو موسوم فرمایا۔ آپ دیکھتے نہیں کہ ہم کن مشکلات میں مبتلا ہیں؟ آپ ملاحظہ نہیں فرما رہے کہ ہمیں کس قدر تکلیف ہے؟؟ کیا آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ہماری شفاعت نہ فرمائیں گے[2]؟؟؟

حضرت نوح علیہ السلام کو سب سے پہلا رسول اس لیے کہا گیا ہے کہ حضرت آدمؑ اور حضرت ادریسؑ رسول نہیں، بلکہ نبی تھے (حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ۱/۱۰۶ [2] فتح الباری بحدیث شفاعت ایک لمبی حدیث ہے، ہم نے اس میں سے صرف ایک حصہ بیان کیا ہے جو حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق تھا۔ ۷/۱۸۲ مطبعۃ البابی الحلبی۔

عرب میں قوم نوح کے یہ بت کیسے آ گئے؟ تو ممکن ہے کہ یہ نام ہندوستان کے راستہ سے آئے ہوں یا شیطان ہی نے عربوں کے دلوں میں یہ نام ڈال دیئے ہوں، اس سلسلہ میں کوئی صحیح دلیل موجود نہیں ہے۔

تینتالیس مقامات پر آیا ہے۔ سورۂ اعراف، ہود، مومنون، الشعراء، قمر اور سورۂ نوح میں آپ کا قصہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔[1]

شرک کا آغاز کیسے ہوا؟

حدیث ابن عباسؓ جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے، اس سے ہمیں کئی سبق حاصل ہوتے اور کئی عبرتیں اور نصیحتیں ملتی ہیں۔ ان میں سے چند ایک اہم اسباق و نصائح کو ذیل میں بیان کیا جاتا ہے۔

۱۔ شیطان نے قومِ نوحؑ کے سامنے اس بات کو مزین کر کے پیش کیا کہ وفات کے بعد نیک آدمیوں کی تعظیم کرنا واجب ہے، شیطان نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ جن مجلسوں میں یہ بیٹھا کرتے تھے، ان میں ان کے بُت بنا کر رکھ دو اور ان بُتوں کو انہی کے نام سے موسوم کر دو۔ اس کے بعد جب قومِ نوح کے کچھ دوسرے لوگ آئے، تو شیطان نے ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ تمہارے آباؤ اجداد انہی بُتوں کی پرستش کیا کرتے تھے۔ شیطان، نوحؑ کی قوم کو بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو گیا اور ان بیوقوفوں نے اس کی اطاعت شروع کر دی، وہ شیطان کے لشکر کے سپاہی بن گئے اور اس کی جماعت کے کارکن بن گئے اور اس کی خواہش پر چلنے لگے، حالانکہ ان پر فرض یہ تھا کہ شیطان کی بات ماننے سے مکمل طور پر اجتناب کرتے، کیونکہ وہ تو ان کا زبردست دشمن تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ	اور شیطان کے قدموں پر نہ چلو، وہ تمہارا
إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِينٌ ۝ إِنَّمَا	کھلا دشمن ہے، وہ تم کو بُرائی اور بے حیائی
يَأْمُرُكُم بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ	کے کام کرنے کو کہتا ہے اور یہ بھی کہ خدا

[1] قصص الانبیاء، ص ۳۱، دار احیاء التراث العربی

وَاَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ	کی نسبت ایسی باتیں کہو جن کا تمہیں (کچھ
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ [1]	بھی) علم نہیں۔

قوم نوح پر فرض تھا کہ وہ اس بات کو جان لیتے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے معنی یہ ہیں کہ شیطان کی نافرمانی کی جائے اور اُس کے وسوسوں کی مخالفت کی جائے اللہ نے اپنے موحد بندوں سے اس بات کا وعدہ بھی فرمالیا تھا، چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ	اے آدم کی اولاد ہم نے تم سے کہہ
اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ	نہیں دیا تھا کہ شیطان کو نہ پوجنا وہ
اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ وَّ	تمہارا کھلا دشمن ہے اور یہ کہ میری ہی
اَنِ اعْبُدُوْنِيْ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ	عبادت کرنا، یہی سیدھا رستہ ہے،
مُّسْتَقِيْمٌ ۝ وَلَقَدْ اَضَلَّ	اور اُس نے تم میں سے بہت سی خلقت
مِنْكُمْ جِبِلًّا كَثِيْرًا ۭ اَفَلَمْ	کو گمراہ کر دیا تھا۔ تو کیا تم سمجھتے نہیں
تَكُوْنُوْا تَعْقِلُوْنَ ۝ [2]	تھے؟

نیز فرمایا:

اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمْ عَدُوٌّ	شیطان تمہارا دشمن ہے تم بھی اُسے
فَاتَّخِذُوْهُ عَدُوًّا ۭ اِنَّمَا	دشمن ہی سمجھو وہ اپنے (پیروؤں کے)
يَدْعُوْا حِزْبَهٗ لِيَكُوْنُوْا	گروہ کو بلاتا ہے تاکہ وہ دوزخ والوں
مِنْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ [3]	میں ہوں۔

۲۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ بتوں کی اس وقت تک عبادت شروع نہیں ہوئی تھی، جب تک وہ پہلے لوگ فوت نہیں ہوئے، جب وہ فوت ہو گئے اور علم ختم ہو گیا تو بتوں کی پرستش شروع ہو گئی۔

---

[1] سورۃ البقرۃ ۱۶۸، ۱۶۹ [2] سورۃ یٰسین ۶۰-۶۲ [3] سورۃ فاطر آیت ۶

کشمیہنی نے لکھا ہے کہ علم ختم ہونے کا معنی یہ ہے کہ علماء کے ختم ہونے کے ساتھ علم کے آثار بھی مٹ گئے تھے اور جہالت عام ہو گئی تھی، حتیٰ کہ وہ توحید و شرک میں امتیاز نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا محض اس ظن کی بنیاد پر وہ شرک میں مبتلا ہو گئے ــــــــــ

کہ یہ اللہ تعالیٰ کے ہاں نفع بخش ثابت ہوں گے۔[1] شیطان کو ایک ہزار سال میں تو اس بات کی طاقت نہ ہوئی کہ وہ اپنے اغراض و مقاصد میں سے کسی ایک مقصد کو حاصل کرتا، کیونکہ اس کا حیلہ علماء پر تو نہیں چل سکتا تھا اور نہ اُس کے مال و متاع کو اُن کے ہاں پذیرائی حاصل ہو سکتی تھی، اس لیے کہ ہر وہ نئی چیز کو اللہ تعالیٰ کی شریعت کی کسوٹی پر پرکھتے تھے، لہٰذا یہ بات واضح ہے کہ ان کے ہاں عبادت صرف وہی تھی، جو اللہ تعالیٰ نے مشروع قرار دی ہوئی تھی۔

جب علماء فوت ہو گئے اور جہالت عام ہو گئی، تو پھر شیطان کی باتیں بھی سُنی جانے لگیں اور اُس کے احکام پر بھی عمل در آمد ہونے لگا۔ یہی وجہ ہے کہ خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر سب سے پہلے یہ وحی نازل ہوئی:

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ۞ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۞ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ ۞ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۞ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ ۞[2]	(اے محمدؐ) اپنے پروردگار کا نام لے کر پڑھو جس نے (عالم کو) پیدا فرمایا، جس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے سے علم سکھایا اور انسان کو وہ باتیں سکھائیں جن کا اُسے علم نہیں تھا۔

اس پہلی وحی کے نزول کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مدرسہ ارقم بن ابی ارقم میں حضرات صحابہ کرام کی تعلیم و تربیت شروع فرما دی تھی اور اس عظیم درسگاہ سے ایسی

---

[1] فتح المجید، عبدالرحمٰن بن حسن آل شیخ ص ۲۲۱ [2] سورۃ العلق آیت ۱–۵

اس سلسلہ میں حافظ ابن قیمؒ کے ارشادات بڑے قابلِ قدر ہیں جو کہ حسب ذیل ہیں:

"شیطان ہمیشہ سے قبر پرستوں سے یہ کہتا چلا آیا ہے کہ انبیاء وصالحین کی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی قبروں پر عمارت بنائی جائے اور پھر ان پر اعتکاف کیا جائے، کیونکہ ان کی قبروں کے پاس دُعا مقبول ہوتی ہے اور پھر ایک قدم اور بڑھاتا ہے اور ان کے دل میں یہ بات ڈالتا ہے کہ ان کے وسیلہ سے اور اللہ تعالیٰ کو اُن کی قسم دے کر دُعا کرنا چاہیئے، حالانکہ اللہ تعالیٰ کی شان اس سے کہیں زیادہ بلند وتر ہے کہ اسے قسم دی جائے یا مخلوق میں سے کسی کا نام لے کر اس سے کوئی سوال کیا جائے۔

جب یہ قبر پرست ان باتوں میں پختہ ہو جاتے ہیں، تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے بجائے انہیں سے دُعا مانگنے، ان کی عبادت کرنے اور ان سے شفاعت کے سوال کو ان کے دلوں میں بٹھا دیتا ہے اور پھر یہ لوگ قبر کو بُت بنا لیتے، اس پر چراغ روشن کرتے اور اس پر غلاف چڑھاتے ہیں، قبر کا طواف کرتے ہیں، قبر کو بوسہ دیتے ہیں، وہاں حج کرتے اور جانوروں کو ذبح کرتے ہیں۔ جب وہ خود ان باتوں میں پختہ ہو جاتے ہیں، تو دوسرے لوگوں کو بھی اس عبادت کی دعوت دیتے ہیں اور اسے عید اور قربان گاہ بنا لیتے ہیں، اور خیال کرتے ہیں کہ اس طرح کرنا دُنیا و آخرت دونوں میں نفع بخش ہے، حالانکہ یہ سب باتیں دینِ اسلام کے مخالف ہیں اور تجدید توحید اور خالص اللہ ہی کی عبادت کے منافی ہیں اور ان مقاصد کے بالکل متضاد جن کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمایا تھا۔

جب یہ قبر پرست ان باتوں میں بھی پختہ ہو جاتے ہیں تو پھر شیطان ان

بلند مرتبت شخصیتوں نے سندِ فراغت حاصل کی کہ شیطان کو ان کے قریب پھٹکنے کی بھی جرأت نہ تھی۔

زمانہ گردش کرتا رہا حتیٰ کہ علم اور علماء کم ہوگئے، مدارس اور یونیورسٹیاں بڑھ گئے اور شیطان کچھ ایسے لوگ تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا جو دین کے نام پر ایسا طریقِ تعلیم اپنا رہے ہیں جس میں دینی علم کا فقط نام ہی ہے اور اس سے بڑھ کر اس میں دین کی اور کوئی بات نہیں ہے۔ اسی قسم کے غلط نظامِ تعلیم کے زیرِ سایہ پروان چڑھ کر بہت سے خالی قسم کے دُعاۃ و مبلغین بھی پیدا ہوئے، اسلامی ممالک دین سے منحرف ہونے والوں کی چراگاہ، اصحابِ بدعت کی پناہ گاہ اور اجنبی و درآمد شدہ افکار و نظریات کی تجربہ گاہ بن گئے، اب پھر نئے سرے سے بُتوں کی پرستش شروع ہوگئی ہے، مگر یہ ماڈرن اور جدید بُت ہیں، جنہیں نئے دور کے کاہنوں نے نئی نئی شکلوں اور صورتوں میں تراشا ہے۔ ان جدید بُتوں میں سے قومیت، وطنیت، اشتراکیت، ڈیموکریسی اور وجودیت بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں اور ہم ہر روز نئے نئے بتوں کا نام سنتے رہتے ہیں کہ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۔

۳- شیطان نے قومِ نوح سے یکبارہی غیر اللہ کی پرستش کا مطالبہ نہیں کیا تھا کیونکہ اگر وہ ایسا کرتا تو کوئی بھی اس کی بات کو تسلیم نہ کرتا، بلکہ اُس نے تدریجی طور پر اپنے جال میں لوگوں کو پھنسانے کی کوشش کی اور وہ اس طرح کہ پہلے ان کے دلوں میں یہ خیال ڈالا کہ وہ نیک لوگوں سے محبت کر رہے ہیں اور پھر ان کے دلوں میں یہ بات ڈالی کہ ان کی یادگاروں کے لیے ان کی تصویروں کو بنانا بے حد ضروری ہے اور پھر کچھ عرصہ بعد جب یہ لوگ چل بسے، تو نئے آنے والوں کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ تمہارے آباؤ اجداد تو انہی بُتوں کی عبادت کیا کرتے تھے۔ شیطان کی اس بات کو سُن کر انھوں نے بھی بُتوں کی پرستش شروع کردی۔ شیطان کے گمراہ کرنے کے کیا طریقے ہیں،

کے دلوں میں یہ بات ڈالتا ہے کہ جو شخص ان باتوں سے منع کرے، وہ ان اولیاء اللہ اور پہنچے ہوئے بزرگوں کی شان میں گستاخی کرتا، ان کے بلند مقام و مرتبہ سے انہیں گراتا اور یہ خیال کرتا ہے کہ یہ ہستیاں محترم نہیں ہیں اور نہ بلند مقام پر فائز ہیں، لہٰذا ایسے شخص کے بارے میں ان مشرکوں کے دل غیض و غضب سے بھر جاتے ہیں، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ	اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو
اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ	لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے
لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَ	دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب
اِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ	اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے
اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ [1]	تو خوش ہو جاتے ہیں۔

یہ شیطانی باتیں بہت سے جاہل اور کمینے لوگوں میں عام مشہور ہو چکی ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر لوگ بظاہر علم و دین سے بھی انتساب رکھتے ہیں، حتیٰ کہ یہ لوگ اہلِ توحید سے زبردست دشمنی رکھتے ہیں، ان پر بڑے بڑے الزامات لگاتے اور لوگوں کو ان سے متنفر کرتے ہیں، یہ لوگ مشرکوں سے سے دوستی و محبت رکھتے، ان کی تعظیم کرتے، انہیں اولیاء اللہ تصور کرتے اور انہیں اللہ و رسول کے دین کے مددگار سمجھتے ہیں، حالانکہ:

وَمَا كَانُوْا اَوْلِيَآءَهٗ	اور وہ اس مسجد کے متولی بھی نہیں
اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ	ہیں، اس کے متولی تو صرف پرہیزگار
[2] — [3]	ہیں۔

جو شخص بھی ہماری اس جدید تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالے گا،

---

[1] سورۃ الزمر آیت ۴۵ [2] سورۃ الانفال آیت ۳۴ [3] فتح المجید ص ۲۲۳، دار الکتب العلمیۃ بیروت

جان لے گا کہ آج بھی شیطانی لشکر بعینہٖ انہی راستوں پر چل رہا ہے جنہیں ان کے قائدِ اول نے قومِ نوح کو تباہ و برباد کرنے کے لیے اختیار کیا تھا۔ ہماری دلیل یہ ہے کہ آج اُمت میں جو دین سے انحراف اور تمام اُمورِ حیات میں اسلام سے دُوری رُونما ہو گئی ہے۔ یہ تمام باتیں یکایک تو پیدا نہیں ہوئیں، بلکہ انہوں نے موجودہ صورت اختیار کرنے سے پہلے کئی مراحل طے کیے ہیں، مثلاً عورت کا موجودہ مسئلہ کئی مراحل طے کرنے کے بعد یہاں تک پہنچا ہے۔ دشمنانِ دین نے پہلے تو عورت کو تعلیم دینے کی بات شروع کی۔[1] جب اس میں انہیں کامیابی ہو گئی تو پھر انہوں نے تعلیم کے لیے اپنے طریقوں کو وضع کیا اور تعلیم دینے کے لیے اپنے تیار کردہ سٹاف کو لائے، جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو مسلمان عورتوں کے دل میں انہوں نے یہ بات ڈال دی کہ وہ بھی مغربی عورتوں کے نقشِ قدم پر چلیں، اس کے بعد اگلا قدم یہ اٹھایا کہ پردہ کو خیرباد کہہ دینا چاہیے، کیونکہ یہ ایک سراسر ناجائز پابندی ہے اور اسلام میں پردے کا قطعاً کوئی حکم نہیں ہے اور اس کے بعد اگلا قدم یہ تھا کہ سیاست، وراثت اور اعمالِ حکومت میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ چلنا چاہیے اور پھر انہوں نے قوانین بھی ایسے وضع کر لیے کہ بدکاری کی صورت میں کوئی سزا نہیں، بلکہ باہمی رضامندی سے جو چاہیں کرتے پھریں۔

۴۔ آج شیطان کو مسلمان ملکوں میں بڑی وسیع حکومت حاصل ہے۔ اس نے اپنے متبعین کے لیے اس بات کو بہت مزین کر کے پیش کیا ہے کہ اولیاء کی قبروں پر بڑے بڑے عظیم الشان قبے تعمیر کیے جائیں۔ قبروں کو آجکل تو اس قدر خوبصورت عمارتوں اور قبوں

---

[1] علمائے اسلام کے ہاں عورت کو تعلیم دلانے کے سلسلہ میں قطعاً کوئی اختلاف نہیں، البتہ نصف صدی سے جو علم کے نام پر جہالت اور بے راہ روی شروع ہو چکی ہے، یہ عصرِ حاضر کی سوغات ہے۔

کی صورت دی جارہی ہے کہ بہت سے زندہ لوگ یہ تمنا کرتے ہیں کہ اے کاش! ان مُردوں کے بجائے وہ ان زندہ لوگوں کا مسکن ہوں۔ یہ غالی لوگ ان مقامات کی تعظیم اور ان کا توسّل اختیار کرنے کی بھی شدومد سے دعوت دیا کرتے ہیں۔ لوگ بڑی کثرت کے ساتھ ان مزارات کا قصد کرتے ہیں۔ ______________ ان کے اردگرد طواف کرتے ہیں، جانور ذبح کرتے ہیں، ان کے وسیلہ سے دعائیں مانگتے ہیں، شفاعت طلب کرتے ہیں اور اصحابِ قبور سے ایسی ایسی مرادیں مانگتے ہیں جو فقط اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی سے مانگنی چاہئیں۔ مشہور شاعر حافظ ابراہیم نے جب بعض قبروں اور مزاروں کو دیکھا تو اس بات پر بڑے تعجب کا اظہار کیا کہ وہاں بڑی کثرت کے ساتھ چڑھاوے اور نذر و نیاز پیش کیے جاتے ہیں، اسی منظر کو دیکھ کر انہوں نے درج ذیل اشعار کہے تھے ؎

احیاؤنا یرزقون بدرھم　　وبألف بألف یرزق الأموات

ہمارے زندوں کو تو ایک درہم بھی نہیں دیا جاتا، مگر مُردوں کو ہزاروں کے حساب سے نذرانے پیش کیے جاتے ہیں۔

ویقال ھذا القطب باب المصطفٰی　　ووسیلۃ تقضٰی بہ الحاجات

کہا جاتا ہے کہ یہ قطب بابِ مصطفٰے ہے، اور ایک ایسا وسیلہ ہے جس سے حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔

وانا أعذب فی الحیاۃ ولیس لی　　یا أمر دفو مابہ أقتات

اے دُنیا! میں تو زندگی میں عذاب میں مبتلا ہوں، اور میرے پاس قوتِ لایموت کا بھی سامان نہیں۔

ان مقامات میں سے اہم ترین بدوی، حسین اور زینب مصر میں، ابنِ عربی اور زینب شام میں، جیلانی، علی اور حسین عراق میں اور عیدروس یمن میں ہیں۔ ان سب

مقامات پر ان شخصیتوں کے نام سے جو قبریں بنی ہوتی ہیں، وہ سب فرضی ہیں۔ اس بات کی کوئی دلیل نہیں کہ علی، حسین اور زینب ان قبروں میں مدفون ہیں، جبکہ ان علاقوں میں واقعی طور پر کچھ صحابہ کرامؓ مدفون ہیں لیکن ان بدعتوں اور ضلالتوں میں مبتلا لوگوں کو ہم نے کبھی ان کا نام لیتے نہیں سنا۔ [1]

اس سب سے بڑھ کر یہ کہ ان قبر پرستوں نے ظالم اور جابر حکومتوں میں اُونچے اُونچے دینی منصب اور عہدے حاصل کر رکھے ہیں۔ یہ بدترین ان کے ساتھی بنے ہوتے ہیں اور دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والوں کے لیے یہ قتل یا جلاوطنی کے فتوے صادر کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ان کے بہت سے ایسے اجتہادات ہیں جن کا احترام کرنا واجب ہے، مگر اس کے باوجود منافقین کا بازارِ تجارت گرم رہتا ہے اور وہ علماءِ سُوء سے منافع اور فوائد حاصل کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اس دُنیا میں سب سے زیادہ بدبخت وہ لوگ ہیں جو منافقوں کے لیے منافقت کرتے ہیں، مگر اپنے لیے پھر بھی کوئی مختصر راستہ نہیں پاتے۔

۵۔ اسلام نے تصویروں کو حرام قرار دیا ہے، کیونکہ یہ بُت پرستی کا سبب بنتی ہیں۔ ماضی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ قوم نوحؑ نے نیک بندوں کی وفات کے بعد ان کی تصویروں کی پرستش کی اور پھر انہیں بُتوں کی صورت میں ڈھال لیا۔ ہمیں حضرت صادق و مصدوق علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم نے یہ خبر دی ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب مصوروں کو ہوگا۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو میری طرح تخلیق کرنا چاہتا ہے (اگر ان میں طاقت ہے) تو ایک ذرہ پیدا کر کے دکھائیں، یا ایک دانہ بنا کر دکھائیں، یا ایک بال پیدا کر کے

[1] قبروں کی تعظیم بجالانا بدعت اور گمراہی ہے، خواہ اس میں مدفون صحابی ہو یا غیر صحابی۔

دکھائیں گے۔ [1]

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں میرے پاس تشریف لائے، جبکہ میں نے الماری پر ایک پردہ ڈال رکھا تھا جس میں تصویریں تھیں، آپ نے انہیں دیکھا تو پھاڑ دیا۔ آپ کے چہرۂ اقدس کا رنگ بدل گیا اور فرمایا اے عائشہؓ! قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب ان لوگوں کو ہوگا جو تخلیق میں اللہ تعالیٰ کی مشابہت اختیار کرنا چاہتے ہیں۔" حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ ہم نے اس پردے کو پھاڑ کر اس سے ایک یا دو تکیے بنا لیے تھے۔ [2]

حضرت سعید بن ابی الحسن سے روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ کے پاس ایک شخص آیا اور اُس نے کہا میں مصوّر ہوں اور میں تصویریں بناتا ہوں، لہٰذا اس سلسلہ میں آپ مجھے فتویٰ دیجیے کہ کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا میرے قریب آجاؤ، وہ قریب آ گیا تو پھر فرمایا کہ اور قریب ہو جاؤ، وہ اور قریب ہوا تو آپ نے اپنا دستِ مبارک اُس کے سر پر رکھا اور فرمایا کہ میں تمہیں وہ بات بتاتا ہوں، جو میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنی ہے، چنانچہ میں نے آپؐ کو فرماتے ہوئے سُنا:

کُلّ مصوّر فی النّار ہر مصور جہنم رسید ہوگا

ہر اُس تصویر کے بدلے جو اُس نے بنائی، اُس میں جان ڈالی جائے گی اور اُسے جہنم میں عذاب دیا جائے گا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ اگر تم ضرور تصویریں ہی بنانا چاہو تو درختوں کی تصویریں بناؤ یا ایسی چیزوں کی جن میں جان نہ ہو۔ [3]

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ

---

[1] اس حدیث کو بخاری و مسلم نے بیان کیا ہے، مختصر صحیح مسلم، منذری، حدیث نمبر ۱۳۷۰

[2] ایضاً، حدیث نمبر ۱۳۶۶ [3] بخاری و مسلم۔ مختصر صحیح مسلم حدیث نمبر ۱۳۶۹

ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے دنیا میں کوئی تصویر بنائی تو اُسے قیامت کے دن یہ حکم دیا جائے گا کہ اس میں رُوح پھونکے، حالانکہ وہ اس میں رُوح نہیں پھونک سکے گا۔[1]

ان احادیثِ مبارکہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام انواع و اقسام کی تصویریں حرام ہیں اور اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ ان کا سایہ ہے یا نہیں، ہاتھ سے بنائی گئی ہیں یا کیمرہ سے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بھیجا کہ وہ جس تصویر کو بھی دیکھیں اُسے مٹا ڈالیں، چنانچہ ابو الہیاج اسدی سے روایت ہے کہ حضرت علیؓ بن ابی طالب نے فرمایا کیا میں تجھے اس کام کے لیے نہ بھیجوں جس کام کے لیے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیجا تھا کہ جو تصویر بھی دیکھو، اُسے مٹا ڈالو اور جو اونچی قبر دیکھو، اسے برابر کر دو۔[2]

امام نوویؒ نے تصویروں کی حرمت کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس اعتبار سے کوئی فرق نہیں کہ تصویر کا سایہ ہے یا نہیں اور اس مسئلہ میں ہمارے مذہب کا یہی خلاصہ ہے۔ حضرات صحابہ کرامؓ، تابعینؒ اور ان کے بعد کے تمام علماء کرام کا بھی یہی مذہب ہے۔ امام ثوریؒ، مالکؒ اور ابوحنیفہؒ کا بھی یہی مذہب ہے۔ بعض سلف نے کہا کہ ان تصویروں کی ممانعت ہے جن کا سایہ ہو اور جن کا سایہ نہ ہو اُن کی ممانعت نہیں ہے لیکن یہ ایک باطل مذہب ہے، کیونکہ وہ پردہ جس میں تصویر دیکھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے پھاڑ دیا تھا، اس کا تو سایہ نہ تھا اور پھر یہ کہ تصویر کی حرمت کے بارے میں احادیث مطلق ہیں، ان میں کسی قسم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔[3]

امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ تصویر کی ممانعت کا حکم عام ہے۔ اسی طرح جن چیزوں میں تصویریں بنی ہوں، ان کے استعمال کی ممانعت کا بھی حکم عام ہے۔ اسی طرح ان گھروں میں داخل ہونے کا حکم بھی یہی ہے، خواہ تصویریں کپڑے میں رقم ہوں یا نہ ہوں یا تصویریں

---

[1] بخاری و مسلم، الفاظ بخاری کے ہیں، فتح الباری ۲/ ۵۱۸ [2] مسلم، حدیث ۸۸۴، ۱/ ۱۳۱ [3] صحیح مسلم بشرح النووی ۱۴/ ۸۱

دیوار پر ہوں یا کپڑے پر یا کسی ایسے کارپٹ پر کہ وہ پاؤں کے نیچے آتا ہو یا نہ آتا ہو' کیونکہ ظاہر احادیث کے مطابق عمل سے یہی بات ثابت ہوتی ہے۔ خصوصاً اس حدیث نمرقہ سے جسے امام مسلمؒ نے ذکر فرمایا ہے اور اس سلسلہ میں یہی مذہب قوی ہے۔[1]

حافظ ابن حجرؒ نے امام نوویؒ کے اس مذکورہ ارشاد کی تلخیص ذکر کرنے کے بعد لکھا ہے کہ تصویروں کی حرمت کا حکم عام ہے اور سب کو شامل ہے' خواہ اُن کا سایہ ہو یا نہ ہو' اُس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جسے امام احمدؒ نے بروایت حضرت علیؓ بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ تم میں سے کون ہے جو مدینہ جائے اور ہر بُت کو توڑ دے اور ہر تصویر کو مٹا دے ...... اسی حدیث میں یہ بھی ہے کہ اگر کوئی دوبارہ ان میں سے کسی چیز کا ارتکاب کرے' تو اُس نے اس دین و شریعت کا انکار کیا جسے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔[2]

حافظ ابن حجرؒ حدیثِ عائشہؓ "اِنّ اصحاب ھٰذہ الصور یعذبون یوم القیامۃ" کی تشریح کے ضمن میں فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ سب تصویریں حرام ہیں اور اس اعتبار سے قطعاً کوئی فرق نہیں کہ ان کا سایہ ہے یا نہیں' وہ پینٹ سے بنائی گئی ہیں یا تراشی گئی ہیں یا کرید کر بنائی گئی ہیں یا بُن کر بنائی گئی ہیں۔[3]

آجکل کچھ علماء فوٹوگرافی کی تصویروں کو جائز قرار دیتے ہیں' لیکن ان کے پاس کوئی دلیل نہیں' بلکہ دلائل سے تو فوٹوگرافی کی بھی حرمت ثابت ہوتی ہے' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

انّ البیت الذی فیہ الصور لاتدخلہ الملائکۃ	جس گھر میں تصویریں ہیں' اس میں فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

---

[1] صحیح مسلم بشرح النووی ۱۴/ ۸۲ [2] فتح الباری ۱۲/ ۵۰۷' مطبعۃ البابی الحلبی

آپ کے اس فرمان میں تصویروں کا مطلقاً ذکر ہے اور اس کی کسی معین قسم کی تخصیص نہیں ہے۔ شیخ مصطفٰے احمامی نے ان لوگوں کی تردید میں خوب لکھا ہے۔ جو یہ کہتے ہیں کہ فوٹوگرافی کی تصاویر جائز ہیں اور دلیل یہ دیتے ہیں کہ ان تصویروں سے منع کیا گیا تھا جو ہاتھ سے بنائی جاتی ہیں۔

شیخ فرماتے ہیں،

"اُس کی مثال تو ایسے ہے جیسے کوئی کسی شیر کو کھلا چھوڑ دے اور وہ جس کو چاہے چیر پھاڑ دے یا بجلی کی ننگی تاریں بچھا دے جو ہر گزرنے والے کے لیے پیغامِ اجل ثابت ہوں یا کھانے میں زہر ملا دے اور کھانے والے جان سے ہاتھ دھو بیٹھیں اور جب اس پر قتل کا الزام لگایا جائے، تو وہ یہ کہے کہ ان لوگوں کو میں نے قتل نہیں کیا، بلکہ ان کو تو زہر، بجلی اور شیر نے قتل کیا ہے اور دلیل یہ دے کہ قتل تو صرف وہ ہوتا ہے جو ہاتھ کے ساتھ ہو اور میں نے ان مقتولین کی طرف اپنا ہاتھ دراز نہیں کیا، لہٰذا اُن کا قتل میری طرف ہرگز منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ تو جوبات اس کے جواب میں کہی جائے گی کہ قتل کے معنی رُوح کو نکال دینا ہیں، خواہ اسے اسبابِ قتل میں سے کسی سبب کو بروئے کار لا کر نکال دیا جائے، وہ زہر ہلاہل ہو، بجلی ہو یا درندہ ہو جو بھی ان اسباب میں سے کِسی کو اختیار کرے گا، اُسے قتل کے جرم میں موردِ الزام ٹھہرایا جائے گا، خواہ اُس نے اپنے ہاتھ سے قتل نہ بھی کیا ہو، اس طرح تصویر ہے کہ اس سے مُراد تصویر بنانا ہے اور ساری فتنہ سامانی تصویر بنانے میں ہے۔

شیخ مصطفٰے احمامی مزید فرماتے ہیں،

آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کیمرہ کے ساتھ تصویر بنانے والے کو ہاتھ کے ساتھ تصویر بنانے والے کی نسبت کئی گنا زیادہ عذاب ہوگا، کیونکہ کیمرہ ایک لمحہ میں جس قدر تصویریں بنا سکتا ہے، ہاتھ سے بنانے کے لیے تو کئی سال لگ جائیں گے

اور کوئی جس قدر زیادہ تصویریں بنائے گا، اسی قدر اُسے عذاب بھی زیادہ ہوگا یعنی آپ جانتے ہیں کہ ایک تصویر بنانا بھی بہت بڑا گناہ ہے جب کوئی دو تصویریں بنالے، تو گناہ اور زیادہ بڑا ہو جائے گا۔ اسی طرح جس قدر تصویروں کی تعداد بڑھتی جائے گی، مصور کے گناہوں میں اضافہ ہوتا جائے گا اور عذاب گناہوں کے بقدر ہوگا، یعنی جس طرح گناہ زیادہ ہوں گے، اسی قدر عذاب زیادہ بھی ہوگا اور لمبا بھی![1]

البتہ ان سب میں سے وہ تصویر جائز ہے جس میں کوئی خاص فائدہ ہو یا جسے کسی ناگزیر ضرورت کے لیے بنایا جائے۔ شیخ ناصر الدین البانی فرماتے ہیں:

میں قارئین کی توجہ اس طرف بھی مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ اگرچہ ہم بڑے وثوق کے ساتھ ہر قسم کی تصویر کی حرمت کے حامل ہیں، لیکن ہم اس تصویر کی ممانعت کے قائل نہیں جس میں فائدہ محققہ ہو اور اس کے ساتھ نقصان کا کوئی پہلو ثابت نہ ہو اور یہ فائدہ تصویر کے بغیر ممکن نہ ہو، مثلاً وہ تصویریں جن کی طب اور ڈاکٹری کے سلسلہ میں یا جغرافیہ میں یا مجرموں کی شناخت کے لیے ضرورت ہوتی ہے تاکہ انہیں پکڑا جا سکے یا لوگوں کو ان سے مطلع کیا جاسکے، تو اس قسم کی تصویریں جائز ہوں گی، — بلکہ شاید بعض مخصوص اوقات میں واجب بھی ہوں، اس کی دلیل درج ذیل دو حدیثیں ہیں:

۱۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ گڑیوں کے ساتھ کھیلا کرتی تھیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میری سہیلیوں کو میرے پاس لے آیا کرتے تھے تاکہ وہ میرے ساتھ کھیلیں

---

[1] الاعلام بنقد کتاب الحلال والحرام، شیخ صالح بن فوزان ص ۴۰، مشہور ترین علماء معاصرین میں سے جنہوں نے ہر طرح کی فوٹوگرافی اور تصویروں کو حرام قرار دیا ہے، خواہ وہ ہاتھ سے بنائی گئی ہوں یا کیمرہ سے، یہ حضرات بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں: (۱) شیخ محمد بن ابراہیم (۲) شیخ عبدالعزیز بن باز (۳) شیخ محمد امین شنقیطی (۴) شیخ ناصر الدین البانی اور (۵) شیخ احمد شاکر۔

اس حدیث کو بخاری (۱۰/ ۴۳۲) مُسلم (۷/ ۱۳۵) احمد (۶/ ۶۶، ۲۳۳، ۲۳۴) ـــــ الفاظ بھی امام احمدؒ ہی کی روایت کے ہیں ـــــ اور ابن سعد (۸/ ۶۶) نے روایت کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آپ کے پاس گڑیاں تھیں اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لاتے تو اُن سے کپڑے کے ساتھ پردہ کر لیتے۔ محدث ابو عوانہ اس کا سبب یہ بیان کرتے ہیں کہ آپ یہ اس لیئے کرتے تاکہ حضرت عائشہؓ اپنے کھیل کو ختم نہ کریں۔

اس حدیث کو ابن سعد (۷/ ۶۰) نے روایت کیا ہے اور اس کی سند بھی صحیح ہے۔ اس حدیث سے یہ استدلال بھی کیا گیا ہے کہ بچیوں کے کھیلنے کے لیے گڑیاں بنانا جائز ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویروں کی بابت جو ممانعت فرمائی ہے۔ یہ صورت اس سے مستثنیٰ ہے۔ قاضی عیاضؒ نے بھی بڑے وثوق کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے اور اسے جمہور کا مذہب بتایا ہے۔ بچیوں کے لیے گڑیوں کی خرید و فروخت جائز قرار دیا ہے، تاکہ انہیں بچپن ہی سے اُمورِ خانہ داری کی تربیت دی جا سکے۔

۲۔ حضرت ربیع بنت معوذؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراؑ کی صبح بستیوں (جو مدینہ منورہ کے گرد و پیش تھیں) کی طرف یہ پیغام بھجوا دیا کہ جس نے روزہ نہ رکھا ہو، وہ دن کا باقی حصہ بھی اسی حالت میں گزارے اور جس نے روزہ رکھا ہو وہ روزے کو برقرار رکھے۔ حضرت ربیع بیان فرماتی ہیں کہ اس کے بعد ہم ہمیشہ روزہ رکھتے تھے اور چھوٹے بچوں کو بھی روزہ رکھواتے اور انہیں اپنے ساتھ مسجد میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ ہم بچوں کو رُوئی کی گڑیاں بنا کر دیا کرتے، وہ انہیں اپنے ساتھ مسجد میں بھی لے جایا کرتے تھے۔ جب کوئی بچہ کھانے کی وجہ سے روتا تو (دل بہلانے کے لیے) ہم اسے گڑیا دے دیتے، حتیٰ کہ افطار کا وقت ہو جاتا۔

ایک روایت میں ہے کہ چھوٹے بچے جب ہم سے کھانا مانگتے تو ہم انہیں گڑیاں دے دیتے تاکہ وہ ان سے کھیلتے رہیں اور اپنے روزے کو پورا کرلیں۔

اسے بخاری (۴/۱۶۳) نے روایت کیا ہے۔ الفاظ بخاری ہی کے ہیں مسلم (۱۰۲/۲) نے بھی اسے روایت کیا ہے اور مسلم کی ایک دوسری روایت میں کچھ زائد الفاظ بھی آئے ہیں۔

یہ دو حدیثیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ تصویر اس وقت جائز ہے جب اس سے مصلحت یا تربیت کا کوئی پہلو وابستہ ہو جو تہذیب نفوس، ثقافت یا تعلیم کے لیے مفید ہو، لہٰذا ایسی تمام تصویریں جن میں اسلام یا مسلمان کا کوئی فائدہ ہو جائز ہوں گی، البتہ مشائخ، بزرگوں اور دوستوں کی تصویریں جن میں کوئی فائدہ نہیں ہوتا، بلکہ کافروں اور بتوں کے پجاریوں سے مشابہت کا باعث بنتی ہیں، حرام ہیں۔ واللہ اعلم۔[1]

مسئلہ تصویر سے متعلق احادیثِ نبویہ اور قدیم و جدید علماء محققین کے اقوال کا خلاصہ ہم نے پیش کر دیا ہے۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ہم اس حقیقت کو واضح کریں کہ وہ تمام اسباب و ذرائع جو انسان کو شرک تک پہنچاتے ہیں۔ اسلام نے انہیں حرام قرار دیا ہے۔

اس سے دوسرا مقصود علم شرعی کی طرف منسوب بعض حضرات کی اس زبردست غلطی کی طرف توجہ مبذول کرانا تھا، جنہیں کتابوں اور اسلامی و غیر اسلامی اخبار و جرائد میں اپنی تصویریں شائع کرانے کا بہت شوق ہے بلکہ بعض مدعیانِ علم و فضل اپنی تصویریں بنوانے کے لیے ایسے ماہر فوٹو گرافرس کی خدمات حاصل کرتے ہیں جو بڑے پرکشش پوز بنا سکتے ہوں۔ یہ فوٹو گرافر کبھی تو حضرت مولانا سے یہ کہتے ہیں کہ اس طرح کا لباس زیب تن فرمائیں اور کبھی کہتے ہیں کہ اس انداز سے بیٹھیں تو تصویر بڑی ہی جاذبِ نظر ہوگی۔ وَلِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ۔

---

[1] بلکہ اب تو نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ باقاعدہ احکام جاری ہوتے ہیں کہ تصویروں کو اس طرح اٹھایا جائے، اس انداز سے لٹکایا جائے اور اجتماعات وغیرہ کے مواقع پر اس ترتیب کے ساتھ سجایا جائے اور جب انہیں اٹھا کر لے جایا جا رہا ہو تو فوراً تعظیم کے لیے اٹھ کھڑا ہونا چاہیے۔ پھر یہ باتیں جاہلوں میں نہیں بلکہ مدعیانِ علم و فضل میں بھی عام ہو گئی ہیں۔ ولا حول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

دعوتِ نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو سب سے پہلے یہ دعوت دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتراف اور اس کے ساتھ شرک نہ کرنے کا اقرار کرے اور اس کے ساتھ کسی بُت، تصویر یا طاغوت کی پرستش نہ کرے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ[1]

ہم نے نوح کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا تو انہوں نے (ان سے) کہا اے میری برادری کے لوگو خدا کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں مجھے تمہارے بارے میں بڑے دن کے عذاب کا (بہت ہی) ڈر ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖۤ اِنِّيْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَنْ لَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ[2]

اور ہم نے نوح کو اُن کی قوم کی طرف بھیجا (تو انہوں نے ان سے کہا) کہ میں تم کو کھول کھول کر ڈر سنانے (اور یہ پیغام پہنچانے) آیا ہوں کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، مجھے تمہاری نسبت عذابِ الیم کا خوف ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ[3]

اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو انہوں نے ان سے کہا اے قوم خدا ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم ڈرتے نہیں!

---

[1] سورۃ الاعراف، آیت ۵۹ [2] سورۃ ہود، آیت ۲۵-۲۶ [3] سورۃ المومنون، آیت ۲۳

إِنَّآ أَرْسَلْنَا نُوحًا إِلَىٰ قَوْمِهِۦٓ أَنْ أَنذِرْ قَوْمَكَ مِن قَبْلِ أَن يَأْتِيَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ قَالَ يَـٰقَوْمِ إِنِّى لَكُمْ نَذِيرٌ مُّبِينٌ ۝ أَنِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ وَٱتَّقُوهُ وَأَطِيعُونِ ۝[1]	ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا کہ پیشتر اس کے کہ ان پر درد دینے والا عذاب واقع ہو اپنی قوم کو ہدایت کردو۔ انہوں نے کہا کہ بھائیو میں تم کو کھلے طور پر نصیحت کرتا ہوں کہ خدا کی عبادت کرو اور اس سے ڈرو اور میرا کہا مانو۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو برس تک اپنی قوم کے سامنے جو دعوت پیش کی اس کا خلاصہ "یَـٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَـٰهٍ غَيْرُهُۥٓ" ہے بلکہ تمام انبیاء کی دعوت کا خلاصہ بھی یہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ إِلَّا نُوحِىٓ إِلَيْهِ أَنَّهُۥ لَآ إِلَـٰهَ إِلَّآ أَنَا۠ فَٱعْبُدُونِ ۝[2]	اور جو پیغمبر ہم نے تم سے پہلے بھیجے، اُن کی طرف یہی وحی بھیجی کہ میرے سوا کوئی معبود نہیں تو میری ہی عبادت کرو۔

دُنیا کی اس زندگی میں لوگوں کا معاملہ اُس وقت تک درست قرار پا ہی نہیں سکتا، جب تک وہ اللہ تعالیٰ کے مطیعِ فرمان نہیں ہو جاتے اور حیات و موت کے ہر ہر لمحہ میں اس کے حکم کے سامنے سرِ اطاعت خم نہیں کر دیتے اور اس اطاعت و فرماں برداری کی اس وقت تک کوئی قدر و قیمت نہیں ہے، جب تک وہ فقط اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی کی عبادت نہ کریں اور جب تک وہ ہر اس چیز کی نفی نہ کر دیں جس کی من دُونِ اللہ پرستش کی جاتی ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کی شدید خواہش تھی کہ ان کی قوم ہلاکت و بربادی سے نجات پا جائے آپ اپنی قوم کی خیر و بھلائی چاہتے تھے۔ قوم سے کسی صلہ و ستائش کو نہیں چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ نے قوم سے خطاب کے لیے بڑے سادہ و پرکار اسلوب کو اختیار فرمایا اور ہر انداز سے انہیں دعوت دی۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیں۔

---

[1] سورۂ نوح ۷، آیت ۱-۳ [2] سورۂ ہود ۲۵-۲۶

(۱- آپ کو اپنی قوم سے جو شفقت و محبت تھی۔ اس کا اندازہ اس سے فرمایئے کہ آپ بار بار فرماتے ہیں کہ اے قوم! مجھے خطرہ ہے کہیں تم عذابِ عظیم کی گرفت میں نہ آجاؤ۔ اے میری قوم کے لوگو! میں ڈرتا ہوں کہ عذابِ الیم میں کہیں مبتلا نہ ہو جاؤ۔

۲- حضرت نوح علیہ السلام نے تمام امور کو بحُسن و خوبی سرانجام دیا اور اپنی صحیح صحیح پوزیشن بھی قوم کے سامنے پیش کی، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے نوحؑ کی زبانی ذکر فرمایا ہے،

وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِىْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ اِنِّىْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِىْٓ اَعْيُنُكُمْ لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِىْٓ اَنْفُسِهِمْ ۚ اِنِّىْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ [1]

میں نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں اور نہ یہ کہ میں غیب جانتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں اور نہ ان لوگوں کی نسبت جن کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو یہ کہتا ہوں کہ خدا ان کو بھلائی (یعنی اعمال کی جزائے نیک) نہیں دے گا جو ان کے دلوں میں ہے، اسے خدا خوب جانتا ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو بے انصافوں میں ہوں۔

یعنی نوح علیہ السلام اپنی قوم کی تردید کرتے ہوتے فرماتے ہیں کہ میں غیب نہیں جانتا، اور نہ مومنوں سے مال و دولت اور جاہ و منصب کا وعدہ کرتا ہوں بلکہ یہ کہتا ہوں کہ انہیں اللہ کریم اس دن اجر و ثواب سے نوازے گا، جب مال اور اولاد بھی نفع نہ دیں گے۔ میں نے تو یہ دعویٰ بھی نہیں کیا کہ میں کوئی معزز فرشتہ ہوں، میں تو بشر ہوں، ہاں! اللہ تعالیٰ نے مجھے نبوت و رسالت سے سرفراز فرمادیا ہے۔ جب قوم یہ کہتی ہے کہ اگر تم سچے ہو تو جاؤ اس عذاب کو لے آؤ جس سے تم ہمیں ڈرا دھمکا رہے ہو، لیکن آپ جواب دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ وحدہٗ لاشریک لہٗ یقیناً عذاب لا سکتے ہیں، عذاب لانا میرے بس کی بات نہیں، کیونکہ میں تو اللہ تعالیٰ

---

[1] سورۃ ہُود، آیت ۳۱

کا ایک ایسا بندہ ہوں، جسے اُس نے نبوّت و رسالت سے سرفراز فرما رکھا ہے، لہٰذا میرے اختیار میں نفع و نقصان نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

قَالَ اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ وَلَا يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْٓ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ۭ هُوَ رَبُّكُمْ ۣ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ ؎

نوح نے کہا کہ اس کو تو خدا ہی چاہے گا تو نازل کرے گا اور تم (اس کو کسی طرح) ہرا نہیں سکتے اور اگر میں یہ چاہوں کہ تمہاری خیر خواہی کروں اور خدا یہ چاہے کہ تمہیں گمراہ کرے تو میری خیرخواہی تم کو کچھ فائدہ نہیں دے سکتی، وہی تمہارا پروردگار ہے اور تمہیں اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

ہمارے مبلغین و دُعاۃ کے لیے بھی اس بات کی کس قدر شدید ضرورت ہے کہ وہ بھی اسی زندۂ جاوید اور ربانی طریق کار کو اختیار کریں اور لوگوں کو تربیت دیں کہ وہ ایمان بالغیب رکھیں، اللہ وحدہٗ سے اجر و ثواب کی امید رکھیں۔ قائدین و شیوخ کو چاہیے کہ وہ وزارتوں اور منصبوں کے وعدے پورے نہ ہونے کی صورت میں نوجوان، شیوخ اور قائدین کے دشمن نہ بن جائیں۔

۳۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم سے بیان فرماتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ میں امانت و صداقت میں معروف ہوں۔ اُجرت اور مال و دولت کا خواہشمند نہیں اور صرف اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ ہی سے اجر و ثواب کی اُمید رکھتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں،

فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ۭ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ۝ ؎

اور اگر تم نے منہ پھیر لیا تو (تم جانتے ہو کہ) میں نے تم سے کچھ معاوضہ نہیں مانگا میرا معاوضہ تو خدا کے ذمّہ ہے اور مجھے حکم ہوا ہے کہ میں فرمانبرداروں میں رہوں۔

؎ سورۂ ہود، آیت ۳۳-۳۴ ؎ سورۂ یونس، آیت ۷۲

وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْآ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ○ [1]

اور اے قوم! میں اس (نصیحت) کے بدلے تم سے مال وزر کا خواہاں نہیں ہوں، میرا صلہ تو خدا کے ذمے ہے اور جو لوگ ایمان لائے ہیں، میں اُن کو نکالنے والا بھی نہیں ہوں، وہ تو اپنے پروردگار سے ملنے والے ہیں، لیکن میں دیکھتا ہوں کہ تم لوگ نادانی کر رہے ہو۔

كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوْحِ ِالْمُرْسَلِيْنَ ○ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ نُوْحٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ○ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ○ [2]

قوم نوح نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا ہے، جب ان سے ان کے بھائی نوح نے کہا کہ تم ڈرتے کیوں نہیں، میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں۔

۴۔ کبھی حضرت نوح علیہ السلام اپنی قوم کی توجہ انفس و آفاق کی نشانیوں کی طرف بھی مبذول کراتے ہیں ——— اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو شمار کراتے ہیں، شاید کہ وہ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو اختیار کرلیں اور ان بتوں کی عبادت سے باز آجائیں جو نفع و نقصان کے قطعاً مالک ہی نہیں ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا ○ وَقَدْ خَلَقَكُمْ اَطْوَارًا ○ اَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا ○ وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيْهِنَّ نُوْرًا وَّجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا ○ وَاللّٰهُ اَنْۢبَتَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ نَبَاتًا ○ ثُمَّ يُعِيْدُكُمْ فِيْهَا وَيُخْرِجُكُمْ

تم کو کیا ہوا ہے کہ تم خدا کی عظمت کا اعتقاد نہیں رکھتے، حالانکہ اُس نے تم کو طرح طرح کی حالتوں کا پیدا کیا ہے۔ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ خدا نے سات آسمان کیسے اوپر تلے بنائے ہیں اور چاند کو ان میں (زمین کا) نور بنایا ہے اور سُورج کو چراغ ٹھہرایا ہے اور خدا ہی نے تم کو زمین سے پیدا کیا ہے، پھر اسی میں تمہیں لوٹا دے گا اور

[1] سُورۃ ہُود، آیت ۲۹ [2] سُورۃ الشعراء ایت ۱۰۵-۱۰۷

إِخْرَاجًا ۝ وَاللّٰهُ جَعَلَ لَكُمُ الْأَرْضَ بِسَاطًا لِتَسْلُكُوا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا ۝ ؎۱

(اسی سے) تم کو نکال کھڑا کرے گا اور خدا ہی نے زمین کو تمہارے لیے فرش بنایا تاکہ اس کے بڑے بڑے کشادہ رستوں میں چلو پھرو۔

حضرت نوح علیہ السلام مایوس نہیں تھے اور نہ ہی آپ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید تھے اس لیے دن رات، ظاہری اور باطنی طور پر ہر حال میں اللہ تعالیٰ کے دین کی دعوت دیتے رہتے تھے:

قَالَ رَبِّ إِنِّي دَعَوْتُ قَوْمِي لَيْلًا وَّنَهَارًا ۝ فَلَمْ يَزِدْهُمْ دُعَاءِي إِلَّا فِرَارًا ۝ وَإِنِّي كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوا أَصَابِعَهُمْ فِي آذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِيَابَهُمْ وَأَصَرُّوا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝ ثُمَّ إِنِّي أَعْلَنْتُ لَهُمْ وَأَسْرَرْتُ لَهُمْ إِسْرَارًا ۝ ؎۲

(نوح علیہ السلام نے) خدا سے عرض کی کہ پروردگار! میں اپنی قوم کو رات دن بلاتا رہا لیکن میرے بلانے سے وہ اور زیادہ گریز کرتے رہے، جب بھی میں نے اُن کو بلایا کہ (توبہ کریں اور) تو اُن کو معاف فرمائے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور کپڑے اوڑھ لیے اور اَڑ گئے اور اکڑ بیٹھے، پھر بھی میں اُن کو کھلے طور پر بھی بلاتا رہا اور ظاہر اور پوشیدہ ہر طرح سمجھاتا رہا۔

حضرت نوح علیہ السلام کسی اکتاہٹ یا تھکاوٹ کے اظہار کے بغیر ساڑھے نو سو برس تک دعوت الی اللہ کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ جب بھی قوم اعراض کرتی، آپ دعوت کے اسلوب و انداز میں تبدیلی فرما لیتے یعنی قوم جب آپ کی علی الاعلان دعوت و تبلیغ سے بھاگتی تو آپ نہایت حکمت و دانش کے ساتھ انہیں خفیہ طریقوں سے دعوت دینے لگ جاتے، لیکن آپ تمام حالات میں ازحد رحم دلی کا مظاہرہ فرماتے اور اس بات سے ڈرتے رہتے کہ آپ کی قوم عذاب الیم کا شکار نہ ہو جائے

؎۱ سورۃ نوح، آیت ۱۳-۲۰ ؎۲ سورۃ نوح، آیت ۵-۹

حضرت نوح علیہ السلام صبر کا پہاڑ، حلم و بُرد باری اور وسعت و فراخ دلی کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی، محنت و جواں مردی کا کوہِ وقار اور تواضع و انکساری کا مجسّم تھے اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ اجر و صلہ کے قوم سے خواہش مند نہ تھے اور نہ ہی آپ نے دعوت الی اللہ کو مال و دولت کے جمع کرنے کا ذریعہ بنایا تھا، کیا اس سے داعیانِ راہِ خدا سبق حاصل نہ کریں گے جن پر مایوسی فوراً چھا جاتی ہے اور وہ اپنی قوم کے بارے میں سوءِ ظن میں مبتلا ہو کر فوراً ظالمانہ احکام جاری کرنا شروع کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ ہر پیش آمدہ صدمہ سے شکست کھا جاتے ہیں۔ کیا اس سے وہ دُعاۃ و مبلغین کوئی نصیحت حاصل کریں گے جو اپنے آپ کو بڑا مقدس سمجھتے ہیں اور اپنے بھائیوں کی طرف سے کسی تنقید یا نصیحت کو گوارا نہیں کرتے اور نہ معاوضہ کے بغیر دعوت الی اللہ — کا کام کرنے کے لیے آمادہ ہیں؟

سردارانِ قوم کا موقف

سردارانِ قوم کے لیے قرآن حکیم میں جو لفظ استعمال ہوا ہے، وہ "اَلْمَلَأُ" ہے۔ یہ ایک جامع لفظ ہے جو ظالم حکمرانوں کے حمایتیوں، مصلحت پسندوں، دولت مندوں، منافقوں اور قبائل اور علاقوں کے سربراہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عجب شان ہے کہ یہ لوگ انبیاء کرام کی مخالفت کرنے والوں میں سرِ فہرست تھے، کیونکہ ان کے نفس حبِّ مال و جاہ سے بھرے ہوئے تھے اور ہر داعی الی اللہ کی مخالفت ان کے دلوں میں رچی بسی ہوئی تھی، انہی کی بابت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَمَآ اَرْسَلْنَا فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ اِنَّا بِمَآ

اور ہم نے کسی بستی میں کوئی ڈرانے والا نہیں بھیجا مگر وہاں کے خوشحال لوگوں نے کہا کہ جو چیز تم

أُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝ [1] دے کر بھیجے گئے ہو، ہم اس کے قائل نہیں۔

ان خوشحال لوگوں نے حضرت نوح علیہ السلام کے خلاف جنگ کی سی کیفیت پیدا کردی، زمین میں فتنہ و فساد برپا کرنا شروع کردیا اور رُوئے زمین کی طرف مبعوث اس گرامی منزلت رسول کی مخالفت کے لیے تمام ساز و سامان وقف کر دیئے تھے۔

۱۔ قومِ نوح کے سرداروں کا آپ پر ایک بہت بڑا اعتراض یہ تھا کہ فقراء و مساکین اور کمزور لوگوں نے آپ کی اتباع کی ہے، اشراف و سردارانِ قوم میں سے کسی ایک نے بھی تو آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا۔ قرآنِ حکیم میں ان کے اس اعتراض کا تذکرہ یوں آیا ہے:

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۢ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِيْنَ ۝ [2]

تو اُن کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ ہم تم کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیروکار وہی لوگ ہوئے ہیں جو ہم میں ادنیٰ درجے کے ہیں اور وہ بھی رائے ظاہر سے (نہ غور و تعمق سے) اور ہم تم میں اپنے اوپر کسی طرح کی فضیلت نہیں دیکھتے، بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

"اَرَاذِلُنَا" کا لفظ جو استعمال ہوا ہے، اس کے معنی ردی اور ذلیل و خوار قسم کے لوگ ہیں اور اس سے ان کی مُراد یہ تھی کہ ان لوگوں کا شمار اکابر و اشرافِ قوم میں سے نہیں ہے، بلکہ یہ زراعت پیشہ، کاریگر اور کارکن قسم کے لوگ ہیں۔

"بَادِيَ الرَّاْيِ" کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے رائے ظاہر سے، یعنی اس کے حُسن و قبح اور انجام کا جائزہ لیے بغیر اور باطنی کیفیت میں غور و فکر کیے بغیر اس نبی کی اطاعت کو اختیار کرلیا ہے [3]۔ اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ بھی ان کے اس اعتراض اور حضرت نوح علیہ السلام

---

[1] سورۃ سبا، آیت ۳۴ [2] سورۃ ہود، آیت ۲۷ [3] تفسیر المنار، رشید رضا ۱۲/۶۱، دار المعرفۃ بیروت

یہ جواب کا ذکر فرمایا ہے:

قَالُوْٓا اَنُؤْمِنُ لَكَ وَاتَّبَعَكَ الْاَرْذَلُوْنَ ۝ قَالَ وَمَا عِلْمِیْ بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝ اِنْ حِسَابُهُمْ اِلَّا عَلٰی رَبِّیْ لَوْ تَشْعُرُوْنَ ۝ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ [1]

وہ بولے کہ کیا ہم تم کو مان لیں اور تمہارے پیرو تو رذیل لوگ ہوئے ہیں (نوح نے) کہا کہ مجھے کیا معلوم کہ وہ کیا کرتے ہیں ان کا حساب (اعمال) میرے پروردگار کے ذمے ہے۔ کاش! تم سمجھو اور میں مومنوں کو نکال دینے والا نہیں ہوں۔

اس طبقاتی کشمکش کی جڑیں ابھی تک ہمارے اس دور میں بھی نہایت گہری ہیں جسے تہذیب و ترقی کا دور کہا جاتا ہے، بعض مدعیانِ علم کی یہ عادت ہے کہ وہ ان لوگوں کے سامنے بڑے فخر و غرور کا اظہار کرتے ہیں جو بے علم ہیں اور دولت مندوں اور سرمایہ داروں کا یہ حال ہے خواہ سرمایہ داری کے کسی بھی گروہ سے ان کا تعلق ہو کہ وہ کارکنوں، مزدوروں اور فقراء کو حقیر سمجھتے ہیں، خواہ وہ علم و فضل کے کتنے ہی اونچے مقام پر فائز کیوں نہ ہوں۔ اسی طرح اونچے اونچے عہدوں اور منصبوں پر فائز لوگ عامۃ الناس کو بہت ہی حقیر سمجھتے ہیں اور اپنے آپ کو خدائی کے مقام و مرتبہ سے کم تر سمجھتے ہی نہیں، حالانکہ یہ سب کے سب پیمانے اور معیارِ جاہلیت کے معیار ہیں، خواہ یہ لوگ کس قدر چیخ و پکار کرتے ہوئے انہیں عدل و مساوات ہی کا نام کیوں نہ دیں، جبکہ اللہ سبحانہٗ و تعالیٰ کے ہاں جس معیار کو پذیرائی حاصل ہے، وہ یہ ہے:

اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ [2]

خدا کے نزدیک تم میں زیادہ عزت والا وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے۔

متقی اور پرہیزگار لوگ مخلوقِ خدا میں سب سے زیادہ معزز اور بلند و بالا مرتبت کے حامل ہیں، خواہ پراگندہ حال ہی کیوں نہ ہوں، مفلس و قلاش ہی کیوں نہ ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت نوح

---

[1] سورۃ الشعراء آیت ۱۱۱ - ۱۱۴ [2] سورۃ الحجرات، آیت ۱۳

نے اپنی قوم کی تردید میں فرمایا تھا:

وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ — اور میں مومنوں کو نکال دینے والا نہیں ہوں۔[1]

کیونکہ یہ مومن ہیں اور ان کے لیے یہی بات بے حد باعثِ عزّ و شرف ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دولتِ ایمان سے سرفراز فرما رکھا ہے۔

۲- نوح علیہ السلام کی قوم کے سردار و اشراف یہ بھول گئے کہ حضرت کو نبوت و رسالت سے قبل معاشرہ میں کس قدر اونچا مقام حاصل تھا۔ آپ دعویٰ نبوت سے قبل بھی صادق اور امین تھے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی امانت و صداقت پر کسی کو زبان دراز کرنے کی جرأت نہ تھی، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت سے سرفراز فرما دیا، تو آپ کا پہلا ہدف ہی ظالم قائدین کے مخالف تھا، لہٰذا انہوں نے طرح طرح کی الزام تراشیاں شروع کر دیں۔ مثلاً کبھی تو وہ یہ کہتے:

قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ۝[2] — جو اُن کی قوم میں سردار تھے، وہ کہنے لگے کہ ہم تمہیں صریح گمراہی میں (مبتلا) دیکھتے ہیں۔

کبھی آپ پر جھوٹ کی تہمت لگاتے:

فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا عَمِیْنَ ۝[3] — ان لوگوں نے ان کی تکذیب کی تو ہم نے نوح کو اور جو اُن کے ساتھ کشتی میں سوار تھے ان کو تو بچا لیا اور جن لوگوں نے ہماری آیتوں کو جھٹلایا تھا انہیں غرق کر دیا، کچھ شک نہیں کہ وہ اندھے لوگ تھے۔

وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَیْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ كٰذِبِیْنَ ۝ — اور ہم تم میں اپنے اوپر کسی طرح کی فضیلت نہیں دیکھتے۔ بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

---

[1] سورۃ الاعراف، آیت ۶۰ [2] سورۃ الاعراف، آیت ۶۴

[3] سورۃ ہود، آیت ۲۷

أَمْ يَقُولُونَ افْتَرَاهُ قُلْ إِنِ افْتَرَيْتُهُ فَعَلَيَّ إِجْرَامِي وَأَنَا بَرِيءٌ مِّمَّا تُجْرِمُونَ[1]

کیا یہ کہتے ہیں کہ اس (پیغمبر) نے قرآن اپنے دل سے بنالیا ہے کہہ دو کہ اگر میں نے دل سے بنالیا ہے تو میرے گناہ کا وبال مجھ پر اور جو گناہ تم کرتے ہو' اس سے میں بری الذمہ ہوں

اس قسم کی تہمتوں کے ساتھ ساتھ وہ آپ کو (نعوذ باللہ) مجنون کہتے ہوئے بھی نہ شرماتے تھے۔

إِنْ هُوَ إِلَّا رَجُلٌ بِهِ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوا بِهِ حَتَّىٰ حِينٍ[2]

اس آدمی کو تو دیوانگی (کا عارضہ) ہے تو اس کے بارے میں کچھ مدت انتظار کرو۔

آہ! جب مخالفت شروع کر دی جاتے تو پھر معیار اسی طرح بدل جاتے' پیمانے ڈگمگا جاتے اور قدریں بدل جاتی ہیں' کیونکہ برتن سے وہی برآمد ہوتا ہے جو کچھ اس میں ہو۔

۳- اشرافِ قوم کی سب سے بڑی خواہش یہ ہوتی ہے کہ انہیں سیادت و قیادت حاصل رہے اور وہ اصحابِ حل و عقد بنے رہیں۔ اسی وجہ سے اُن کے ہاں جنگ و جدال کا میدان گرم رہتا ہے' کیونکہ ان کی سوچ یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی ہے، وہ بس یہی دُنیا ہی ہے لہٰذا وہ اپنی ذات کے انکار اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس کی مکمل اطاعت کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نوح پر بھی یہ الزام لگایا کہ آپ سیادت و قیادت چاہتے ہیں؛

فَقَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَوْمِهِ مَا نَرَاكَ إِلَّا بَشَرًا مِّثْلَنَا وَمَا نَرَاكَ اتَّبَعَكَ إِلَّا الَّذِينَ هُمْ أَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّأْيِ وَمَا نَرَىٰ لَكُمْ عَلَيْنَا

اُن کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ ہم تم کو اپنے ہی جیسا ایک آدمی دیکھتے ہیں کہ تمہارے پیرو وہی لوگ ہوتے ہیں جو ہم میں ادنیٰ درجے کے ہیں اور وہ بھی رائے ظاہر سے (نہ غور و تعمق سے) اور ہم تم میں اپنے اوپر کسی

---

[1] سورۃ ہود، آیت ۳۵ [2] سورۃ المومنون، آیت ۲۵

مِنۡ فَضۡلٍۭ بَلۡ نَظُنُّکُمۡ کٰذِبِیۡنَ۔[1] طرح کی فضیلت نہیں دیکھتے، بلکہ تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔

نیز فرمایا:

فَقَالَ الۡمَلَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ مَا ھٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۙ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتَفَضَّلَ عَلَیۡکُمۡ۔[2]

اُن کی قوم کے سردار جو کافر تھے، کہنے لگے کہ یہ تو تم ہی جیسا آدمی ہے، تم پر بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے۔

ان کا جو یہ قول ہے کہ "تمہیں ہم پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اصحابِ فضل تو اشرافِ قوم ہیں، جن کے پاس قوت بھی ہے، مادی طاقت بھی، اور افرادی کثرت بھی، جبکہ نوح علیہ السّلام اور ان کے ساتھ ایمان والوں کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے اسی طرح انہوں نے جو یہ کہا کہ "ہم تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو کوئی رسالت ہے اور نہ رسول، بلکہ یہ ایک طبقاتی کشمکش ہے جس کا مقصد سردارانِ قوم کے بجائے غلاموں اور حقیر لوگوں کو حکومت و اقتدار سونپ دینا ہے۔

۴۔ سردارانِ قوم کی نوح علیہ السّلام کے خلاف جو سب سے بڑی دلیل تھی وہ یہ کہ اُس کی عادات تو ہم جیسی ہی ہیں، جبکہ آپ کا طرزِ عمل آباؤ اجداد کے منافی ہے۔ اس بات کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے،

فَقَالَ الۡمَلَؤُا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا مِنۡ قَوۡمِہٖ مَا ھٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ ۙ یُرِیۡدُ اَنۡ یَّتَفَضَّلَ عَلَیۡکُمۡ ؕ وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَاَنۡزَلَ مَلٰٓئِکَۃً ۚۖ مَّا سَمِعۡنَا بِھٰذَا فِیۡۤ اٰبَآئِنَا الۡاَوَّلِیۡنَ ۔[3]

اُن کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ یہ تو تم ہی جیسا آدمی ہے، تم پر بڑائی حاصل کرنا چاہتا ہے اور اگر خدا چاہتا تو فرشتے اتار دیتا۔ ہم نے اپنے اگلے باپ دادا میں تو یہ بات کبھی سُنی نہیں۔

---

[1] سورۃ ہُود، آیت ۲۷، [2] سورۃ المؤمنون، آیت ۲۴ [3] ایضاً، ۲۴

یعنی اُن کا کہنا یہ تھا کہ حق بات وہی ہے جو ہمارے آباؤ اجداد سے منقول ہو، جو ان سے منقول نہ ہو وہ ضلالت و گمراہی ہے، حالانکہ اُمتوں اور قوموں کی یہ بدترین آزمائش ہوتی ہے کہ ان کے قائدین اور مفکرین آباؤ اجداد کے افکار و تصورات ہی پر اکتفا کریں اور اُن پر اس قدر جمود طاری ہو کہ وہ کسی اور طرف دھیان دینے کے لیے آمادہ ہی نہ ہوں۔ قابلِ افسوس بات یہ کہ آج بھی کچھ لوگ قومِ نوح کے جمود کا تو مذاق اڑاتے ہیں، مگر وہ اپنے شیوخ اور قائدین کے آراء و فتاویٰ سے سرِ مُو انحراف کرنے کے لیے تیار نہیں۔ تعجب ہے کہ انسان کو دوسروں کی آنکھ کا تنکا تو نظر آجاتا ہے مگر اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا۔

خاندانِ نوحؑ

قوم کے لوگ اور دوست و احباب تو ایک داعی و مبلغ کے لیے باعثِ ابتلاء و آزمائش ہوتے ہیں، لیکن وہ جب اپنے گھر آتا ہے، تو گھر کے پُرسکون ماحول میں راحت، اطمینان اور تسکین محسوس کرتا ہے جیسا کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم درِ دولت پر تشریف لاکر حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی رفاقت میں تسکین محسوس فرمایا کرتے تھے، مگر حضرت نوح علیہ السلام کے لیے قوم بھی باعثِ ابتلاء تھی اور اہل و عیال بھی آزمائش تھے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّامْرَاَتَ لُوْطٍ كَانَتَا تَحْتَ عَبْدَيْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَيْنِ فَخَانَتَاهُمَا فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا وَّقِيْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِيْنَ ۝ [1]	خدا نے کافروں کے لیے نوحؑ کی بیوی اور لوطؑ کی بیوی کی مثال بیان فرمائی ہے۔ دونوں ہمارے دو نیک بندوں کے گھر میں تھیں اور دونوں نے ان کی خیانت کی، تو وہ خدا کے مقابلے میں ان عورتوں کے کچھ بھی کام نہ آئے اور ان کو حکم دیا گیا کہ اور داخل ہونے والوں کے ساتھ تم بھی دوزخ میں داخل ہو جاؤ

[1] سورۃ تحریم، آیت ۱۰

حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی کی خیانت یہ تھی کہ وہ آپ کی باتوں اور آپ کے بھیدوں سے آپ کے دشمنوں کو مطلع کر دیا کرتی تھی۔ جب کوئی شخص آپ پر ایمان لاتا تو وہ فوراً ظالموں اور سرکشوں کو مطلع کر دیا کرتی تھی۔ یہ دین کی خیانت ہے، اس سے مراد عزت کی خیانت نہیں ہے، کیونکہ انبیاء کرام کی بیویاں زنا سے پاک ہوتی ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ "فَلَمْ يُغْنِيَا عَنْهُمَا مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا" میں اس بات کی صراحت ہے کہ کفر کی موجودگی میں رشتہ ازدواج بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا۔ عام رشتہ داریوں کی بابت تو اللہ تعالیٰ نے اس سے بھی زیادہ واضح انداز میں بیان فرمایا ہے،

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ۙ — اس دن مال اور بیٹے نفع نہ دیں گے۔

نیز فرمایا:

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۙ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ ۙ[1] — اس دن آدمی اپنے بھائی سے دور بھاگے گا اور اپنی ماں اور باپ سے بھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی ہی گھر میں آخری مصیبت نہ تھی، بلکہ آپ کے بیٹے نے بھی آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہا، باپ کی مخالفت کی اور مشرکوں کی جماعت میں داخل ہو گیا یہ بات طبیعت پر انتہائی گراں گزرتی ہے کہ انسان اپنے بیٹے کو اپنا دست و بازو نہ پائے بلکہ اسے دشمنوں کی صف میں دیکھے۔ نوح علیہ السلام نے طوفان کے آغاز میں بیٹے کو غرق ہونے سے بچانے کی بہت کوشش کی، مگر مشرک کے لیے نجات کہاں؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَنَادٰى نُوْحُ ۨ ابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ۭ — نوح نے اپنے بیٹے کو کہ (کشتی سے) الگ تھا، پکارا کہ بیٹا ہمارے ساتھ سوار ہو جا اور کافروں میں شامل نہ ہو۔ اس نے کہا کہ میں (ابھی) پہاڑ سے جا لگوں گا، وہ مجھے پانی سے بچا لے گا۔

---

[1] اضواء البیان، شیخ شنقیطی ۸/۳۸۱

قَالَ لَاعَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝ ؎۱

انہوں نے کہا کہ آج خدا کے عذاب سے کوئی بچانے والا نہیں (اور نہ ہی کوئی بچ سکتا ہے) مگر جس پر خدا رحم کرے، اتنے میں دونوں کے درمیان لہر آحائل ہوئی اور وہ ڈوب کر رہ گیا۔

نیز فرمایا،

وَنَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ ۝ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ فَلَا تَسْئَلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ اِنِّىْٓ اَعِظُكَ اَنْ تَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ اِنِّىْٓ اَعُوْذُ بِكَ اَنْ اَسْئَلَكَ مَا لَيْسَ لِىْ بِهٖ عِلْمٌ وَ اِلَّا تَغْفِرْ لِىْ وَ تَرْحَمْنِىْٓ اَكُنْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ ؎۲

اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا اور کہا کہ اے پروردگار میرا بیٹا میرے گھر والوں میں ہے (تو اس کو بھی نجات دے) تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب سے بہتر حاکم ہے۔ خدا نے فرمایا کہ نوح وہ تیرے گھر والوں میں نہیں ہے وہ تو ناشائستہ افعال والا ہے تو جس چیز کی تم کو حقیقت معلوم نہیں، اس کے بارے میں مجھ سے سوال ہی نہ کرو اور میں تم کو نصیحت کرتا ہوں کہ نادان نہ بنو۔ نوح نے کہا پروردگار، میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی حقیقت مجھے معلوم نہیں اور اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں کرے گا، تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔

نوح علیہ السلام اپنے رب کے احکام کی بھلا مخالفت کیا کرتے، پس انہوں نے اپنے بیٹے کے بارے میں کوشش کی کہ وہ طوفان میں غرق نہ ہو اور اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں

؎۱ سورۃ ہود، ۴۲ - ۴۳ ؎۲ ایضاً، آیت ۴۵ - ۴۷

نوح علیہ السلام بھی آخر انسان تھے، انہوں نے جب اپنی آنکھوں کے سامنے بیٹے کو غرق ہوتے دیکھا اور دیکھا کہ موت اُن کے لختِ جگر کے سر پر منڈلا رہی ہے تو شفقتِ پدری کے جذبات میں تلاطم پیدا ہوگیا۔ آہ! شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

وانما اولادنا بیننا اکبادنا تمشی علی الارض

ہمارے بچے ہمارے جگر کے ٹکڑے ہیں، جو زمین پر چل پھر رہے ہیں

لو هبت الریح علی بعضهم لامتنعت عینی من الغمض[1]

ان میں سے اگر کوئی کسی مصیبت میں مبتلا ہو تو میری آنکھوں کی نیند اڑ جاتی ہے

ابو الحسن تہامی نے اپنے بچے کی میت کو دفن کرتے ہوئے کہا تھا ؎

فکأنّ قلبي قبره وکأنّهُ في طيه سر من الأسرار

میرا دل گویا اس کی قبر ہے اور وہ اپنی قبر میں گویا ایک راز ہے

طُوفان اس قدر ہولناک اور دہشت انگیز ہوتا ہے کہ عقلیں گم ہو جاتی ہیں اور افکار و خیالات اسے بیان کرنے سے عاجز و قاصر ہو جاتے ہیں۔ اس خوفناک فضا میں جو طوفان کی آمد سے چند لمحے پہلے طاری ہوگئی تھی، نوح علیہ السلام فوراً اپنے رب کی طرف متوجہ ہوگئے اور عرض کرنے لگے: "اے اللہ! میرا بیٹا بھی میرے اہل و عیال میں سے ہے، تیرا وعدہ سچا ہے اور تو سب بادشاہوں سے بڑا بادشاہ ہے۔" نوح علیہ السلام نے درج ذیل وعدۂ الٰہی کی طرف اشارہ کیا ہے:

حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ	یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تنور جوش مارنے لگا تو ہم نے (نوح کو) حکم دیا کہ ہر قسم (کے جانداروں) میں سے جوڑا جوڑا (یعنی) دو (دو جانور) ایک ایک نر اور ایک ایک

---

[1] یہ اشعار حطان بن معلی کے ہیں، دیوان الحماسہ ۱/۱۰۱

عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ [1]

مادہ) لے لو اور جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے (کہ ہلاک ہو جائے گا) اس کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو اور جو ایمان لایا ہو اس کو کشتی میں سوار کر لو اور ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے۔

خاندانِ نوحؑ میں سے جو ان لوگوں میں شامل تھے، جن کے بارے میں فیصلہ ہو چکا تھا، ایک تو اُن کی بیوی تھی اور دوسرا بیٹا۔ انہی کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَلَا تُخَاطِبْنِيْ فِي الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝

اور ظالموں کی بابت مجھ سے بات نہ کیجیے وہ یقیناً غرق کر دیئے جائیں گے۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے کسی بھی حکم کی کوئی مخالفت نہیں کی تھی بس زیادہ سے زیادہ یہ بات تھی کہ آپ نے اپنے اس بیٹے کی نجات کے لیے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی تھی جس کا تعلق کافروں کے ساتھ تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے نہایت شدید اور پُرزور انداز میں آپ کی اس درخواست کو رد کر دیا اور فرمایا:

قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ ۚ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ ۝

فرمایا کہ نوح وہ تیرے گھر والوں میں نہیں ہے وہ تو ناشائستہ افعال ہے۔

یعنی اے نوح! آپ مومن ہیں اور آپ کا بیٹا کافر ہے تو پھر وہ آپ کے اہل میں سے کیسے ہو سکتا ہے؟ نوح! ان باتوں کی بابت سوال ہی نہ کرو جن کا آپ کو علم ہی نہیں ہے۔ خبردار!! کہیں جاہلوں میں سے نہ ہو جانا۔

حافظ ابن کثیرؒ نے "فَلَا تَسْـَٔلْنِ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ" کی تفسیر میں یہ لکھا ہے کہ یہ ممانعت اس بات پر دلالت کناں ہے کہ دُعا کے لیے یہ شرط ہے کہ ایسی چیز کی دُعا کی جائے جو شریعتِ الٰہی میں جائز ہو اور مخلوق سے متعلق اللہ تعالیٰ کی جو سنتیں ہیں، ان کے موافق ہو، یعنی

[1] سورۂ ہود، آیت ۴۰

کسی ایسی بات کی دُعا کرنا جائز نہیں جو حرام ہو یا اللہ تعالیٰ کے سُنن قطعیہ کے مخالف ہو۔[1]

ارشادِ باری تعالیٰ اِنِّیۡۤ اَعِظُکَ اَنۡ تَکُوۡنَ مِنَ الۡجٰہِلِیۡنَ کے معنی یہ ہیں کہ میں تمہیں اس بات سے منع کرتا ہوں کہ ان جاہلوں میں سے نہ بن جانا، جو اپنی شہوات، خواہشات اور دُنیوی منافع کے پجاری ہوتے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے یہ سُنا تو شدتِ خوف کے باعث اُن کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا، ملامتِ الٰہی سے کانپنے لگے اور اللہ تعالیٰ کے حضور ان الفاظ میں توبہ و استغفار کرنے لگے۔

رَبِّ اِنِّیۡۤ اَعُوۡذُ بِکَ اَنۡ اَسۡـَٔلَکَ مَا لَیۡسَ لِیۡ بِہٖ عِلۡمٌ ؕ وَ اِلَّا تَغۡفِرۡ لِیۡ وَ تَرۡحَمۡنِیۡۤ اَکُنۡ مِّنَ الۡخٰسِرِیۡنَ ۔

نوح نے کہا پروردگار! میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ ایسی چیز کا تجھ سے سوال کروں جس کی حقیقت مجھے معلوم نہیں اور اگر تو مجھے نہیں بخشے گا اور مجھ پر رحم نہیں فرمائے گا، تو میں تباہ ہو جاؤں گا۔

نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے اس قصہ سے مجھے وہ واقعہ یاد آگیا، جب ابو طالب کی وفات کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی مغفرت کی دُعا کی اور فرمایا کہ بخدا! میں اس وقت تک تیری مغفرت کی دُعا کرتا رہوں گا، جب تک مجھے اس سے منع نہیں کر دیا جاتا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان الفاظ میں اس سے منع فرما دیا:

مَا کَانَ لِلنَّبِیِّ وَ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ یَّسۡتَغۡفِرُوۡا لِلۡمُشۡرِکِیۡنَ ۔[2]

نبی اور ایمان والوں کے لیے یہ شایانِ شان نہیں کہ وہ مشرکوں کے لیے مغفرت کی دُعا کریں۔

امام احمدؒ نے حضرت ابو بُریدہ سے اور انہوں نے اپنے باپ سے روایت کیا ہے کہ ہم ایک سفر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آپ نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالا، ہماری تعداد اس وقت ایک ہزار سوار کے قریب تھی، آپ نے دو رکعت نماز ادا فرمائی، پھر ہماری طرف رخ انور کیا تو آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ میرے ماں باپ آپ پر نثار ہوں،

---

[1] تفسیر المنار، رشید رضا ۱۲/۸۵، دار المعرفۃ، بیروت [2] صحیح بخاری، فتح الباری ۱۰/۱۲۴، المطبعۃ الحلبی

یارسول اللہ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب عزوجل سے اپنی والدہ کی مغفرت کے لیے سوال کرنے کی اجازت چاہی تو مجھے اجازت نہیں دی گئی، تو اُن کے لیے آگ کے ڈر کے باعث میری آنکھوں سے آنسو نکل آئے ہیں۔

مختصر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی نوح علیہ السلام کی سرزنش کی کہ انہوں نے اپنے مشرک بیٹے کی طوفان سے نجات کے لیے سوال کیوں کیا ہے' اسی طرح اللہ تعالیٰ نے خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بات کی اجازت نہ دی کہ آپ اپنی والدہ آمنہ کے لیے مغفرت کی دُعا کریں اور اسی طرح ابوطالب کے لیے مغفرت کی دُعا پر اللہ تعالیٰ نے ناراضی کا اظہار بھی فرمایا حالانکہ ابوطالب نے اپنا سب کچھ اپنے برادرزادے کے لیے وقف کر دیا اور وہ ہمیشہ یہ شعر پڑھا کرتا تھا:

وَاللّٰہ لن یصلوا الیك بجمعھم   حتّٰی أوسد فی التراب دفینا

بخدا! میرے مٹی میں دفن ہونے تک تو یہ لوگ آپؐ کو کوئی گزند نہیں پہنچا سکتے۔

لیکن ہماری کیفیت یہ ہے کہ ہزاروں سال گزرنے کے بعد بھی ہم گارے اور مٹی کے رشتوں کو دین کے رشتوں سے زیادہ مضبوط سمجھتے ہیں، اسی طرح ہمارے کچھ بھائی بندوں کے نزدیک وہ جغرافیائی نسبتیں جنہیں استعمار اور دشمنانِ اسلام نے تشکیل دیا تھا، دین وایمان کے رشتوں کی نسبت زیادہ مقدس ہو گئی ہیں حالانکہ یہ لوگ کتاب اللہ میں اس ارشادِ باری تعالیٰ کو بھی پڑھتے ہیں۔

لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَلَوْ کَانُوْٓا اٰبَآءَھُمْ اَوْ اَبْنَآءَھُمْ اَوْ اِخْوَانَھُمْ اَوْ عَشِیْرَتَھُمْ [1]

جو لوگ خدا پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، تم اُن کو خدا اور اُس کے رسُول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے خواہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی یا خاندان ہی کے لوگ ہوں۔

---

[1] سورۃ المجادلہ، آیت ۲۲

طوفان

حضرت نوحؑ کی قوم کے لوگ دل تو رکھتے تھے، لیکن اُن کے دل فہم و فراست سے خالی تھے اور پتھروں سے بھی زیادہ سخت، اسی طرح اُن کی آنکھیں بھی تھیں، مگر وہ ان سے حق کو دیکھنے کا کام نہیں لیتے تھے۔ اُمید تھی کہ اب جبکہ اُن کے نبی کی میدان دعوت و تبلیغ میں ایک عمر دراز بیت چکی ہے۔ شاید اُن کی عداوت میں کچھ کمی آجائے، مگر دن بدن اُن کی نفرت و عداوت میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا، ہلاکت سے قبل اُن کی تصویر اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم میں ان الفاظ میں کھینچی ہے:

قَالَ رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَهَارًا ۙ فَلَمۡ یَزِدۡهُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا ۙ وَ اِنِّیۡ كُلَّمَا دَعَوۡتُهُمۡ لِتَغۡفِرَ لَهُمۡ جَعَلُوۡۤا اَصَابِعَهُمۡ فِیۡۤ اٰذَانِهِمۡ وَ اسۡتَغۡشَوۡا ثِیَابَهُمۡ وَ اَصَرُّوۡا وَ اسۡتَكۡبَرُوا اسۡتِكۡبَارًا ۚ [1]	جب لوگوں نے نہ مانا تو (نوح نے) خدا سے عرض کی کہ پروردگار میں اپنی قوم کو رات دن بلاتا رہا، لیکن میرے بلانے سے وہ اور زیادہ گریز کرتے رہے، جب بھی میں نے ان کو بلایا کہ (توبہ کریں اور) تو اُن کو معاف فرمائے تو انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں دے لیں اور کپڑے اوڑھ لیے اور اڑ گئے اور اکڑ بیٹھے۔

استاذ سید قطب رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ ان آیات میں یہ تصویر پیش کی گئی ہے کہ ایک داعی کو اپنی دعوت پر کس قدر اصرار ہے اور وہ فرصت کے ہر لمحہ سے فائدہ اٹھا کر لوگوں تک اپنی بات پہنچا دینے کے لیے کس قدر بیقرار ہے، مگر ان کی قوم کے لوگ اپنی گمراہی پر اصرار کر رہے ہیں۔ اس تصویر سے بشریت کے بچگانہ اور معاندانہ جذبات بھی نمایاں

[1] سورۂ نوح، آیت ۵-۷

ہو رہے ہیں کہ لوگ کانوں میں اپنی انگلیاں ٹھونس رہے ہیں۔ سروں اور چہروں کو کپڑوں سے ڈھانپ رہے ہیں۔ ان الفاظ و کلمات سے جو تصویر بنتی ہے، وہ ایک مکمل بچگانہ عناد کی تصویر لگتی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ

وَجَعَلُوْٓا اَصَابِعَهُمْ	اور انہوں نے اپنے کانوں میں انگلیاں
فِيْٓ اٰذَانِهِمْ	دے لیں۔

سے معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے کانوں میں اس قدر گنجائش تو نہیں کہ ان میں ساری انگلیاں مکمل طور پر جا سکیں، لہٰذا وہ انگلیوں کے کناروں سے اپنے کانوں کو بند کر رہے ہیں اور نہایت سختی اور شدت کے ساتھ بند کر رہے ہیں، گویا اُن کی کوشش یہ ہے کہ انگلیاں مکمل طور پر کانوں میں گھس جائیں تاکہ نبی کی آواز قطعاً داخل نہ ہو سکے۔ اصرار اور عناد کی ایک نہایت بھیانک تصویر ہے جیسا کہ ایک دوسرے رُخ سے بڑے لوگوں کی یہ ایک ابتدائی تصویر بھی ہے[1]

نوح علیہ السلام کی قوم انتہا کو پہنچ گئی اور انہوں نے اس عذاب کی جلد آمد کا مطالبہ شروع کر دیا جس سے حضرت نوح علیہ السلام ڈرایا کرتے تھے، بلکہ جن دنوں حضرتِ نوحؑ کشتی بنا رہے تھے، تو وہ آپ سے مذاق کرتے اور کہتے کہ آپ تو نبی تھے، مگر اب بڑھئی بن گئے ہیں۔ اس مذاق اور جلد عذاب کے مطالبہ کا پس منظر درحقیقت ان کا اعتقاد یہ تھا کہ آپ سچے نبی نہیں ہیں، لہٰذا انہیں قطعاً کسی قسم کے عذاب کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، چنانچہ عذاب کا مطالبہ کرتے ہوئے انہوں نے جو کہا، اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا	انہوں نے کہا کہ نوح تم نے ہم سے جھگڑا تو
فَاَكْثَرْتَ جِدَالَنَا	کیا اور جھگڑا بھی بہت کیا، لیکن اگر
فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ	سچے ہو تو جس چیز سے ہمیں ڈراتے ہو وہ
كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ[2]	ہم پر لا نازل کرو۔

---

[1] فی ظلال القرآن، سید قطب، تفسیر سورۃ نوح [2] سورۃ ہود، آیت ۳۲

حضرت نوح علیہ السلام کے واضح اور روشن دلائل کے مقابلہ میں جب وہ عاجز و لاچار ہو گئے، تو انہوں نے آپ کو ڈرانا دھمکانا اور رجم و قتل کی دھمکیاں دینا شروع کیا اور کہا:

قَالُوا لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ[1] — انہوں نے کہا کہ اے نوح! اگر تم باز نہ آؤ گے، تو سنگسار کر دیئے جاؤ گے۔

عصر حاضر کے طاغوت بھی جب یہ محسوس کرتے ہیں کہ اسلامی جماعت طاقتور ہوتی اور اس کے مؤیدین کی تعداد زیادہ ہوتی جا رہی ہے تو وہ بھی اسی قسم کے اسلوب کو اختیار کرتے ہیں۔ دشمنانِ عدا ابتدا میں تو داعیوں کے ساتھ نرم برتاؤ کرتے ہیں، کیونکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ استبداد کے مخالف ہیں اور ایسے اسلام کی دعوت دے رہے ہیں جو اُن کی قیادت اور نفسانی خواہشات کا مخالف نہیں ہے، لیکن جب وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ حالات تو اُن کی مرضی کے موافق نہیں ہیں اور اسلامی جماعت تو اللہ تعالیٰ کے حکم کے بغیر اور کسی حکم کے سامنے سر جھکانے کے لیے تیار ہی نہیں —— تو وہ فوراً جنگلی درندوں اور ظالم سرکشوں کا رُوپ دھار لیتے ہیں اور حق کے علمبرداروں کے لیے خندقیں کھودتے، صلیبیں نصب کرتے اور اہلِ حق کو جیل کی کال کوٹھڑیوں میں دھکیلتے ہوئے نظر آتے ہیں، اور پھر اُن کے ساتھ وہ معاملہ کرتے ہیں جو جانوروں اور کتوں کے ساتھ بھی نہیں کیا جانا چاہیے۔ فضا کو کشیدہ اور مسموم کرنے کے لیے یہ اپنے تمام وسائل جھونک دیتے ہیں، عوام الناس کے سامنے مسلمانوں کی صورتیں مسخ کر کے اور ان کی کردار کشی کر کے پیش کرتے ہیں، ان حد درجہ نامساعد اور ناسازگار حالات میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب کی طرف رجوع کیا۔ قوم کی طرف سے پیش آنے والے آلام و مصائب کا شکوہ کیا اور فتح و نصرت کی دُعا مانگی۔

قَالَ رَبِّ انْصُرْنِيْ بِمَا كَذَّبُوْنِ[2] — پروردگار انہوں نے مجھے جھٹلایا ہے تو میری مدد کر

---

[1] سورۃ الشعراء، آیت ۱۱۶ [2] سورۃ المومنون، آیت ۲۶

فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّیْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ [1]

تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دُعا کی کہ (بارالہٰا) میں (ان کے مقابلے میں) کمزور ہوں تو (اُن سے) بدلہ لے۔

ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی توفیق و عنایت حضرت نوح علیہ السلام کے شاملِ حال نہ ہوتی قدم بوسی نہ کرتی تو وہ واقعی کمزور تھے ——— اور اپنے مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ بے حد و حساب لوگوں کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے، اس کے ساتھ ساتھ حضرت نوحؑ کے اپنے اختیار میں کچھ نہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو سختی سے اس بات سے منع کر دیا تھا کہ وہ کسی ایسی چیز کی بابت سوال نہ کریں جس کا انہیں علم ہی نہ ہو۔ ان حالات میں آپ کے لیے اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ اپنے غم و حزن کی بارگاہِ الٰہی میں شکایت کرتے اور صرف اسی سے مشکلات کا حل چاہتے، جہاں تک قومِ نوح کی طرف دعوت و تبلیغ کا تعلق تھا، اس سلسلہ میں فیصلہ کن بات یہ کہہ دی گئی:

وَاُوْحِیَ اِلٰی نُوْحٍ اَنَّهٗ لَنْ یُّؤْمِنَ مِنْ قَوْمِكَ اِلَّا مَنْ قَدْ اٰمَنَ فَلَا تَبْتَىِٕسْ بِمَا كَانُوْا یَفْعَلُوْنَ [2]

اور نوح کی طرف وحی کی گئی کہ تمہاری قوم میں جو لوگ ایمان لا چکے۔ اُن کے سوا اور کوئی ایمان نہیں لائے گا، تو جو کام یہ کر رہے ہیں؛ اُن کی وجہ سے غم نہ کھاؤ۔

نوح علیہ السلام کی قوم میں سے صرف چند لوگ ہی ایمان لائے تھے۔ باقی لوگوں پر کسی قسم کی نصیحت کوئی اثر نہ کر رہی تھی، لہٰذا ہلاکت و بربادی ان کی منتظر اور اللہ تعالیٰ کا غضب ٹوٹنا چاہتا تھا۔ نوح علیہ السلام نے بھی ان کے لیے دُعا کی کہ یہ تباہ و برباد ہو جائیں اور ان میں سے ایک نفس بھی رُوئے زمین پر باقی نہ رہے۔ نوح علیہ السلام کی دُعا کے الفاظ یہ تھے:

---

[1] سورۃ القمر، آیت ۱۰ [2] سورۃ ہود، آیت ۳۶

وَقَالَ نُوحٌ رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْأَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِينَ دَيَّارًا ۝ إِنَّكَ إِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوا إِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا ۝ رَبِّ اغْفِرْ لِي وَلِوَالِدَيَّ وَلِمَنْ دَخَلَ بَيْتِيَ مُؤْمِنًا وَّلِلْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَلَا تَزِدِ الظّٰلِمِينَ إِلَّا تَبَارًا ۝[1]

اور (پھر) نوح نے (یہ) دُعا کی کہ میرے پروردگار کسی کافر کو رُوئے زمین پر بستا نہ رہنے دے، اگر تو ان کو رہنے دے گا تو تیرے بندوں کو گمراہ کریں گے اور ان سے جو اولاد ہوگی وہ بھی بدکار اور ناشکر گزار ہوگی۔ اے میرے پروردگار مجھ کو اور میرے ماں باپ کو اور جو ایمان لا کر میرے گھر میں آئے، اُس کو اور تمام ایمان والے مردوں اور ایمان والی عورتوں کو معاف فرما اور ظالم لوگوں کے لیے اور زیادہ تباہی بڑھا۔

حضرت نوح علیہ السلام نے جب کشتی کو مکمل طور پر بنا لیا اور ہر قسم کے جوڑے جوڑے کو سوار کرا لیا تو مومن اپنے نبی کے گرد و پیش بیٹھ گئے اور کشتی نے اللہ تعالیٰ کے نام سے چلنا شروع کر دیا۔ اُدھر اللہ تعالیٰ نے اس قدر زبردست موسلا دھار بارش شروع کر دی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ چھاجوں مینہ برس رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے زمین کو حکم دیا تو اُس نے بھی اپنے تمام دہانوں کا مُنہ کھول دیا۔[2] ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ فَكَذَّبُوا عَبْدَنَا وَقَالُوا مَجْنُونٌ وَّازْدُجِرَ ۝ فَدَعَا رَبَّهٗ أَنِّي مَغْلُوبٌ فَانْتَصِرْ ۝ فَفَتَحْنَا أَبْوَابَ

ان سے پہلے نوح کی قوم نے بھی تکذیب کی تھی، تو انہوں نے ہمارے بندے کو جھٹلایا اور کہا کہ دیوانہ ہے اور انہیں ڈانٹا بھی تو انہوں نے اپنے پروردگار سے دُعا کی کہ (بارِ الٰہا) میں ان کے مقابلے میں، کمزور ہوں

---

[1] سورۃ نوح آیت ۲۶—۲۸ [2] البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر ۱/۱۱۲

السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝ وَّ فَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ ۝ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ ۝ تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ۝ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَ نُذُرِ ۝ [1]

تو (اُن سے) بدلہ لے۔ پس ہم نے زور کے مینہ سے آسمان کے دہانے کھول دیئے اور زمین سے چشمے جاری کر دیئے، تو پانی ایک کام کے لیے جو مقدر ہو چکا تھا جمع ہو گیا اور ہم نے نوح کو ایک کشتی پر جو تختوں اور میخوں سے تیار کی گئی تھی، سوار کر لیا۔ وہ ہماری آنکھوں کے سامنے چلتی تھی (یہ سب کچھ) اس شخص کے انتقام کے لیے کیا گیا جس کو کافر مانتے نہ تھے اور ہم نے اُس کو ایک عبرت بنا چھوڑا تو کوئی ہے کہ سوچے سمجھے؟ سو (دیکھ لو کہ) میرا عذاب اور ڈرانا کیسا ہوا؟

تھوڑے سے ہی وقت میں اللہ تعالیٰ نے تمام کافروں کو ہلاک کر دیا اور مومنوں کو نجات بخش دی اور زمین کو حکم دے دیا کہ وہ پانی کو نگل لے اور آسمان کو حکم دے دیا کہ وہ اب بارش سے رُک جائے۔

وَقِيْلَ يٰٓاَرْضُ ابْلَعِىْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِىْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِىَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِىِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝ [2]

اور حکم دیا گیا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا، اور اے آسمان تھم جا تو پانی خشک ہو گیا اور کام تمام کر دیا گیا اور کشتی کوہِ جودی پر جا ٹھہری اور کہہ دیا گیا کہ بے انصاف لوگوں پر لعنت!

---

[1] سورۃ القمر، آیت ۹ - ۱۶

[2] سورۃ ہود، آیت ۴۴

کس قدر دہشت ناک، ہولناک اور خوفناک ہے یہ منظر! آسمان کی بلندیوں سے موسلا دھار بارش برس رہی ہے۔ زمین نے اپنے تمام چشموں کے دہانے کھول دیئے ہیں، جس کے باعث ساری زمین تلاطم خیز موجوں پر مشتمل سمندر میں تبدیل ہوگئی ہے۔ موجیں اس قدر بڑی بڑی ہیں کہ نیچے پہاڑ چھپ گئے اور اوپر سورج اور ستارے نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ اب چشمِ تصور سے ذرا کشتی کا وہ منظر دیکھئے جس کی عکاسی قرآن کریم نے کی ہے

ان ہولناک مناظر پر ایک اور نگاہ ڈالیے اور پھر اسے ایک بار اور پڑھیے جیسے قرآنِ حکیم نے بیان فرمایا ہے اور ملاحظہ فرمائیے کہ عبارت میں کس قدر اختصار، مگر تاثیر کس قدر بلاغت کی حامل ہے۔" اس طوفان کے باعث دنیا کا نقشہ کچھ اس طرح ہو گیا تھا کہ گویا کچھ تھا ہی نہیں ۔"[1]

اللہ تعالیٰ نے ان ظالموں کی ہلاکت کا فیصلہ اس لیے فرمایا کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تھی، ظلم کا ارتکاب کیا، توبہ اور رجوع الی اللہ سے انکار کر دیا، تو اُن کے اور اُن کے باپوں اور بھائیوں کے درمیان طوفان کی تند و تیز موجیں حائل ہوگئیں اور زندۂ جاوید عقیدہ کی رشتہ داریوں کے سامنے فانی حسب و نسب کی رشتہ داریوں کی عمارتیں دھڑام سے گر گئیں۔

ساڑھے نو سو برس کے دورِ ابتلا کا خاتمہ ہو گیا۔ جابر اور سرکش لوگوں کے تخت خاک میں مل گئے، کفر اور فتنہ و فساد کے تمام ستون ایک ایک کر کے پیوندِ خاک ہو گئے اور یہ سب کچھ آناً فاناً چند لمحوں میں ہو گیا۔

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ؟

---

[1] تفسیر المنار، رشید رضا ۱۲/۸۰

پند و نصائح

حضرت نوح علیہ السلام کی سیرت کی روشنی میں

ا- حضرت نوح علیہ السلام جنہیں اللہ جل شانہ نے فتح و نصرت سے نوازا- وہ امورِ دعوت سے آشنا اور مدعوین کے حالات سے آگاہ تھے، لہٰذا آپ نے علی وجہ البصیرت دعوت الی اللہ کا فریضہ سر انجام دیا-

● آپ حلیم، کشادہ سینے کے مالک اور اپنی قوم سے بڑی محبت رکھتے تھے- کینہ کی آپ کے سینہ مبارک تک قطعاً رسائی نہ تھی، اس بات کی بھی پرواہ نہ تھی کہ لوگ مذاق اڑاتے ہیں، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ پر سچا ایمان رکھتے اور اس کے پکے فرماں بردار تھے-

● آپ نے اپنی زندگی کو دعوت و تبلیغ کے لیے وقف کر رکھا تھا- آپ کے دن اور راتیں، صبحیں اور شامیں اسی مقدس مشن کی تکمیل میں بسر ہو رہی تھیں اور پھر اس سلسلہ میں آپ کو نہ تو کسی اجرت کی خواہش تھی، نہ کسی مالِ غنیمت کا انتظار تھا اور نہ کسی جاہ و منصب کا لالچ تھا-

■ جن لوگوں نے آپ کی دعوت پر لبیک کہا، وہی آپ کے اہل و عیال، خویش و اقارب اور اعزہ و احباب قرار پائے، اگرچہ ان کا آپ کے ساتھ نہ تو کوئی نسبی رشتہ تھا اور نہ کوئی دنیوی مصلحت ان میں قدر مشترک تھی۔ آپ کی دعوت پر لبیک نہ کہنے والوں کا آپ سے کوئی تعلق نہ تھا، خواہ وہ اہل و عیال ہی کیوں نہ تھے اور نسبی اعتبار سے عزیز اور قریب ترین ہی کیوں نہ تھے۔ آپ نے عرصہ دراز تک مشرکین کے آلام و مصائب پر صبر کیا، مگر کفار و مشرکین نے جب تمام حدود و قیود کو پامال کرنے کے سلسلہ میں کوئی دقیقہ بھی فروگزاشت نہیں کیا تو آپ کے مضطرب اور بے چین دل کی بے قراریوں نے اس بددعا کی صورت اختیار کر لی کہ اے اللہ! اب ان کے کسی گھر کو بھی باقی نہ رہنے دے اور ایک ایک کو صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دے۔

دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں پر فرض ہے کہ وہ علم، صبر اور دین کی بے لوث خدمت کے سلسلہ میں حضرت نوح علیہ السلام کے اُسوۂ و نمونہ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں اور اس حقیقت کو کبھی بھی فراموش نہ کریں کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتے، جب تک وہ خود تبدیلی کے لیے سرگرمِ عمل نہ ہو۔

۲۔ حضرت نوح علیہ السلام دعوت الی اللہ کے کام میں ضرب المثل انہماک و اشتیاق کے ساتھ ساتھ حد درجہ واصل باللہ تھے، بکثرت اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع فرماتے رہتے، اس کی تفصیل کے خواہشمند ان آیات کو ایک بار پھر پڑھ لیں جن کا آغاز قَالَ نُوحٌ رَّبِّ... سے ہوتا ہے اسی تعلق مع اللہ کا نتیجہ تھا کہ اُس نے آپ کو عبدًا شکورًا کے لقب سے یاد فرمایا۔

حضرت نوح فقط اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ ہی سے فتح و نصرت کے اُمیدوار تھے۔ آپ نہ تو مشرک حلیفوں سے کوئی توقع رکھتے تھے اور نہ اپنی اور اپنے پیروکاروں کی مادی قوت پر کوئی فخر و غرور کرتے تھے۔ غیب پر آپ کا ایمان کس قدر پختہ تھا، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ

جب لوگ آپ سے مذاق کر رہے تھے اور آپ حد درجہ ضعف و قلت کا شکار تھے تو ان ناساز گار حالات میں بھی آپ پورے وثوق کے ساتھ فرماتے کہ آج تم ہم سے مذاق کر رہے ہو، مگر کل جب اللہ تعالیٰ کی فتح و نصرت ہمیں حاصل ہو گئی تو ہم تم سے مذاق کریں گے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندے اور رسول حضرت نوح علیہ السلام سے بہت ہی قریب تھا۔ آپ کے تمام اعمال کی نگہداشت فرماتا تھا، چنانچہ کشتی بنانے کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا — اور ایک کشتی ہمارے حکم سے ہمارے سو بر و بناؤ

اور کشتی جب موجوں میں پہاڑوں کی مانند چل رہی تھی، تو اس کے بارے میں فرمایا:

تَجْرِىْ بِاَعْيُنِنَا — کشتی ہمارے رُوبرو چل رہی تھی

یعنی کشتی ہماری حفاظت، نگہداشت اور ہمارے حکم سے چل رہی تھی۔ دُنیا بھر کے لشکر اپنے تمام ساز و سامان کو بروئے کار لا کر بھی ان چند مُٹھی بھر مومنوں پر غالب نہیں آسکتے، جن کی حفاظت و نگہداشت خود خدا فرما رہا ہو۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے ؎

واذا العناية لاحظتك عيونها — نم فالمخاوف كلهن امان

جب توفیق و عنایت شاملِ حال ہو تو بے فکر ہو کر سو جاؤ، کیونکہ پھر تمام خطرات بھی امن بن جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بہت سے مقامات پر یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ انہوں نے کس طرح حضرت نوح علیہ السلام کی دُعا کو شرف قبولیت سے نوازا۔

وَنُوْحًا اِذْ نَادٰى مِنْ قَبْلُ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ فَنَجَّيْنٰهُ — اور اس سے قبل جب نوح نے پکارا تو ہم نے اُس کی پکار کو سُنا اور اُسے نجات بخشی۔

وَلَقَدْ نَادٰنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ۝ — اور بے شک نوح نے ہمیں پکارا تو ہم پکار کو خوب سننے والے ہیں۔

ہم بھی اگر اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط و مستحکم کرلیں، اس کی طرف بکثرت التجا کریں اور صرف اور صرف اسی سے فتح و نصرت مانگیں تو وہ بھی ہماری ضرور مدد فرمائے گا، اور ہمارے دشمنوں کو اپنی نہایت سخت اور مضبوط گرفت میں لے لے گا، مگر افسوس کہ آج مسلمان امریکہ سے مدد مانگتے ہیں یا روس سے یا اپنے ان کافر حلیفوں سے جن سے انہوں نے عہد و پیمان باندھ رکھے ہیں یا پھر یہ اپنی منحرفانہ چالوں پر اعتماد کرتے ہیں اور اس کا نام سیاست رکھتے ہیں، حالانکہ بخدا! آج ہماری پریشانیوں اور مشکلات کا یہ حل نہیں ہے جسے ہم نے حل سمجھ رکھا ہے۔ یاد رکھیے اس امت کے آخری دور کی اصلاح بھی صرف اور صرف اسی چیز سے ممکن ہے جس سے امت کے ابتدائی دور کی اصلاح ہوئی تھی۔

۲۔ حضرت نوح علیہ السلام کے متبعین نہایت قلیل تعداد میں تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ ۙ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝ [1]	یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آپہنچا اور تنور جوش مارنے لگا، تو ہم نے (نوح علیہ السلام کو) حکم دیا کہ ہر قسم (کے جانداروں) میں سے جوڑا جوڑا (یعنی) دو دو جانور ایک نر اور ایک مادہ لے لو اور جس شخص کی نسبت حکم ہو چکا ہے (کہ ہلاک ہو جائے گا) اس کو چھوڑ کر اپنے گھر والوں کو اور جو ایمان لایا ہو کشتی میں سوار کرلو، اور ان کے ساتھ ایمان بہت ہی کم لوگ لائے تھے۔

اکثر انبیاء کرام کے پیروکاروں کی تعداد نہایت قلیل تھی، لیکن تعداد کی قلت کے باوجود اللہ تعالیٰ انہیں فتح و نصرت سے سرفراز فرماتا رہا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] سورۃ ہود، آیت ۴۰

كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً ۢ بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ؁

بسا اوقات تھوڑی سی جماعت نے اللہ کے حکم سے بڑی جماعت پر فتح حاصل کی اور اللہ استقلال رکھنے والوں کے ساتھ ہے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ فتح و نصرت، تعداد کی کثرت، پر موقوف ہے، مگر یہ خیال درست نہیں ہے، حتیٰ کہ جاہلی معاشروں میں بھی یہ معیار درست ثابت نہیں ہوا۔ ویت نام اور امریکہ کا معاملہ آپ کے سامنے ہے اور اسی طرح عربوں اور اسرائیل کا معاملہ بھی مخفی نہیں۔

جو لوگ اپنے لشکروں کے جمّ غفیر پر فخر کرتے ہیں، انہیں اُن پر ایک بار اور نگاہ ڈالنی چاہیے۔ یہ لشکر ہائے جرار ان کے لیے عبث ثابت ہوں گے۔ قطعاً ان کے معاون نہ ہوں گے اور انہیں یہ بات کبھی بھی فراموش نہ کرنی چاہیے کہ اگر مختلف اور منتشر ایمانی قوتیں یکجا ہو جائیں اور وہ اپنے مادی وسائل کے ساتھ ساتھ نصرتِ الٰہی کے اسباب کو اختیار کر لیں، تو یقیناً فتح و نصرت اُن کی قدم بوسی کرے گی۔

۴۔ ہر مصیبت کے بعد راحت ہوتی ہے، آزمائشیں اور ابتلاء بڑے بڑے ہوں تو اجر و ثواب بھی زیادہ ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کو جزائے عظیم سے نوازا، زمین کو کافروں اور مفسدوں سے پاک کر کے آپ کو سرفرازی عطا فرما دی اور رُوئے زمین پر موحد اور مومن لوگوں کے سوا اور کوئی بھی باقی نہ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کافر بیٹے کو لے کر صاحبِ ایمان اولاد عطا فرما دی اور یہ اللہ تعالیٰ کا آپ پر خاص فضل و کرم ہے کہ اب سارے اہلِ زمین آپ ہی کی اولاد ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ؔ سورۃ البقرۃ، آیت ۲۴۹

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ۝ اور اُن کی اولاد کو ایسا کیا کہ وُہی باقی رہ گئے[1]

امام احمدؒ نے حضرت سمرہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سام عربوں کے جدِ امجد، حام اہلِ حبشہ کے اور یافث رومیوں کے جدِ امجد ہیں[2]

جو لوگ اس بات سے غافل ہیں کہ اللہ تعالیٰ میدانِ دعوت و تبلیغ میں کام کرنے والوں کی آزمائش نہیں کرتا، وہ خطا کار ہیں اور اُن کی خطا کے دو سبب ہیں :

(۱) جس داعی کی اللہ تعالیٰ اس طرح آزمائش کرے کہ اس کا بیٹا یا بیوی ایمان نہ لائے یا وہ ان دونوں کو ایمان نہ لانے کے باعث ہلاک کر دے تو اس میں بھی داعی کے لیے خیر و برکت ہوتی ہے، وہ اپنے اہل و عیال کو سمجھانے کے لیے اپنی تمام تر طاقتیں بروئے کار لاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ پر اعتماد رکھتا ہے اور اُس کی رضا اور قضا و قدر پر راضی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید اور مایوس نہیں ہوتا بلکہ وہ ہر وقت حسبِ ذیل ارشادِ باری تعالیٰ کو پیشِ نظر رکھتا ہے :

فَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّ يَجْعَلَ اللّٰهُ فِيْهِ خَيْرًا كَثِيْرًا ۝ تو عجب نہیں کہ کسی چیز کو تم ناپسند کرو اور اللہ اس میں بہت سی بھلائی پیدا کر دے[3]

---

[1] سورۃ الصافات، آیت ۷۷

[2] اس حدیث کو امام احمدؒ نے مسند ۵/ ۱۰ میں روایت کیا ہے، اس کی سند متصل و رجال ثقہ ہیں، البتہ ایک راوی عبدالوہاب خفاف کے بارے میں کچھ کلام ہے جو مضر نہیں ــ صاحب الفتح الربانی ۲۰/ ۳۹ لکھتے ہیں کہ اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور حاکم نے صحیح کہا ہے ذہبی، عراقی اور سیوطی نے اسے حسن قرار دیا ہے۔

[3] سورۃ نساء، آیت ۱۹

اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹے کو جو ہلاکت میں ڈال دیا تو اس میں بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی بہت بہتری تھی۔

(۲) سُنّتِ الٰہی یہ ہے کہ ابتلاء و آزمائش اور صبر کے بعد ہی فتح و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجَاهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصَّابِرِيْنَ ۝[۱]

اور ہم تم لوگوں کو آزمائیں گے تاکہ جو تم میں لڑائی کرنے والے اور ثابت قدم رہنے والے ہیں، ان کو معلوم کریں۔

اضداد سے اشیاء میں تمیز ہوتی ہے۔ خبیث کو اللہ تعالیٰ پاک سے الگ کر دیتے ہیں

---

[۱] سورۃ محمد، آیت ۳۱

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام

- سیدنا حضرت نوحؑ سے حضرت ابراہیمؑ تک
- حیات حضرت ابراہیمؑ کی ایک جھلک
- حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے باپ آذر کے مابین کشیدگی
- نمرود کے ساتھ مناظرہ
- بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق
- ہمارے دور کے سرکش

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝

سورۃ مریم ۴۱

کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو' بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔

حضرت نوح علیہ السلام سے حضرت ابراہیم علیہ السلام تک

ہمیں نہیں معلوم کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد پھر شرک کا آغاز کیسے ہوا، البتہ قرآن کریم کے مطالعہ سے ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ قوم نوح کے بعد اللہ تعالیٰ نے قوم عاد کو آباد کیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ہود علیہ السلام کی زبانی یہ فرمایا ہے۔

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِى الْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَاذْكُرُوْٓا اٰلَآءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝[1]

اور یاد تو کرو جب اُس نے تم کو قوم نوح کے بعد سردار بنایا اور تم کو پھیلاؤ زیادہ دیا۔ پس اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو یاد کرو تاکہ نجات حاصل کرو۔

قبیلہ عاد[2] یمن و عمان کے مابین مقام احقاف میں سکونت پذیر تھا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں بے حد و حساب نعمتوں اور نوازشوں سے سرفراز فرما رکھا تھا۔ انہوں نے چشمے جاری کیے زمینوں کو زراعت کے قابل بنایا، عمدہ عمدہ اور عالی شان محلات تعمیر کیے۔ ان سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں جسمانی طور پر بڑی قوت و توانائی سے نواز رکھا تھا، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا، بلکہ اپنے ہاتھوں خود بت تراشے اور پھر شدائد و مشکلات میں انہی سے مدد مانگنے لگ گئے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف حضرت ہود علیہ السلام کو مبعوث بنا کر بھیجا، جو کہ نسب کے اعتبار سے بہت بلند، اخلاق کے اعتبار سے نہایت عمدہ اور عقل کے اعتبار

---

[1] سورۃ اعراف: آیت ۶۹ [2] عاد عاربہ یا بائدہ عرب قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور سام بن نوح کی اولاد میں سے تھے، انہیں عاد اولیٰ اور عادِ ارم ذات العماد کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا ہے۔ عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد اور عرب مستعربہ کے نام سے موسوم ہیں۔ البدایۃ والنہایۃ ۱/۱۲۰

سے سب سے اعلیٰ تھے آپ نے انہیں دعوت دی کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کو اختیار کریں اور بتوں کی پرستش کو ترک کریں، کیونکہ بتوں سے تراشے ہوئے یہ پتھر کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ [1]	اور قوم عاد کی طرف اُن کے بھائی ہود کو بھیجا، انہوں نے کہا کہ میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، کیا تم ڈرتے نہیں؟
وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ؕ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا مُفْتَرُوْنَ ۝ [2]	اور ہم نے عاد کی طرف اُن کے بھائی ہُود کو بھیجا، انہوں نے کہا کہ میری قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تم شرک کر کے خدا پر) محض بہتان باندھتے ہو۔

مگر آپ کی قوم کے سرداروں نے آپ سے نہایت بدترین سلوک کیا اور آپ پر انہوں نے طرح طرح کے الزامات لگائے۔ فرمانِ باری تعالیٰ ہے:

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّ اِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ [3]	تو اُن کی قوم کے سردار جو کافر تھے کہنے لگے کہ تم ہمیں احمق نظر آتے ہو اور ہم تمہیں جھوٹا خیال کرتے ہیں۔
قَالُوْا يٰهُوْدُ مَا جِئْتَنَا بِبَيِّنَةٍ وَّمَا نَحْنُ بِتَارِكِيْۤ اٰلِهَتِنَا عَنْ قَوْلِكَ وَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنْ نَّقُوْلُ اِلَّا اعْتَرٰىكَ بَعْضُ	وہ بولے ہود تم ہمارے پاس کوئی دلیل ظاہر نہیں لائے اور ہم (صرف) تمہارے کہنے سے نہ اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں اور نہ تم پر ایمان لانے والے ہیں۔ ہم تو یہ سمجھتے ہیں

[1] سورۃ الاعراف، آیت ۶۵ [2] سورۃ ہُود، آیت ۵۰ [3] سورۃ الاعراف ۶۶

اٰلِھَتِنَا بِسُوْٓءٍ ؕ[1] — کہ ہمارے کسی معبود نے تمہیں آسیب پہنچا (کر دیوانہ کر) دیا ہے۔

جب قوم عاد کی طغیانی حد سے بڑھ گئی اور انہیں کسی تذکیر یا انذار نے کوئی فائدہ نہ پہنچایا تو اللہ تعالیٰ نے بادِ صرصر کو بھیج کر انہیں تباہ و برباد کر دیا اور انہیں ان لوگوں کے لیے باعثِ عبرت بنا دیا جو دل (آگاہ) رکھتے ہیں یا دل سے متوجہ ہو کر سنتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَمَّا عَادٌ فَاُھْلِکُوْا بِرِیْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِیَۃٍ ۙ سَخَّرَھَا عَلَیْھِمْ سَبْعَ لَیَالٍ وَّثَمٰنِیَۃَ اَیَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَی الْقَوْمَ فِیْھَا صَرْعٰی ۙ کَاَنَّھُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِیَۃٍ ۚ فَھَلْ تَرٰی لَھُمْ مِّنْۢ بَاقِیَۃٍ ۝[2]

رہے عاد، اُن کا نہایت تیز آندھی سے ستیاناس کر دیا گیا، اللہ نے اس کو سات رات اور آٹھ دن اُن پر چلائے رکھا تو (اے مخاطب) تو لوگوں کو اس میں (اس طرح) ڈھتے (اور مرے) پڑے دیکھے، جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے۔ بھلا تو ان میں سے کسی کو بھی باقی دیکھتا ہے۔

ان لوگوں کی حماقت اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی کہ عذاب کے بادل کو دیکھ کر بے محابا مسرت کا اظہار کرنے لگے اور کہنے لگے کہ کئی سال تک چونکہ بارش بند رہی ہے، لہٰذا یہ بادل خوب برسے گا۔ لیکن بادل سیاہ اور گھٹا ٹوپ اندھیروں کی صورت میں ان کے سروں پر چھا گیا تو پھر یہ لوگ گھبرا گئے اور جب نہایت تند و تیز آندھی بلکہ طوفان آگیا، تو ان کی گھبراہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا رَاَوْہُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِیَتِھِمْ ۙ قَالُوْا ھٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ؕ بَلْ ھُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ

پھر جب انہوں نے اس (عذاب) کو دیکھا کہ بادل کی صورت میں ان کے میدانوں کی طرف آ رہا ہے تو کہنے لگے کہ یہ تو بادل ہے جو ہم پر برس کر

---

[1] سورۃ ہود، آیت ۵۴ [2] سورۃ الحاقۃ، آیت ۶-۸

بِهٖ رِیْحٌ فِیْھَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۙ تُدَمِّرُ کُلَّ شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّھَا فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰٓی اِلَّا مَسٰکِنُھُمْ ۭ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ ۝ [1]

رہے گا (نہیں) بلکہ یہ (وہ) چیز ہے جس کے لیے تم جلدی کرتے تھے، یعنی آندھی جس میں درد دینے والا عذاب بھرا ہوا ہے۔ ہر چیز کو اپنے رب کے حکم سے تباہ کیے دیتی ہے، تو وہ ایسے ہو گئے کہ ان کے گھروں کے سوا کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ گناہگار لوگوں کو ہم اس طرح سزا دیا کرتے ہیں۔

ام المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اس طرح زور سے ہنستے ہوئے نہیں دیکھا کہ جس سے آپ کا حلق مبارک نظر آنے لگتا ہو، آپ تبسم فرمایا کرتے تھے۔ آپ جب آندھی یا بادل دیکھتے، تو آپ کے چہرۂ اقدس کا رنگ بدل جاتا۔ میں نے عرض کیا اے اللہ کے رسول! جب بادل آتا ہے تو لوگ اس اُمید پر خوش ہوتے ہیں کہ شاید اس میں بارش ہوگی، مگر آپ کے چہرۂ اقدس پر ناگواری کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں۔ فرمایا: اے عائشہؓ! اس بات سے بے خوف ہونے کی کیا دلیل کہ اس میں کہیں عذاب ہی نہ ہو، سابقہ اقوام میں سے ایک قوم پر تند و تیز آندھی کا عذاب آیا تھا۔ اس قوم نے بھی عذاب کو دیکھ کر کہا تھا، ھٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا یہ تو بادل ہے جو ہم پر برس کر رہے گا۔[2]

صحیح مسلم میں ہے کہ جب آندھی چلتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یہ دُعا پڑھتے تھے:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ خَیْرَھَا وَخَیْرَ مَا فِیْھَا وَخَیْرَ مَآ اُرْسِلَتْ بِہٖ،

اے اللہ! میں تجھ سے اس کی بھلائی اور جو کچھ اس میں ہے اُس کی بھلائی اور جس حکم کے ساتھ اُسے بھیجا گیا ہے، اس کی بھلائی کا تجھ سے

---

[1] سورۃ الاحقاف، آیت ۲۴ [2] صحیح بخاری، فتح الباری ۱۰/ ۱۹۹

وَاَعُوْذُبِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا اُرْسِلَتْ بِهٖ۔

سوال کرتا ہوں اور اُس کی بُرائی اور جو کچھ اس میں ہے اُس کی بُرائی اور جس حکم کے ساتھ اسے بھیجا گیا ہے، اُس کی بُرائی سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

اور جب آسمان پر بادل چھا جاتے، تو آپؐ کے چہرۂ اقدس کا رنگ بدل جاتا، کبھی آپؐ باہر تشریف لاتے اور کبھی اندر تشریف لے جاتے، کبھی سامنے آتے اور کبھی پیچھے تشریف لے جاتے، جب بارش شروع ہو جاتی، تو آپؐ کی یہ کیفیت ختم ہو جاتی۔

اللہ تعالیٰ نے حضرتِ ہُود علیہ السلام اور آپؑ کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دے دی اور آپ کے ساتھ بہت ہی کم لوگ ایمان لائے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا نَجَّیْنَا هُوْدًا وَّالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّاۚ وَنَجَّیْنٰهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِیْظٍ۝[1]

اور جب ہمارا حکم (عذاب) آ پہنچا، تو ہم نے ہُود کو اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، اُن کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور انہیں عذاب شدید سے نجات دی۔

سُبحان اللہ! کس قدر قدرتوں اور حکمتوں والی ہے وہ ذاتِ اقدس کہ جس نے چند لوگوں کو عذابِ شدید سے بچا لیا تھا، جبکہ ان کی کافر قوم کے سب لوگ عذابِ شدید میں مبتلا ہو گئے تھے، اور یہ چند ایمان دار بھی انہی میں رہ رہے تھے۔ سچا پکا مسلمان یہ سوال کبھی نہیں کرتا کہ ایسا کیونکر ممکن ہوا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ آسمانوں اور زمینوں کی کوئی چیز اللہ تعالیٰ کو کسی کام سے عاجز و قاصر نہیں کر سکتی۔

قومِ عاد اللہ تعالیٰ، فرشتوں اور سب لوگوں کی لعنت کی مستحق قرار پائی، کیونکہ انہوں نے اپنے رب کے ساتھ کفر کیا، اس کی آیات کا انکار کیا، اُس کے رسول کی نافرمانی کی اور ہر

---

[1] سورۃ ہود، آیت ۵۸

جابر اور ظالم کے حکم کی اطاعت کو اپنا شعار بنالیا تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَتِلْكَ عَادٌ جَحَدُوا	یہ (وہی) عاد ہیں، جنہوں نے خدا تعالیٰ
بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ	کی نشانیوں سے انکار کیا اور اس کے پیغمبروں
وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ	کی نافرمانی کی اور ہر سرکش و متکبر کا کہا مانا۔
وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا	تو اس دنیا میں بھی لعنت ان کے پیچھے لگی رہی
لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا	اور قیامت کے دن بھی لگی رہے گی) دیکھو
إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ	عاد نے اپنے پروردگار سے کفر کیا (اور)
أَلَا بُعْدًا لِعَادٍ قَوْمِ هُودٍ [1]	سن رکھو ہود کی قوم عاد پر پھٹکار ہے

یہاں وَعَصَوْا رُسُلَهُ (اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی) کا جملہ قابلِ غور ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے صرف ایک پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کی نافرمانی کی، مگر یہاں یہ کہا گیا ہے کہ انہوں نے سب پیغمبروں کی نافرمانی کی، یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس کے ایک پیغمبر کی نافرمانی گویا جملہ انبیاء کرام کی نافرمانی ہے، کیونکہ ہر عہد اور ہر عصر میں تمام انبیاء کرام کی دعوت ایک رہی ہے اور ان سب کا مشن بھی ایک ہی تھا۔ سو انبیاء کرام کی نافرمانی کے باعث حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد پر پھٹکار ہے۔

---

[1] سورۂ ہود، آیت ۵۹-۶۰

حضرت صالح علیہ السلام

ثمود ایک مشہور عربی قبیلہ ہے جو کہ اپنے جدِ امجد ثمود بن عامر کے نام سے موسوم تھا۔ ثمود کا تعلق سام بن نوح کی نسل سے تھا۔ یہ قبیلہ حجاز و شام کے مابین سرزمین حجر میں سکونت پذیر تھا۔ قرآن کریم میں اس کا ذکر قومِ عاد کے بعد آیا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ عَادٍ وَّ بَوَّاَكُمْ فِی الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا [1]	اور یاد تو کرو، جب اُس نے تم کو قومِ عاد کے بعد سردار بنایا اور زمین پر آباد کیا کہ نرم زمین سے (مٹی لے لے کر) محل تعمیر کرتے ہو۔

قومِ ثمود کی زمین بڑی سرسبز و شاداب اور باغات اور چشموں پر مشتمل تھی۔ اُن کے گھر بہترین بنگلوں اور خوشنما محلات پر مبنی تھے۔ زمین کی سیادت و قیادت کا تاج قومِ ثمود کے سر پر تھا، لیکن انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا شکر ادا نہ کیا، بلکہ حق سے دُور ہوتے گئے اور روز بروز فتنہ و فساد کی آگ بھڑکاتے رہے اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے آستانہ اقدس کو چھوڑ کر انہوں نے بُت پرستی شروع کر دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کی ہدایت کے لیے ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو ان کی طرف مبعوث فرمایا۔ آپ نے اُن کو بُتوں کی پوجا سے منع فرمایا اور اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کی عبادت کی دعوت دی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

---

[1] سورۃ الاعراف، آیت ۷۴

وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَیْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاسْتَعْمَرَكُمْ فِیْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَیْهِ ؕ اِنَّ رَبِّیْ قَرِیْبٌ مُّجِیْبٌ ۝ [1]

اور ثمود کی طرف ان کے بھائی صالح کو (بھیجا) تو انہوں نے کہا کہ قوم! اللہ ہی کی عبادت کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، اُس نے تم کو زمین سے پیدا کیا اور اُس میں آباد کیا تو اُس سے مغفرت مانگو اور اُس کے آگے توبہ کرو، بے شک میرا پروردگار نزدیک (بھی) ہے اور دُعا کا قبول کرنے والا (بھی) ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًا اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ فَاِذَا هُمْ فَرِیْقٰنِ یَخْتَصِمُوْنَ ۝ [2]

اور ہم نے ثمود کی طرف اُن کے بھائی صالح کو بھیجا کہ اللہ کی عبادت کرو، تو وہ دو فریق ہو کر آپس میں جھگڑنے لگے۔

قومِ ثمود کے سرداروں کی عادت اسی طرح تھی، جس طرح ہر عصر اور ہر شہر کے سرداروں کی عادت ہوتی ہے، یعنی انہوں نے اپنے نبی کی تکذیب کی اور اس بات پر بڑے اچنبھے کا اظہار کیا کہ حضرت صالح علیہ السلام انہیں ان بتوں کی پرستش سے کیوں منع کرتے ہیں، جن کی پرستش انہیں اپنے آباؤ اجداد سے وراثت میں ملی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قَالُوْا یٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِیْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ اَنْ نَّعْبُدَ مَا یَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِیْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَیْهِ مُرِیْبٍ ۝ [3]

انہوں نے کہا کہ صالح (علیہ السلام) اس سے پہلے ہم تم سے (کئی طرح کی) اُمیدیں رکھتے تھے، (اب وہ منقطع ہو گئیں) کیا تم ہم کو ان چیزوں سے منع کرتے ہو، جن کو ہمارے بزرگ پوجتے چلے آئے ہیں اور جس بات کی طرف تم ہمیں بُلاتے ہو اس میں ہمیں قوی شبہ ہے۔

---

[1] سورۃ ہود، آیت ۶۱ [2] سورۃ النمل، آیت ۴۵ [3] سورۃ ہود، آیت ۶۲

قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مِنَ الْمُسَحَّرِيْنَ ۚ مَآ اَنْتَ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا ۖ فَاْتِ بِاٰيَةٍ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ ¹

وہ کہنے لگے کہ تم تو جادو زدہ ہو، تم اور کچھ نہیں، ہماری ہی طرح کے آدمی ہو، اگر سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو۔

ہدایت اور نبوت سے قبل انہوں نے حضرت صالح علیہ السلام سے بہت سی اُمیدیں لگا رکھی تھیں، لیکن جب اللہ تعالیٰ نے انہیں حکمت و نبوت سے سرفراز فرما دیا تو وہ ان پر کذب کی تہمتیں تراشنے لگ گئے۔ یہ وہ ٹیکس ہے جسے حضرات انبیاء کرام اور اُن کے متبعین کو ادا کرنا پڑتا ہے، چنانچہ ہم آج تک بندگانِ طاغوت سے اس قبیل کی ناشائستہ باتیں سنتے چلے آتے ہیں۔ سرداروں کی کوشش تھی کہ وہ آپ کو لوگوں کے سامنے عاجز کر دیں، لہٰذا انہوں نے مطالبہ پیش کر دیا کہ آپ لوگوں کو کوئی ایسی نشانی دکھائیں جو آپ کی رسالت کی صداقت کی دلیل ہو تو آپ نے فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی اونٹنی ہے۔ ایک دن یہ پانی پیے گی اور ایک دن تم اپنے جانوروں کو پانی پلاؤ گے، لیکن خبردار اسے کوئی تکلیف نہ پہنچانا، اسے جس طرح یہ چاہے اللہ کی زمین سے کھانے پینے دینا اور یاد رکھو کہ اگر تم نے اس کے راستے میں روڑے اٹکائے، تو اللہ تعالیٰ تمہیں نہایت دردناک عذاب میں مبتلا کر دے گا لیکن انہوں نے آپ کی بات کا مذاق اڑایا اور اُونٹنی کے پاؤں کاٹ دیئے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوْا يٰصٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۝ ²

آخر انہوں نے اونٹنی (کی کونچوں) کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی اور کہنے لگے صالح (علیہ السلام) جس چیز سے تم ہمیں ڈراتے تھے۔ اگر تم (خدا کے) پیغمبر ہو تو اُسے ہم پر لے آؤ۔

---

¹ سورۃ الشعراء، آیت ۱۵۳-۱۵۴ ² سورۃ الاعراف، آیت ۷۷

ان میں سے ایک بدبخت شخص نے اونٹنی کے پاؤں کاٹے تھے، مگر یہاں اللہ تعالیٰ نے جمع کا صیغہ فَعَقَرُوا النَّاقَةَ استعمال کیا ہے اور ہلاکت و بربادی بھی ان سب لوگوں کا مقدر بنی، کیونکہ یہ سب لوگ اس بدبخت کے اس فعلِ بد پر خوش تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے:

يَٰصَٰلِحُ ائْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ ○	صالح جس چیز سے تم ڈراتے تھے، اگر تم (خدا کے) پیغمبر ہو تو ہم پر لے آؤ۔

اس سے قبل قومِ نوح نے بھی اپنے نبی سے اسی قسم کا مطالبہ کیا تھا جس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء کرام کے مقابلہ میں کافروں اور مشرکوں کا موقف ایک جیسا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ بھی قوم ثمود کے لیے گھات لگائے ہوتے تھا، چنانچہ ایک زبردست چیخ نے اُن کا کام تمام کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا صَٰلِحًا وَالَّذِينَ ءَامَنُوا مَعَهُۥ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَمِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيزُ ○ وَأَخَذَ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَٰرِهِمْ جَٰثِمِينَ ۙ كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَآ ۗ أَلَآ إِنَّ ثَمُودَا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّثَمُودَ ○ ؎	جب ہمارا حکم آگیا تو ہم نے صالح کو اور جو لوگ ان کے ساتھ ایمان لائے تھے، اُن کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور اس دن کی رسوائی سے محفوظ رکھا، بے شک تمہارا پروردگار طاقتور (اور) زبردست ہے اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا، اُن کو چنگھاڑ (کی صورت میں عذاب) نے آپکڑا تو وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے رہ گئے۔ گویا کبھی ان میں بسے ہی نہ تھے، سن رکھو ثمود نے اپنے پروردگار سے کفر کیا اور سن رکھو ثمود پر پھٹکار ہے۔

؎ سورۃ ہود، آیت ۶۶ - ۶۸

اللہ تعالیٰ نے جب حضرت صالح علیہ السلام اور اُن کے ساتھ ایمان لانے والوں کو نجات دے دی تو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی مشرک قوم کے مُردہ لاشوں کی طرف دیکھا اور کہا:

فَتَوَلّٰى عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسَالَةَ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ لَكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُحِبُّوْنَ النّٰصِحِيْنَ ○[1]	پھر صالح ان سے (ناامید ہوکر) پھرے اور کہا کہ میری قوم! میں نے تم کو خدا کا پیغام پہنچا دیا اور تمہاری خیر خواہی کی، مگر تم (ایسے ہو کہ) خیر خواہوں کو دوست ہی نہیں رکھتے۔

اسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی بدر میں مقتول مشرکینِ مکہ کی لاشوں سے تین دن بعد فرمایا تھا جبکہ آپ اپنی سواری بادِ بہاری پر سوار ہو چکے تھے اور رات کے آخری پہر اپنے ساتھیوں کو بھی آپ نے کوچ کرنے کا حکم دے دیا تھا: اے بدر کے کنوئیں میں پڑے لاشو! کیا تم نے رب کے وعدے کو سچا نہیں پایا۔ مجھ سے میرے رب نے جو وعدہ فرمایا تھا، میں نے تو اسے سچا پایا ہے۔ آپ نے ان سے مخاطب ہوتے ہوئے یہ بھی فرمایا کہ تم نبی کا بدترین خاندان ثابت ہوئے ہو کہ تم نے تو میری تکذیب کی جبکہ دوسرے لوگوں نے مجھے سچا نبی مانا۔ تم نے مجھے مکہ سے نکال دیا جبکہ دوسرے لوگوں نے مجھے اپنے ہاں جگہ دی، تم نے مجھ سے جنگ کی، لوگوں نے میری مدد کی۔ آہ! تم اپنے نبیؐ کے بدترین رشتہ دار ثابت ہوتے ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ! آپ مُردہ لاشوں سے ہم کلام ہیں۔ آپ نے فرمایا:

"اُس ذاتِ اقدس کی قسم جس کے دستِ مبارک میں میری جان ہے۔ میں ان سے جو کہہ رہا ہوں، اسے تم ان کی نسبت زیادہ نہیں سُن رہے لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے۔"[2]

---

[1] سورۃ الاعراف، آیت ۷۹ [2] البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیر ۱/۱۳۸، بخاری کتاب المغازی ۷/۲۴۰، فتح الباری، مسلم ۸/۱۶۴، احمد ۴/۲۹

قومِ ثمود کے یہ کھنڈرات ان کے ظلم اور سرکشی پر شاہدِ عدل ہیں جنہیں سرزمینِ حجر یعنی مدائنِ صالح سے گزرنے والا ہر شخص دیکھ سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل حجر کی بابت فرمایا کہ جب تم ان لوگوں کے پاس سے گزرنے لگو تو روتے ہوئے گزرو اور اگر تمہیں رونا نہ آئے تو ان کے پاس سے مت گزرو، مبادا کہ تم بھی کہیں اس عذاب میں مبتلا نہ ہو جاؤ جس نے انہیں اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔[1]

اس واقعہ میں کس قدر نشانیاں ہیں اور عبرت کے کتنے ہی پہلو ہیں، مگر صد افسوس کہ ہم نصیحت حاصل نہیں کرتے۔

ہم میں سے کتنے ہی لوگ مدائن صالح اور دیگر آثارِ قدیمہ کے پاس سے گزرتے ہیں، مگر گزرنے والوں کے دلوں میں یہ تباہ شدہ کھنڈرات کوئی گداز پیدا نہیں کرتے اور ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کا ایک قطرہ تک نہیں گرتا؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تو بادل کو دیکھ کر گھبرا اُٹھتے کہ مبادا عذابِ الٰہی کا پیش خیمہ نہ ہو، مگر ہم کڑک اور گرج، بجلیاں اور زلزلے، تباہیاں اور بربادیاں سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہتے ہیں، مگر ٹس سے مس نہیں ہوتے، گویا ہمارے سامنے کچھ ہوا ہی نہیں؟

---

[1] فتح الباری ۱۰/۴۵۲، حضرت ابن عمرؓ سے مروی اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت فرمایا ہے۔

حیاتِ ابراہیم علیہ السلام کی ایک جھلک

بعض مورخین کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام غوطہ دمشق کی ایک "برزہ" نامی بستی میں پیدا ہوئے جو کہ جبلِ قاسیون کے دامن میں تھی لیکن صحیح بات وہ ہے جسے ابنِ کثیرؒ نے ابنِ عساکر سے اور انہوں نے کئی اسانید کے ساتھ عکرمہ سے روایت کیا ہے کہ آپ کی ولادت باسعادت کلدانیوں کے علاقے یعنی سرزمینِ بابل میں ہوئی تھی اور آپ کی ولادت اُس وقت ہوئی، جبکہ آپ کے والد کی عمر پچھتر برس تھی۔ اُن کے تین بیٹے تھے: (۱) ابراہیم (۲) ناحور اور (۳) ہاران۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے منجھلے بیٹے تھے۔ ہاران کے بیٹے حضرت لوط علیہ السلام تھے۔ ہاران اپنے باپ کی حیات ہی میں بابل میں فوت ہو گئے تھے۔ اس سلسلہ میں مورخین کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا نام آزر تھا یا تارخ؟ صحیح بات یہ ہے کہ اس کا نام آزر تھا جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّیْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ [۱]	اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا تم کیا بتوں کو معبود بناتے ہو، میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ قیامت کے دن اپنے باپ

---

[۱] سورۃ الانعام، آیت ۷۵

آزر سے ملیں گے، تو دیکھیں گے کہ اس کا چہرہ خاک آلود ہوگا اور اس پر ہوائیاں اُڑ رہی ہوں گی ....الخ[1]

ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں کہ درست بات یہی ہے کہ آپ کے باپ کا نام آزر تھا، ہو سکتا ہے کہ اس کے دو نام ہوں یا ان میں سے ایک نام ہو اور دوسرا لقب۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ امام طبری نے جو یہ کہا ہے، اس کا احتمال ہو سکتا ہے۔ واللہ اعلم!

امام ابن جریر طبریؒ لکھتے ہیں کہ سلف میں سے اکثر اہل علم کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی ولادت باسعادت نمرود بن کوش کے عہد میں ہوئی تھی۔ یہ نمرود بن کنعان بن کوش ایک بڑا ہی ظالم اور سرکش حکمران تھا، اس کی رعایا جہالت و ضلالت کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مار رہی تھی، یہ لوگ بے جان پتھروں اور بے رُوح مورتیوں کی پوجا پاٹ کرتے تھے۔ نمرود نے اپنی قوم کو بیوقوف بنا کر خود اپنی پرستش شروع کرادی تھی اور قوم نے بھی بلا چوں و چرا اس کی عبادت شروع کر دی تھی، کیونکہ وہ سمجھتے کہ جامد پتھروں کے بجائے یہ بولنے والے بُت تو بہر کیف بہتر ہیں اور ایک دوسرے اعتبار سے بابل کا یہ طاغوت نفع و نقصان بھی پہنچا سکتا تھا اور اس بات کی طاقت بھی رکھتا تھا کہ فقیر کو غنی کر دے اور معزز کو ذلیل کر دے، کیونکہ زمین کے ایک بڑے حصّے کے لوگوں کا رازق وہ بن بیٹھا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ چار بادشاہ ایسے گزرے ہیں، جن کی ساری زمین پر بادشاہی تھی، (۱) نمرود (۲) حضرت سلیمان بن داؤدؑ (۳) ذوالقرنین اور (۴) بخت نصر۔ ان میں سے دو بادشاہ مومن تھے اور دو کافر۔

اس گمراہ اور فاسد خاندان میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ولادت باسعادت ہوئی۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت حضرت ابراہیم خلیلؑ، آپ کی بیوی اور برادر زادے حضرت لوط علیہم السلام کے سوا دنیا کے باقی سب لوگ کافر تھے۔ آپ کا باپ آزر آپ کے بدترین دشمنوں میں سے تھا، اسی طرح آپ کے اعزّہ و اقارب اور دوست و احباب بھی سب کے سب آپ کے

---

[1] اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے اور اس کا تفصیل کے ساتھ ذکر آگے آرہا ہے۔

دشمن تھے یعنی آپ اپنے اہل وعیال اور خویش واقارب کے مابین غریب الوطنی کی زندگی بسر کر رہے تھے
حضرت ابراہیم علیہ السّلام جب جوان ہوئے تو سارہ نامی ایک خاتون سے آپ نے شادی کی۔ یہ خاتون عقیم تھی اور ان کے بطن سے کوئی اولاد پیدا نہیں ہوئی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ آپ کے بھائی ہاران کی بیٹی اور حضرت لوطؑ کی بہن تھیں جیسا کہ سہیلی نے لکھا ہے۔ یہ بالکل غلط، دور از کار اور بلا دلیل ہے اور جو لوگ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اس وقت بھتیجی سے نکاح کرنا جائز تھا، تو اُن کا یہ دعویٰ بھی بالکل بلا دلیل ہے اور اگر بفرض محال اس بات کو تسلیم کر بھی لیا جائے کہ اس وقت یہ جائز تھا، جیسا کہ علماء یہود سے منقول ہے تو حضرات انبیاء کرامؑ ایسا نہیں کرتے تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے بدو شعور ہی سے اپنی اصابت رائے اور روشن فکر سے اس بات کو معلوم کر لیا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد اور احد ہے اور بادشاہت میں اس کا کوئی شریک نہیں، اللہ تعالیٰ نے آپ کے دل میں ان بُتوں کی کراہت ڈال دی تھی، جن کے سامنے آپ کی قوم سر بسجود ہوتی تھی، کیونکہ آپ جانتے تھے کہ پتھروں سے تراشے ہوئے یہ بُت کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں۔ ہمیں اس بات کا علم نہیں ہو سکا کہ جب اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت سے سرفراز فرما کر مبعوث فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف کیا تھی؟ البتہ ہمیں قرآن حکیم سے اس سلسلہ میں کچھ اشارات ضرور ملتے ہیں، مثلاً ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ   اور ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ہدایت دی تھی
مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ[1]   اور ہم — ان (کے حال) سے واقف تھے

یعنی اللہ تعالیٰ جانتے تھے کہ آپ میں عقل کی فراوانی، شدتِ ذکاوت، قوت حجت اور فصل الخطاب (خصومت کی بات کا فیصلہ کرنا) کے اوصاف موجود ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] سورۃ الانبیاء، آیت ۵۱

وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ؕ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِى الظّٰلِمِيْنَ ۝ ؎	اور جب پروردگار نے چند باتوں میں ابراہیم کی آزمائش کی تو وہ ان میں پورے اترے۔ اللہ نے کہا کہ میں تم کو لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ انھوں نے کہا کہ (پروردگار) میری اولاد میں سے بھی (پیشوا بنائیو) اللہ نے فرمایا کہ ہمارا اقرار ظالموں کے لئے نہیں ہوا کرتا)

اللہ تعالیٰ نے یہ بیان نہیں فرمایا کہ وہ کیا باتیں تھیں، جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش ہوئی۔ اس سلسلہ میں ہمیں اسی قدر کافی ہے کہ وہ چند امتحانات تھے جن میں بلا کم و کاست حضرت ابراہیم علیہ السلام پورے پورے کامیاب رہے۔ ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے آپ کے وصفِ وفا کا بطور خاص تذکرہ فرمایا ہے، بلکہ وفا کو آپ کے اخلاق کا ایک جزء قرار دیا ہے ارشاد ہے:

وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِىْ وَفّٰٓى ؕ	اور ابراہیمؑ جنہوں نے (حقِ اطاعت و رسالت) پورا کیا۔

ارشادِ باری تعالیٰ: قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا کی تفسیر میں شیخ محمد احمد العدوی رقم طراز ہیں:

یہاں اللہ تعالیٰ نے فَقَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ اس لیے نہیں فرمایا تاکہ ہمیں یہ بتا دیا جائے کہ یہ امامت محض اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے۔ یہ اتمامِ کلمات کے باعث نہیں ہے کیونکہ یہاں امامت سے مراد رسالت ہے اور رسالت کسبی چیز نہیں، بلکہ یہ وہبی ہے۔ مراد یہ ہے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس جلیل القدر منصب کے اہل تھے کہ دنیا کی امامت کا تاج اُن کے سرِ مُبارک پر سجا دیا جاتا گویا اللہ تعالیٰ نے ایک ایسی شخصیت کو رسالت سے نوازا جو اُس کے شایانِ شان تھی۔ ؎

؎ سورۃ البقرۃ، آیت ۱۲۴ ؎ دعوت الرسل الی اللہ تعالیٰ، محمد احمد العدوی، دار المعرفۃ بیروت، ص ۸۴

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں سے صرف اسی قدر معلوم کرلینا ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت سے اس وقت مشرف فرمایا، جب آپ بابل میں قیام پذیر تھے حکمِ الٰہی کی تعمیل میں آپ نے اپنے فرائض و واجبات کو نہایت حُسن و خوبی سے سرانجام دیا۔ تکلیفوں اور مصیبتوں پر صبر کیا اور آلام و مصائب کا پہاڑوں سے مضبوط عزیمت و استقامت کے ساتھ مردانہ وار مقابلہ کیا اور جب آپ کو یہ پختہ یقین ہوگیا کہ اب کبھی بھی آپ کی قوم آپ کی دعوت پر لبیک نہیں کہے گی، بلکہ اس سے اعراض ہی کرتی چلی جائے گی، تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی وسیع سرزمین میں ہجرت شروع کر دی، جہاں جہاں بھی تشریف لے جاتے، ایمان کے بیج بونے کی کوشش فرماتے۔ اس صبر و عزیمت کے باعث اس بات کے مستحق ٹھہرے کہ آپ کو ابوالانبیاء، امام الاتقیاء اور قدوۃ الموحدین کے القاب سے موسوم کیا جائے۔

دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے، ان کی اہمیت کے پیشِ نظر قرآنِ کریم کی مختلف پچیس سورتوں کی تریسٹھ آیاتِ مبارکہ آپ کے ذکرِ خیر پر مشتمل ہیں۔ آپ کی سیرت کے ساتھ آپ کے برادرزادہ حضرت لوط علیہ السلام اور آپ کے فرزندانِ گرامی منزلت حضرت اسماعیل و اسحاق علیہما السلام کی سیرت کی کڑیوں کو بھی ملا کر بیان کیا گیا ہے، بلکہ آپ کے بعد تشریف لانے والے ہر نبی کی سیرت آپ کے ساتھ مربوط ہے، کیونکہ وہ سب آپ کی نسل میں سے ہیں اور اس سلکِ مروارید کی آخری کڑی سیدالاولین و سیدالآخرین، سرورِ دُنیا و دین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم ہیں۔ [1]

---

[1] اس موضوع سے متعلق مصادر و مآخذ میں سے سب سے اہم البدایۃ والنہایۃ (۱/۱۶۳) ہے، کیونکہ اس کتاب میں اکثر و بیشتر روایات کی تحقیق کا اہتمام کیا گیا ہے، اسی طرح میں نے تاریخ طبری ۱/۲۲۴ اور کامل ابن اثیر پر بھی اعتماد کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے باپ آذر کے مابین کشمکش

حضرت ابراہیمؑ کی اپنے باپ سے گفتگو

آذر نہ صرف بت پرست بلکہ وہ بت تراش اور بت فروش بھی تھا اور سب سے بدترین بات یہ ہے کہ انسان کا عقیدہ باطل ہو اور پھر یہ عقیدہ ذریعۂ معاش اور امیدوں اور کوششوں کی غایت بھی ہو۔ بدیہی بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنی دعوت کا آغاز اپنے باپ سے کرتے، کیونکہ لوگوں میں سے آپ کے سب سے زیادہ قریبی یہی تھے اور اس بات کے زیادہ مستحق تھے کہ انہیں ہدایت حاصل ہوتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ حکم دیا تھا کہ آپ اپنی دعوت کا آغاز اپنے قریبی رشتہ داروں سے کریں۔ یاد رہے کہ دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں تمام انبیاء کرام کا یہی طریق کار رہا ہے کہ وہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے اس کا آغاز کرتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو جو دعوت دی اس کا ذکر کئی ایک آیاتِ مبارکہ میں آیا ہے، مثلاً:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ [1]

اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے) جب ابراہیم (علیہ السلام) نے اپنے باپ آذر سے کہا کہ تم کیا بتوں کو اپنا معبود بناتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہے۔

---

[1] سورۃ الانعام، آیت ۷۵

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۝ [1]

اور ہم نے ابراہیمؑ کو پہلے ہی ہدایت دی تھی اور ہم اُن (کے حال) سے واقف تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں، جن (کی پرستش) پر تم معتکف (و قائم) ہو۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ [2]

اور ان کو ابراہیمؑ کا حال پڑھ کر سنا دو، جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو؟

سورۂ مریم کی ان آیات میں اس مناظرہ کی ایک نہایت واضح صورت پیش کی گئی ہے جو حضرت ابراہیمؑ اور آپ کے باپ کے درمیان ہوا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِيْ عَنْكَ شَيْــًٔا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ يَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ۝ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ

اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو، بے شک وہ نہایت سچے پیغمبر تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا کہ ابا آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں۔ ابا مجھے ایسا علم ملا ہے جو آپ کو نہیں ملا تو میرے ساتھ ہو جیے میں آپ کو سیدھی راہ پر چلا دوں گا۔ اسے ابا شیطان کی پوجا نہ کیجیے۔ بیشک شیطان رحمٰن کا نافرمان ہے۔ ابا مجھے ڈر لگتا ہے کہ آپ کو رحمٰن کا غضب آ پکڑے تو آپ شیطان کے ساتھی

---

[1] سورۃ الانبیاء، آیت ۵۱ - ۵۲ [2] سورۃ الشعراء آیت ۶۹ - ۷۰

عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ۝ قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ۝ قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ۝ وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝[1]	ہو جائیں۔ اُس نے کہا کہ ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہے؟ اگر تو باز نہ آئے گا تو میں تجھے سنگسار کر دوں گا اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دُور ہو جا (ابراہیم نے) سلام علیکم کہا (اور کہا کہ) میں آپ کے لیے اپنے پروردگار سے بخشش مانگوں گا، بیشک وہ مجھ پر نہایت مہربان ہے اور میں آپ لوگوں سے اور جن کو آپ اللہ تعالیٰ کے سوا پکارتے ہیں ان سے کنارہ کرتا ہوں اور اپنے پروردگار ہی کو پکاروں گا۔ اُمید ہے کہ میں اپنے پروردگار کو پکار کر محروم نہیں رہوں گا۔

"وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ۬ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا۔"

اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے کہ آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یاد کریں جو کثرتِ صدق کے باعث اس اعزاز کے مستحق ٹھہرے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں صِدِّيْقًا نَّبِيًّا کے لقب سے نوازا ہے اور ان کے وصفِ نبوّت سے قبل ان کی صفتِ صدق کا ذکر فرمایا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نبوت سے قبل بھی اپنی قوم سے جو معاملہ تھا وہ مبنی بر صدق تھا۔ اسی طرح آپ تبلیغ و دعوت الی اللہ کے سلسلہ میں بھی صادق اور امین تھے اور اپنے رب کے احکامات و ارشادات کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دینے کے سلسلہ میں بھی اپنی نظیر نہ رکھتے تھے۔

اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ ــــ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے ساتھ

---

[1] سورۃ مریم، آیت ۴۱ - ۴۸

گفتگو کا آغاز یَاَبَتِ۔ اے میرے ابا جان! کہہ کر کیا اور یہ ایک نہایت قوی رابطہ و تعلق ہے جس کے حوالہ سے آپ نے گفتگو کا آغاز فرمایا۔ شیخ محمد احمد العدوی لکھتے ہیں:

.... ایک دوسرے پہلو سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اس حد درجہ جاذب اور پرکشش اسلوبِ گفتگو کے ساتھ اپنے باپ کے مزاج کی تیزی کو بھی اعتدال پر لانا چاہتے تھے تاکہ انہیں اللہ تعالیٰ کا پیغام پہنچا دیا جائے، ان پر حجت کو اس حال میں پورا کیا جائے جبکہ وہ جذباتی نہ ہوں، بلکہ پُرسکون ہوں۔ محبت و شفقت سے بھرپور اس اسلوب کے ساتھ مخاطب کرنے کے بعد آپ نے نہایت ادب سے فرمایا:

یَاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَلَا یُبْصِرُ وَلَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْئًا۔ اے ابا جان! آپ کسی ایسے معبود کی کیوں عبادت کرتے ہیں جو آپ کی بات کو سُن ہی نہ سکے اور اس سے دُور ہوں یا قریب، وہ آپ کو دیکھ ہی نہ سکے، جو آپ کو کوئی نفع نہ پہنچا سکے اور نہ آپ کی کسی تکلیف کو دُور کر سکے۔

یہ ان بہت سی تصویروں میں سے ایک تصویر ہے، جن میں حضرت ابراہیمؑ ان بُتوں کی عاجزی و ناتوانی دکھایا کرتے تھے کہ جن کی عبادت ان کا باپ کیا کرتا تھا، آپ انہیں ملسوبہ پیارے اسلوب بیان کے ساتھ یہ دعوت دیا کرتے تھے کہ آپ اس مسئلہ پر براہِ کرم غور فرمائیں اور اللہ تعالیٰ نے جو نعمتِ عقل عطا فرمائی ہے، اس سے استفادہ کریں۔ پھر فرمایا:

یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ قَدْ جَآءَنِیْ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَمْ یَاْتِكَ فَاتَّبِعْنِیْۤ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِیًّا۔

یعنی آپ نے اپنے باپ کے ساتھ گفتگو کا آغاز اس بات سے نہیں کیا کہ ان کے پاس علم کی فراوانی، دلائل کا انبار اور فہم و فراست کی بے پناہ دولت ہے۔ نہ اپنے باپ کو جاہل کہا۔ اگر ایسی باتیں کہہ بھی دیتے تو پھر بھی آپ سچے تھے، مگر آپ نے نہایت سلیقہ اور متانت سے یہ فرمایا کہ اے ابا جان! مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل و کرم سے نواز

دیا ہے، لہٰذا اس نئی بات کی طرف توجہ فرمایئے اور اس دعوتِ حق پر لبیک کہہ دیجیے۔ دُنیا و آخرت کی کامیابیاں اور کامرانیاں آپ کے قدموں پر نثار ہو جائیں گی اور اس بات سے شدید اجتناب فرمایئے، جس پر اب تک چلے آرہے ہیں، ورنہ آپ شیطان کے بندے بن جائیں گے اور یہ نہیں ہو سکتا کہ قلبِ مومن میں رحمان کی عبادت کا جذبہ بھی ہو اور پھر وہ شیطان کی پرستش سے بھی محبت رکھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی گفتگو کو ختم بھی یَا اَبَتِ اے میرے ابا جان! کے کلمہ پر کرتے ہیں، یعنی آخر میں بھی وہی محبت سے بھرپور اور سلیقہ و شائستگی پر مبنی اندازِ تخاطب ہے جو ابتداء میں تھا۔ آپ بڑے ہی دردِ دل کے ساتھ اسے دُنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرا رہے تھے، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ نے جو جواب دیا، وہ یہ تھا:

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ۝

آزر نے اس بات کو حد درجہ معیوب سمجھا کہ وہ اپنی قوم کے ان خداؤں سے اعراض کرلے اُس نے جواب میں یَا وَلَدِیْ — اے میرے بیٹے — ! بھی نہیں کہا، بلکہ نام سے بُلایا اور یَا اِبْرَاهِیْمُ کہا اور پھر آپ کو ڈانٹ پلانا شروع کردی کہ اے ابراہیم! اگر تم اپنی ان ضلالتوں سے باز نہ آئے اور اپنے ان باطل عقائد و نظریات کو ترک نہ کیا تو میں تمہیں پتھر مار مار کر ختم کر دوں گا۔ جاؤ میرے گھر سے نکل جاؤ اور مجھ سے دُور ہو جاؤ۔ باپ کے اس دُرشت جواب کے باوجود آپ نے فرمایا:

قَالَ سَلٰمٌ عَلَیْكَ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّیْ اِنَّهٗ كَانَ بِیْ حَفِیًّا ۝

جمہور کا خیال ہے کہ یہاں سلام سے مراد مصالحت ہے۔ یہاں سلام سے مراد تحیہ و دُعا نہیں ہے۔ امام طبریؒ فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ میری طرف سے آپ امن

میں ہیں۔ نقاش کہتے ہیں کہ یہ ایک حلیم و بُردبار کا بیوقوف سے خطاب ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ سلام ہی کے معنی میں ہے اور اس طرح آپ جدائی و فراق اختیار کرنے کے باعث سلام کہہ رہے تھے جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

لَنَآ اَعْمَالُنَا وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ	ہم کو ہمارے اعمال اور تم کو تمہارے اعمال
سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي	تم کو سلام۔ ہم جاہلوں کے خواستگار
الْجٰهِلِيْنَ ۝ [2]	نہیں ہیں۔

بندگانِ رحمان کی صفت میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ	اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) گفتگو
قَالُوْا سَلٰمًا ۝ [3]	کرتے ہیں، تو سلام کہتے ہیں۔

حسبِ ذیل ارشادِ باری تعالیٰ بھی اسی انداز کا ہے:

وَاِنْ جَاهَدٰكَ عَلٰٓى اَنْ	اور اگر وہ تیرے درپے ہوں کہ تو میرے ساتھ کسی
تُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ	ایسی چیز کو شریک کرے جس کا تجھے کچھ بھی علم نہیں؛
عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا وَ	تو اُن کا کہنا نہ ماننا، ہاں دُنیا (کے کاموں) میں
صَاحِبْهُمَا فِي الدُّنْيَا مَعْرُوْفًا	اُن کا اچھی طرح ساتھ دینا۔

اس کے بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کہا،

وَاَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَاَدْعُوْا رَبِّيْ ۖ عَسٰٓى اَلَّآ اَكُوْنَ بِدُعَآءِ رَبِّيْ شَقِيًّا ۝

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ اور قوم کو چھوڑ دیا۔ ان بُتوں اور مورتیوں سے تو پہلے بھی آپ کا کوئی تعلق نہ تھا، جن کی عبادت آپ کی قوم کرتی تھی۔ آپ ان کے قومی میلوں ٹھیلوں اور خوشی کے موقعوں میں بھی شرکت نہ فرماتے تھے۔ ان کی مجلسوں اور محفلوں میں بھی

---

[1] تفسیر القرطبی ۱۱/۱۱۱ [2] سورۃ القصص آیت ۵۵ [3] سورۃ الفرقان آیت ۶۳ [4] سورۃ لقمان آیت ۱۵

شریک نہ ہوتے تھے اور ہمیشہ ان کے بُتوں پر نقد و جرح کرتے رہتے تھے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے باپ کے ساتھ نیکی کرتے ________ اور اس بات کی شدید آرزو رکھتے تھے کہ اسے ہدایت نصیب ہو جائے۔ یہ اس بات کی بھی دلیل ہے کہ آپ نے جو "سلام علیک" کہا تو اس سے سلامِ متارکت مقصود تھا، دُعا اور تحیہ مراد نہ تھا۔

ایک دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہ بھی بیان فرمایا ہے کہ جب آپ نے شرک و ضلالت میں مبتلا اپنی قوم کو چھوڑ دیا، تو اُس نے اپنے خلیل کی کیسے عزت افزائی فرمائی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَهَبْنَا لَهُ إِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ۝ وَوَهَبْنَا لَهُم مِّن رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ۝ [1]

اور جب ابراہیمؑ ان لوگوں سے اور جن کی وہ اللہ کے سوا پرستش کرتے تھے، الگ ہو گئے تو ہم نے اُن کو اسحٰق اور (اسحٰق کو) یعقوب بخشے اور سب کو پیغمبر بنایا اور ان کو اپنی رحمت سے (بہت سی چیزیں) عنایت کیں اور اُن کا ذکرِ جمیل بُلند رکھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے ساتھ یہ جو گفتگو فرمائی تھی، اس میں عبرت و نصیحت کے بہت سے پہلو ہیں، جن میں سے اہم ترین یہ ہیں:

۱۔ بہت سے دعاۃ و مبلغین اپنی کتابوں اور دُروس میں دعوت الی اللہ کی نسبت اپنی شخصیت کے بارے میں زیادہ گفتگو کرتے ہیں۔ دوسروں سے مناظرہ کرتے ہوئے ان پر شیخی بگھارتے نظر آتے ہیں۔ انہیں موقع ہی نہیں دیتے کہ وہ اپنی مشکلات کو بیان کر سکیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کی بنیاد پر اپنی ذات کی خاطر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ دل حسد اور کینہ سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان جیسے بلکہ دیگر تمام مبلغین و دُعاۃ کے لیے یہ ازبس ضروری ہے کہ وہ صدق، ادب، تواضع، بے نفسی، دوسروں کے احترام اور خود پرستی سے اجتناب کے

---

[1] سورۃ مریم، آیت ۴۹-۵۰

سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوۂ حسنہ کو اختیار کریں۔

۲۔ آزر کا دل پہاڑ کی چٹان کے مانند سخت تھا، بلکہ کہنا یوں چاہیے کہ آزر کے مقابلہ میں پہاڑ، چٹانیں اور پتھر نرم تھے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ[1]

اور پتھر تو بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان میں سے پانی نکلنے لگتا ہے اور بعضے ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے عملوں سے بے خبر نہیں۔

آزر اپنے افکار و اعتقادات میں پختہ تھا، اُسے بُت اپنے لختِ جگر اور نورِ نظر سے بھی زیادہ محبوب تھے۔ اسی طرح حضرت ابراہیمؑ بھی اپنے ایمان و معتقدات میں نہایت پختہ تر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب آپ کے باپ نے اپنے کفر پر اصرار کیا تو آپ نے بھی اُس کے ساتھ رہنا گوارا نہ کیا۔ اسے چھوڑ دیا اور حلم و شفقت کے پیکر ہونے کے باوصف اس سے عداوت اور ناراضگی شروع کر دی، مگر افسوس کہ آج کے بہت سے مبلغین و داعیانِ اسلام اپنی ذاتی مصلحتوں کو دعوت کے ساتھ خلط ملط کر دیتے ہیں اور حکمرانوں سے محبت رکھتے ہیں خواہ وہ اسلام اور مسلمانوں سے عداوت ہی کیوں نہ رکھیں۔ اس طرح یہ لوگ اپنے مشرک و منافق آباؤ اجداد اور اعزہ و اقارب سے بھی محبت رکھتے ہیں، حالانکہ قرآنِ حکیم میں یہ بھی پڑھتے ہیں:

لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ[2]

جو لوگ اللہ پر اور روزِ قیامت پر ایمان رکھتے ہیں، تم اُن کو اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں سے دوستی کرتے ہوئے نہ دیکھو گے، خواہ وہ اُن کے باپ یا بیٹے یا بھائی ہوں۔

---

[1] سورۃ البقرۃ، آیت ۷۴، [2] سورۃ المجادلۃ، آیت ۲۲

لیکن یاد رہے کہ ہماری دعوت الی اللہ کی یہ تحریکیں اُس وقت تک کبھی بھی کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکتیں، جب تک ان سے وابستہ لوگ حضرت ابراہیم، حضرت محمد مصطفٰے اور دیگر تمام انبیاء کرام کے نقشِ قدم پر نہیں چلیں گے۔ علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا اپنے باپ سے اظہارِ برائت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّهِ مِن شَيْءٍ رَّبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۝ [1]

تمہیں ابراہیم اور اُن کے رفقاء کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور ان (بتوں) سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں (اور تمہارے معبودوں کے کبھی) قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ، ہم میں تم میں ہمیشہ کھُلم کھُلا عداوت اور دشمنی رہے گی، ہاں ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ (ضرور) کہا کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا اور میں اللہ کے سامنے آپ کے بارے میں کسی چیز کا کچھ اختیار نہیں رکھتا، اے ہمارے پروردگار تجھی پر ہمارا بھروسہ ہے اور تیری ہی طرف ہم رجوع کرتے ہیں اور تیرے ہی حضور میں (ہمیں) لوٹ کر آنا ہے۔

---

[1] سورۃ الممتحنہ، آیت ۴

اس آیتِ مبارکہ کا سببِ نزول یہ ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کا عزم فرمایا اور حضرات صحابہ کرام میں سے ایک جماعت کو اپنے اس پروگرام سے مطلع فرما دیا

ان میں سے ایک صحابی حضرت حاطب رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ حاطب نے اس خبر کے بعد اہلِ مکہ کے نام ایک خط لکھا اور اسے ایک مشرک خاتون کے ہاتھ بھیج دیا اور اس خط میں حاطب نے یہ لکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مکہ مکرمہ کو فتح کرنے کا پروگرام ہے۔ حاطب یہ خط لکھ کر اہلِ مکہ پر احسان کرنا چاہتے تھے۔ ادھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت زبیر اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہم کو اس عورت کے تعاقب میں بھیجا اور انہوں نے اُسے روضہ خاخ نامی جگہ میں پکڑ لیا اور اُس سے خط حاصل کر لیا۔ حاطب اگر اہلِ بدر سے نہ ہوتے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اگر یہ معلوم نہ ہوتا کہ حاطب نے ازراہِ خیانت یہ خط نہیں لکھا یا حاطب کافر و مرتد ہو گئے، تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً ان کی گردن اُڑا دینے کا حکم دے دیتے۔ [1]

یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اُسوہ حسنہ کو اختیار کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کی تین صورتیں ہیں:

(۱) کفار و مشرکین اور جن کی یہ عبادت کرتے ہیں، ان سے اظہارِ برأت کیا جائے۔

(۲) ان کا بالکل انکار کر دیا جائے۔

(۳) ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان کے ساتھ بغض و عداوت کا علی الاعلان اظہار کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ کے ساتھ ایمان لے آئیں۔ اس قطعِ تعلقات اور اظہارِ بغض و عداوت کا سبب کفر ہے اور اگر وہ کفر کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان لے آئیں، تو پھر یہ سب باتیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ [2]

---

[1] سورۃ ممتحنہ کے نزول کا سبب کتبِ تفسیر مثلاً تفسیر طبری اور ابن کثیر میں وارد ہے۔ امام بخاریؒ نے اسے اپنی صحیح کے کتاب الجہاد کے باب الجاسوس میں روایت کیا ہے [2] اضواء البیان ۸/ ۱۳۸

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لیے جو مغفرت کی دُعا کی تو اس کا تعلق دعوت کے ابتدائی دور سے ہے جبکہ آپ کو یہ معلوم نہ تھا کہ وہ کفر و شرک پر اس قدر اصرار کرے گا، بلکہ اُمید رکھتے تھے کہ شاید وہ ہدایت کو اختیار کرے، جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ[1]

اور ابراہیم کا اپنے باپ کے لیے بخشش مانگنا تو ایک وعدے کے سبب تھا جو اس سے وہ کر چکے تھے، لیکن جب اُن کو معلوم ہو گیا کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے بیزار ہو گئے۔ کچھ شک نہیں کہ ابراہیم بڑے نرم دل اور متحمل تھے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے اسی طرح اظہارِ برأت کر دیا تھا جس طرح حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے اور بیوی سے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مشرک اعزہ و اقارب سے برأت کا اظہار فرما دیا تھا۔ استاذ سید قطب شہید رحمہ اللہ ان آیات کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

"مسلمان یہ دیکھتا ہے کہ اس کا نسب بہت گہرا ہے، اس کا ماضی بہت طویل ہے، اس کا خاندان کئی قرنوں اور زمانوں پر پھیلا ہوا ہے اور اس کا سلسلہ حضرت ابراہیم تک منتہی ہوتا ہے اور اس حسب و نسب کا تعلق محض عقیدہ ہی سے نہیں، بلکہ ان تمام تجربات سے بھی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو پیش آئے تھے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے ذاتی مشاہدات سے زیادہ اس کے سامنے تجربات موجود ہیں، بلکہ اس دور کے تمام لوگوں کے تجربات سے بھی زیادہ اس کے سامنے موجود ہیں۔ یہ ایک مقدس قافلہ ہے جو اللہ کے دین پر ایمان رکھنے والوں کا قافلہ ہے اور عرصہ دراز سے اس کارگہِ حیات میں رواں دواں ہے۔ اس قافلہ سے وابستہ

---

[1] سورۃ التوبۃ، آیت ۱۱۴

لوگ اللہ کے پرچم تلے کھڑے ہیں، لہٰذا جیسے حالات انہیں درپیش ہیں پہلے بھی ان سے سابقہ پڑ چکا ہے۔ یعنی یہ کوئی نئی بات نہیں، نیا معاملہ نہیں اور نہ کوئی ایسا تکلیف دہ امر ہے جو مومنوں پر گراں گزرتا ہو، پھر یہ قافلہ ایک طویل و عریض امت پر مشتمل ہے جو عقیدہ کی استواری میں ہم آہنگ ہے، مگر جب عقیدہ کے دشمنوں سے معاملہ پیش آتے تو پھر یہ اس بھاری بھرکم، سرسبز و شاداب گہری جڑوں کثیر شاخوں اور گھنے سایوں والے اس درخت کی شاخ ثابت ہوتا ہے جسے پہلے مسلمان حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لیا تھا۔“[1]

ایمان نے حد فاصل کھینچ دی تھی، حضرت ابراہیمؑ امام المتقین تھے اور ان کا باپ آزر کفار و مشرکین میں سے ہونے کے باعث تباہ و برباد بھی ہوا اور اس کی صورت بھی مسخ کر دی جائے گی جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کی قیامت کے دن اپنے باپ آزر سے ملاقات ہوگی تو آپ دیکھیں گے کہ آزر کا چہرہ خاک آلود ہے اور اس پر سیاہیاں اڑ رہی ہیں، تو آپ فرمائیں گے کہ میں نے کہا نہیں تھا کہ میری نافرمانی نہ کرو؟ آزر کہے گا کہ آج میں نافرمانی نہیں کروں گا۔ ابراہیم علیہ السلام بارگاہِ ایزدی میں عرض کریں گے کہ اے اللہ! آپ نے میرے ساتھ وعدہ فرما رکھا ہے کہ روزِ قیامت مجھے رسوا نہیں کیا جائے گا تو اس سے بڑھ کر اور کیا رسوائی ہو سکتی ہے جو رحمت سے دور اس باپ کے باعث ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میں نے جنت کو کافروں کے لیے حرام قرار دے رکھا ہے۔ پھر کہا جائے گا، اے ابراہیم! تمہارے قدموں کے نیچے کیا ہے؟ وہ دیکھیں گے کہ ایک مقتول، گندی چیز کھانے والا جانور ہے۔ پھر اسے چاروں پاؤں سے پکڑ کر جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔[2]

---

[1] فی ظلال القرآن، ج ۸، جزء ۲۸، ص ۶۲

[2] صحیح بخاری، فتح الباری ۷ / ۱۹۷

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ ابراہیم بن طہمان کی روایت میں ہے کہ آزر کو پکڑ لیا جائے گا اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اے ابراہیم: کہاں ہے تمہارا باپ؟ عرض کریں گے آپ نے پکڑا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے ذرا نیچے دیکھو، آپ نیچے نگاہ کریں گے تو دیکھیں گے کہ ایک مقتول جانور ہے جو اپنی غلاظتوں میں لتھڑ رہا ہے۔

ایوب کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے باپ کی صورت کو مسخ کر کے بجو کی شکل بنا دیں گے حضرت ابراہیمؑ اس کی ناک کو پکڑیں گے (حضرت ابراہیم علیہ السلام اس کے نتھنوں کی بدبو سے بچنے کے لیے اس کی ناک کو انگلیوں سے پکڑیں گے) اور اللہ تعالیٰ فرمائیں گے اے میرے بندے کیا یہ ہے تیرا باپ؟ حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے تیرے عزت و جلال کی قسم! نہیں یہ تو میرا باپ نہیں۔

سعید کی روایت میں یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے باپ کو بدترین شکل میں تبدیل کر دیا جائے گا اور اس کی صورت بجو کی سی ہو گی اور نہایت بدترین بدبو آ رہی ہو گی۔

ابن المنذر نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اسے اس حالت میں دیکھیں گے، تو برات کا اظہار کر دیں گے اور فرمائیں گے کہ تو میرا باپ نہیں ہے۔

حافظ ابن حجرؒ فرماتے ہیں کہ اس کی شکل کے مسخ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام کو اس سے متنفر کر دیا جائے۔ اگر وہ اپنی اصلی شکل و صورت میں جہنم رسید ہوتا تو آپ کے لیے یہ بات قلق و اضطراب کا باعث ہوتی۔

جب حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام قیامت کے دن اپنے باپ کو کوئی نفع نہیں پہنچا سکیں گے۔ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے جہنم میں سڑنے سے بچا نہیں سکیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبانی یہ اعلان کروا دیا تھا:

وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ اور میں خدا کے سامنے آپ کے بارے میں کسی چیز کا کچھ اختیار نہیں رکھتا۔

لہ فتح الباری ۱۰/۱۱۵، ۷/۱۹۷

اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روزِ قیامت اپنے والدین کو نفع نہیں پہنچا سکیں گے بلکہ آپ نے جب اپنے چچا ابو طالب کے لیے مغفرت کی دُعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اس پر ناراضگی کا اظہار فرمایا اور حکم دیا،

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ يَّسْتَغْفِرُوْا لِلْمُشْرِكِيْنَ وَلَوْ كَانُوْٓا اُولِيْ قُرْبٰى مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ؁	پیغمبر اور مسلمانوں کو شایاں نہیں کہ جب اُن پر ظاہر ہو گیا کہ مشرک اہل دوزخ ہیں، تو اُن کے لیے بخشش مانگیں، گو وہ اُن کے قرابت دار ہی ہوں۔

تو پھر ان لوگوں کو یہ سوچنا چاہیے جو اولیاء اور صلحاء کی قبروں کی طرف شد رحال کر کے جاتے ہیں، ان کے گرد و پیش طواف کرتے ہیں، ان کے لیے جانور ذبح کرتے ہیں اور مُردوں سے ایسی باتوں کا سوال کرتے ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی پورا نہیں کر سکتا۔ قبروں کے پجاریوں نے اس بات کو بھلا دیا ہے کہ دُعا کرنا بھی ایک عبادت ہے اور یہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کے لیے ہونی چاہیے۔ انبیاء کرام اور اولیاء عظام تو کسی کی کسی تکلیف کو بھی دُور کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ	کہو (کہ مشرکو) جن لوگوں کی نسبت تمہیں (معبود ہونے کا) گمان ہے، ان کو بلا دیکھو وہ تم سے تکلیف دُور کرنے یا اس کے بدل دینے کا کچھ بھی اختیار نہیں رکھتے۔ یہ لوگ جن کو اللہ کے سوا، پکارتے ہیں، وہ خود اپنے پروردگار کے ہاں ذریعہ (تقرب) تلاش کرتے ہیں کہ

؁ سورۃ التوبۃ، آیت ۱۱۳

وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۝

کون ان میں (اللہ کا) زیادہ مقرب (ہوتا) ہے اور اس کی رحمت کے امیدوار ہوتے ہیں اور اُس کے عذاب سے خوف رکھتے ہیں بیشک تمہارے رب کا عذاب ڈرنے کی چیز ہے۔ [1]

قابلِ ذکر بات یہ کہ مشرکینِ قریش بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایمان رکھتے تھے اور ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے ہیں کہ یہ بت تقربِ الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى [2]

اور جن لوگوں نے اس کے سوا اور دوست بنائے ہیں (وہ کہتے ہیں کہ) ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ ہم کو اللہ کا مقرب بنا دیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص کی بازپرس ہوگی ہر نفس اپنے اعمال کا حساب دے گا، لیکن یہ یاد رہے کہ آخرت میں نجات کا دارومدار اور انحصار اس ایمانِ صحیح پر ہے جو انبیا کرام کی تعلیمات کے مطابق عمل کو مستلزم ہو، اولیاء اللہ اور انبیاء کرام کی عبادت سے نجات نہیں ملے گی۔ اولیاء و انبیاء تو اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر کسی کی شفاعت بھی نہیں کر سکیں گے اور مشرک کا خاتمہ جب کفر و شرک کی حالت ہی پر ہو تو اس کی بخشش نہ ہوگی اور اُس کے لیے کسی شفاعت کنندہ کی شفاعت منفعت بخش نہ ہوگی۔

حضرت ابراہیم کی اپنی قوم کے ساتھ کشمکش

تقلید دعوتِ الی اللہ کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سب سے بڑی جس مشکل کا سامنا تھا، وہ قوم پر طاری جمود، آباؤ اجداد کے عقائد کے لیے شدید تعصب اور کوئی تبدیلی یا تجدید قبول نہ کرنے پر اصرار تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بھی اپنے باپ

---

[1] سورۃ الاسراء، آیت ۵۶، ۵۷ [2] سورۃ الزمر، آیت ۳

کو سمجھانے کی کوشش کرتے اور دلائل و براہین سے اپنے موقف کی وضاحت فرماتے تو آپ کا مشرک باپ اپنی عقل کو معطّل قرار دے دیتا اور اس بات کو قبول کرنے سے انکار کر دیتا کہ اس کا بیٹا اپنے آباؤ اجداد کے عقیدہ کی مخالفت کرے، چنانچہ قرآن حکیم نے اس کے باپ کی یہ بات نقل کی ہے:

اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِیْ یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِیْ مَلِیًّا ۝

ابراہیم! کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہے اگر تو باز نہ آئے گا تو میں تجھے سنگسار کروں گا اور تو ہمیشہ کے لیے مجھ سے دُور ہو جا۔

اسی طرح آپ کی مخالفت اور تردید کے سلسلہ میں آپ کی قوم کا موقف بھی آپ کے باپ کے موقف سے مختلف نہ تھا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاتْلُ عَلَیْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِیْمَ ۘ اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ قَالُوْا نَعْبُدُ اَصْنَامًا فَنَظَلُّ لَهَا عٰكِفِیْنَ ۝ قَالَ هَلْ یَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ۙ اَوْ یَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ یَضُرُّوْنَ ۝ قَالُوْا بَلْ وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا كَذٰلِكَ یَفْعَلُوْنَ ۝ [1]

اور ان کو ابراہیم (علیہ السلام) کا حال پڑھ کر سنا دو جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو؟ وہ کہنے لگے کہ ہم بتوں کو پوجتے ہیں اور ان (کی پوجا) پر قائم ہیں (ابراہیم علیہ السلام نے) کہا کہ جب تم ان کو پکارتے ہو تو کیا وہ تمہاری (آواز) سنتے ہیں یا تمہیں کچھ فائدہ دے سکتے یا نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا (نہیں) بلکہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طرح کرتے دیکھا ہے۔

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] سورۃ الشعراء، آیت ۶۹-۷۴

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۚ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا عٰكِفُوْنَ ۔ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔[1]

اور ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ہدایت دی تھی اور ہم ان (کے حال) سے واقف تھے۔ جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں جن کی پرستش (پر تم معتکف (و قائم) ہو، وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے (ابراہیم نے) کہا کہ تم بھی (گمراہ ہو) اور تمہارے باپ دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے رہے۔

اللہ تعالیٰ کے تمام انبیاء و مرسلین کرام کے دشمنوں کا یہی انداز اور طرزِ عمل رہا ہے اور لوگوں کو حق سے دُور رکھنے کے سلسلہ میں یہی ان کی روش رہی ہے۔ سردارانِ قوم یہ سمجھتے رہے کہ وہ اپنے آباؤ اجداد کے عقیدہ کے شرعی وکیل ہیں۔ اسی عقیدہ کے نام سے وہ لوگوں پر ظلم ڈھاتے، زمین میں فتنہ و فساد برپا کرتے اور کھیتیوں اور نسلوں کو تباہ و برباد کرتے رہے ہیں۔ جمہور اور عوام الناس بھی اس طرزِ حیات سے مانوس ہیں کہ وہ بلا سوچے سمجھے حیوانوں کی سی بلکہ ان سے بھی بدتر زندگی گزاریں۔ علامہ زمخشریؒ فرماتے ہیں،

"کس قدر بدترین چیز ہے یہ تقلید اور بغیر دلیل کے کسی قول کو قبول کرنا اور شیطان کی کس قدر بُری ہے یہ چال جو مقلدین پر چل گئی کہ انہوں نے شیطان کے بہکاوے میں آکر بتوں اور مورتیوں کی پوجا پاٹ کے سلسلہ میں بھی اپنے آباؤ اجداد کی تقلید کے دامن کو ہاتھ سے نہ چھوڑا، بلکہ اُن کے سامنے اپنی پیشانیوں کو رگڑتے رہے اور عقیدہ یہ رکھتے رہے کہ ان کا موقف نہایت درست ہے، کیونکہ یہ اپنے مذہب کی نصرت و حمایت کر رہے ہیں اور اہلِ حق کے مقابلہ میں اپنے باطل مذہب

[1] سورۃ الانبیاء، آیت ۵۱ - ۵۴

کی طرف سے لڑ رہے ہیں۔ آہ! اہلِ تقلید کے لیے یہی عار کافی ہے کہ بُتوں کے پجاری بھی مقلد تھے۔[1]

مقلدین کی تردید میں صرف یہی ایک بات کافی ہے کہ جہنم رسید ہوتے وقت کہیں گے:

وَقَالُوا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۔ فَاعْتَرَفُوْا بِذَنْۢبِهِمْ ۚ فَسُحْقًا لِّاَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۔[2]

اور کہیں گے اگر ہم سنتے یا سمجھتے ہوتے تو دوزخیوں میں نہ ہوتے۔ پس وہ اپنے گناہوں کا اقرار کرلیں گے، سو دوزخیوں کے لیے (رحمتِ خداتعالیٰ سے) دُوری ہے۔

نیز ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰۗىِٕكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۔[3]

اور ہم نے بہت سے جن اور انسان دوزخ کے لیے پیدا کیے ہیں، ان کے دل ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں، مگر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ (بالکل) چارپایوں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوتے ہیں۔ یہی وہ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

بُتوں کے یہ مقلد پجاری حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام کو ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے کہ اگر بُتوں کی مذمت سے باز نہ آئے، تو ہمارے ان خداؤں کی طرف سے تمہیں تکلیف پہنچے گی اس میں کوئی اچنبھے کی بات بھی نہیں۔ مشرک اور بُت پرست لوگ ہمیشہ یہ سمجھتے چلے آئے ہیں کہ یہ بُت نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

---

[1] دعوۃ الرسل الی اللہ تعالیٰ، محمد احمد العدوی ص ۵۴ [2] سورۃ الملک آیت ۱۰-۱۱ [3] سورۃ الاعراف آیت ۱۷۹

وَحَاجَّهٗ قَوْمُهٗ ؕ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّیْ فِی اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ؕ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ رَبِّیْ شَیْـًٔا ؕ وَسِعَ رَبِّیْ كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝ [1]

اور ان کی قوم ان سے بحث کرنے لگی، تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا) بحث کرتے ہو، اُس نے تو مجھے سیدھا رستہ دکھا دیا ہے اور جن چیزوں کو تم اس کا شریک بناتے ہو میں ان سے نہیں ڈرتا، ہاں میرا پروردگار جو کچھ چاہے میرا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز پر احاطہ کیے ہوتے ہے، کیا تم خیال نہیں کرتے ؟

ہمیں بھی آج بالکل اسی طرح کی مشکلات کا سامنا ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تھا، آج بھی اکثر لوگ خود سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے، بلکہ اپنے قائدین کی عقلوں کے آئینہ سے دیکھتے ہیں اور انہی کی عقلوں کو معیار قرار دیتے ہیں اور خود غور و فکر یا دلائل کا جائزہ لینے کی کوشش نہیں کرتے . . . . ہم نے اس طرح کے ہزاروں لاکھوں قصے سُنے ہیں کہ ایک شخص نے جب فلاں قطب کی شخصیت کے بارے میں لب کشائی کی، تو وہ خواب میں ان کے پاس آئے اور اس گستاخی کی سزا کے طور پر بہت مارا پیٹا۔ حتیٰ کہ اس مار پیٹ کے آثار ہمیشہ اس کے جسم پر نظر آتے رہے، بلکہ نوبت بایں جا رسید کہ جب قبروں کے پجاریوں سے قسم لی جاتی تو وہ اللہ کے نام کی جھوٹی قسم تو کھالیں گے، مگر یہ اس بات کی کبھی بھی جرأت نہیں کر سکتے کہ مردہ بزرگوں کے نام کی جھوٹی قسمیں کھائیں، تو اس سے اندازہ فرمائیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی قوم کے ساتھ کس قدر مشکلات کا سامنا تھا۔

۲۔ اپنی قوم کو دعوت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اہل و عیال اور قوم کو دعوت دینے کے سلسلہ میں صرف ایک ہی اسلوب اور پیرایہ

---

[1] سورۃ الانعام، آیت ۸۰

بیان پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ کبھی تو آپ اپنے باپ اور دیگر اہل وعیال کو فرداً فرداً سمجھاتے اور کبھی جب قوم اپنے میلوں ٹھیلوں اور تہواروں کے سلسلہ میں مجتمع ہوتی تو آپ سب سے مخاطب ہوکر دعوت الی اللہ کے فرض کو سرانجام دیتے، کبھی اس دور کے سب سے بڑے طاغوت نمرود جس نے خدائی کا دعویٰ کر رکھا تھا، کو خدا تعالیٰ کا پیغام سناتے اور حق کو قبول کرنے کی دعوت دیتے اور کبھی ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاکر قوم کو سمجھاتے جو عادات وتقالید کا جائزہ لینے کے لیے ساری قوم کے سامنے ایک لمحۂ فکریہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ اپنے باپ کو آپ نے جو دعوت دی تھی اور باپ بیٹا کے مابین جو مناظرے ہوئے، اُن کی تفصیل ہم قبل ازیں بیان کر آئے ہیں اور آئندہ صفحات میں ان واقعات کی تفصیل بیان کریں گے جو آپ کو قوم کے ساتھ پیش آئے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کئی سال تک اپنی قوم کو یہ دعوت دیتے رہے کہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو اختیار کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ قرآن حکیم کی بہت سی آیات میں اس دعوت کا ذکر آیا ہے؛

وَحَآجَّهٗ قَوْمُهٗ ۭ قَالَ اَتُحَآجُّوْٓنِّيْ فِي اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۭ وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّيْ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسِعَ رَبِّيْ كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝

اور ان کی قوم اُن سے بحث کرنے لگی تو انہوں نے کہا کہ تم مجھ سے خدا کے بارے میں (کیا) بحث کرتے ہو، اُس نے تو مجھے سیدھا رستہ دکھا دیا ہے، اور جن چیزوں کو تم اس کا شریک بناتے ہو، میں ان سے نہیں ڈرتا، ہاں میرا پروردگار جو کچھ چاہے میرا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے، کیا تم خیال نہیں کرتے؟

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ اِبْرٰهِيْمَ ۝ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ

اور ان کو ابراہیمؑ کا حال پڑھ کر سنا دو، جب انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں

مَا تَعْبُدُوْنَ ہ   سے کہا کہ تم کس چیز کو پوجتے ہو

سورۃ انبیاء اور شعراء میں بھی آپ کا آپ کی قوم کے ساتھ یہ مناظرہ موجود ہے کہ یہ بُت جن کو تم نے خدا بنا رکھا ہے۔ یہ ہرگز ہرگز اس قابل نہیں کہ اللہ وحدہٗ کے بجائے ان بتوں کو اپنا معبود بنا لیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ۘ	اور انہی کے پیروؤں میں ابراہیم تھے، جب
اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ۞	وہ اپنے پروردگار کے پاس (عیب سے) پاک
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ	دل لے کر آئے، جب انہوں نے اپنے باپ سے
مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ہ اَئِفْكًا	اور اپنی قوم سے کہا کہ تم کن چیزوں کو پوجتے ہو؟
اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ۞	کیوں جھوٹ (بنا کر) خدا کے سوا اور معبودوں کے طالب ہو

ان بہت سی سورتوں میں سے جن میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اپنی قوم کے ساتھ مناظرہ کا تذکرہ ہے۔ ہم سورۃ انعام کی مندرج ذیل آیات کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ چند لمحے ان کے زیرِ سایہ گزار لیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ	اور (وہ وقت بھی یاد کرنے کے لائق ہے)
اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ	جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ آزر سے
اِنِّيْٓ اَرٰىكَ وَقَوْمَكَ فِيْ	کہا تم کیا بتوں کو معبود بناتے ہو۔ میں دیکھتا ہوں
ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ہ وَكَذٰلِكَ	کہ تم اور تمہاری قوم صریح گمراہی میں ہو اور ہم
نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ	اس طرح ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کے عجائبات
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ	دکھانے لگے تاکہ وہ خوب یقین کرنے والوں میں
مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ہ فَلَمَّا جَنَّ	ہو جائیں (یعنی) جب رات نے ان کو (پردۂ
عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ	تاریکی سے) ڈھانپ لیا تو (آسمان میں) ایک
هٰذَا رَبِّيْ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ	ستارا نظر پڑا، کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے جب وہ

أُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ [1]

غائب ہوگیا تو کہنے لگے کہ مجھے غائب ہوجانے والے تو پسند نہیں، پھر جب چاند کو دیکھا کہ چمک رہا ہے تو کہنے لگے یہ میرا پروردگار ہے، لیکن جب وہ بھی چھپ گیا تو بول اُٹھے کہ اگر میرا پروردگار مجھے سیدھا رستہ نہیں دکھائے گا، تو میں ان لوگوں میں سے ہوجاؤں گا جو بھٹک رہے ہیں۔ پھر جب سورج کو دیکھا کہ جگمگا رہا ہے، تو کہنے لگے میرا پروردگار یہ ہے، یہ سب سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا، تو کہنے لگے لوگو جن چیزوں کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو، میں ان سے بیزار ہوں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کی عطا کی ہوئی حکمت کے ساتھ اس بات پر قادر ہوئے کہ بطریقِ استدراج اپنی قوم پر دلائل و براہین میں غالب رہیں [2] آپ نے رات چھا جانے کے بعد جب ستارے کو دیکھا تو اسلوبِ تمسخر کو استعمال کرتے ہوئے یعنی اُن کی منطق کو استعمال کرتے ہوئے ان کے اقوال کے ساتھ ان کی تردید کرتے ہوئے یہ کہا، "هٰذَا رَبِّيْ" لیکن جب یہ ستارا غائب ہوگیا تو فرمایا کہ "لَآ اُحِبُّ الْاٰفِلِيْنَ" پھر ستارہ کے بجائے چاند کی طرف رُخ کیا، مگر جب وہ بھی غروب ہوگیا، تو فرمایا کہ جو کبھی طلوع ہوتا ہو اور کبھی غروب، وہ خدا نہیں ہوسکتا، پھر آپ نے آفتاب کی طرف رُخ کیا جو کہ روشنی اور چمک دمک کے اعتبار سے نظر آنے والے تمام

---

[1] سورۃ الانعام، آیت ۷۶ تا ۷۸ [2] بعض مفسرین لکھتے ہیں کہ آپ نے اپنی قوم کے ساتھ یہ مناظرہ بابل میں کیا، جبکہ کچھ دوسرے مفسرین کا خیال ہے، جن میں ابن کثیر بھی ہیں کہ یہ مناظرہ حران میں ہوا، کیونکہ دمشق اور اس کے گرد نواح کے لوگ ستاروں کی پرستش کرتے تھے، لیکن اہم بات یہ نہیں کہ یہ مناظرہ کہاں ہوا، بلکہ اہم بات یہ ہے کہ آپ کس طرح دلائل و براہین کے ساتھ بحث کرتے ہوئے قوم کو قائل کرنا چاہتے تھے۔

اجرامِ فلکی سے بڑا ہے، مگر جب وہ بھی غروب ہو گیا، تو آپ نے فرمایا جو مسخر ہو، جسے کوئی اور چلا رہا ہو اور جس کے پیچھے کسی اور کا دستِ قدرت کارفرما ہو، وہ بھلا خدا کیسے ہو سکتا ہے؟

جب یہ سب سیارے اور ستارے غائب ہو گئے اور قوم بھی اس منظر کا مشاہدہ کر رہی تھی، تو آپ نے بتوں، مورتیوں، ستاروں، جابر و ظالم طاغوتوں اور ہر اُس چیز سے برأت کا اظہار فرمادیا جس کی قوم پوجا کرتی تھی، کیونکہ یہ سب کی سب ایسی چیزیں ہیں جو قطعاً کسی بھی نفع و نقصان کی مالک نہیں۔ پھر اس کے برعکس آپ نے صفاتِ باری تعالیٰ کو بیان کرنا شروع فرمادیا کہ وہ کھلاتا ہے، پلاتا ہے، شفا عطا فرماتا ہے، موت طاری کرتا ہے اور پھر روزِ قیامت لوگوں کو ان کی قبروں سے برہنہ پاؤں، برہنہ جسم اور بغیر ختنہ کے اُٹھائے گا۔

اس کے برعکس قوم اس فاسد خیال میں مبتلا تھی کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام بُتوں کی خرابی اور بُرائی بیان کرنے سے باز نہ آئے، تو یہ بُت یقیناً آپ کو ایذا پہنچائیں گے مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی اس بات کی تردید میں فرمایا کہ یہ بُت جب خود اپنا دفاع نہیں کر سکتے اور اپنے آپ سے کسی تکلیف کو دُور نہیں کر سکتے تو مجھے کیسے تکلیف پہنچائیں گے؟ واقعات نے بھی آپ کے ارشادات کی حقانیت پر اس طرح مہرِ تصدیق ثبت کی کہ آپ سال ہا سال تک بُتوں کی مذمت فرماتے رہے، مگر کس بُت کو بھی یہ قدرت حاصل نہ ہوئی کہ وہ آپ کو کوئی گزند پہنچا سکے؟

اس سے قبل تو ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے کبھی یہ سوچا بھی نہ تھا کہ وہ عقلوں کو اس بات پر غور کرنے اور سوچنے کی زحمت دے کہ یہ جو بے جان اور حقیر بُت ہیں، یہ کسی کو کیا نفع یا نقصان پہنچا سکتے ہیں؟ ان کے نزدیک تو اس بات کی قطعاً اجازت ہی نہ تھی کہ اس بات کو موضوعِ سخن بنایا جائے، کیونکہ وہ اپنے آپ کو اپنے آباؤ اجداد یا اپنے بزرگوں سے عقل و فہم کے اعتبار سے زیادہ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے، لیکن ابراہیم علیہ السلام نے بڑے منطقی اور بڑے خوش گوار اسلوبِ بیان کو اختیار فرما کر اور استدراج کے طریق کو استعمال کر کے ان کی اُن عقلوں

کو جنبش دی، جن سے کام لینے کو عرصہ دراز سے انہوں نے معطل قرار دے رکھا تھا۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝ [1]

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی۔ ہم جس کو چاہتے ہیں، درجے بلند کر دیتے ہیں۔ بیشک تمہارا پروردگار دانا (اور) خبردار ہے۔

بعض مفسرین کرام نے یہ لکھا ہے کہ ستاروں کے اس طلوع و غروب کے نظام میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ان کے بچپن کے دور سے ہے اور وہ نبوت سے قبل ہی بُت پرستی کے ان مناظر کو دیکھ کر جس قلق و اضطراب میں مبتلا تھے، یہ واقعہ اسی طرف اشارہ کرتا ہے، ان مفسرین نے اپنے اس موقف کی تائید کے لیے حسب ذیل ارشادِ باری تعالیٰ سے بھی استدلال کیا ہے:

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ۭ قَالَ بَلٰى وَلٰكِنْ لِّيَطْمَىِٕنَّ قَلْبِيْ ۭ .... [2]

اور جب ابراہیمؑ نے (خدا سے) کہا کہ اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔ خدا نے فرمایا کیا تم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا انہوں نے کہا کیوں نہیں، لیکن (میں دیکھنا اس لیے چاہتا ہوں) کہ میرا دل اطمینانِ کامل حاصل کر لے۔

لیکن ہم حسب ذیل وجوہ و اسباب کے باعث اس سے اتفاق نہیں کر سکتے:

۱۔ یہ کہنا کہ کواکب کے اس نظام سے عبرت و نصیحت حاصل کرنے کا تعلق ان کے بچپن سے ہے، جبکہ ■ غار سے باہر نکلے تھے۔ اس بات کو ابن اسحاق نے ذکر کیا ہے اور ان کا ماخذ

---

[1] سورۃ الانعام، آیت ۸۳ [2] سورۃ البقرۃ، آیت ۲۶۰

اسرائیلی روایات ہیں جو کہ ناقابلِ اعتماد ہیں، خصوصاً جبکہ وہ حق کے مخالف بھی ہوں تو اُن پر قطعاً اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔[1]

۲۔ شیخ محمد امین شنقیطیؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شرک کی نفی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ (آپ مشرکوں میں سے نہ تھے) اور اس نفی کا تذکرہ کئی ایک آیات میں آیا ہے۔ ماضی میں شرک کی نفی تمام تر زمانہ ماضی کو مستلزم ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے کبھی بھی ہرگز ہرگز شرک نہیں کیا تھا۔[2]

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو یہ فرمایا: رَبِّ أَرِنِي تو اُس کے یہ معنی نہیں کہ آپ کو شک تھا۔ جب اس بارے میں ہمیں کوئی شک نہیں، تو آپ کو کیسے ہو سکتا ہے؟[3]

۹ علامہ قرطبیؒ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے شک کی نفی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس شخصیت کے بارے میں یہ بات کیونکر صحیح ہو سکتی ہے، جنہیں اللہ تعالیٰ نے عصمت سے نوازا نبوت سے قبل ہی رشد و بھلائی سے سرفراز فرمایا اور انہیں ارضی و سماوی ملکوت کا مشاہدہ کرایا تاکہ دولتِ یقین سے شاد کام ہو جائیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کی تشریح میں علامہ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک ہوتا تو ہمیں آپ سے بھی زیادہ ہوتا لیکن جب ہمیں اس بارے میں کوئی شک نہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو تو بالکل شک نہیں ہو سکتا، یعنی اس حدیث میں شک کی نفی کی گئی ہے۔[4]

آج کل کچھ اس قسم کی عجیب و غریب باتیں بھی سننے میں آ رہی ہیں کہ ایمان سے قبل شک کا ہونا ضروری ہے، لہٰذا حضرت ابراہیم علیہ السلام پہلے شک کرنے والے تھے۔ اس

---

[1] قصص الانبیاء، ابن کثیر، تحقیق مصطفےٰ عبدالواحد ۱/۱۷۵، دار الکتب الحدیث مصر

[2] اضواء البیان، شیخ شنقیطی ۲/۱۸۰ [3] بخاری، مسلم، فتح الباری ۷/ ۲۲۲

[4] تفسیر قرطبی ۲/۲۹۸، ۷/۲۵ قاضی عیاضؒ کا حوالہ بھی اسی کتاب سے منقول ہے۔

وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت شک کے زیادہ حقدار ہیں، حالانکہ صحیح بات یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ہرگز شک نہ تھا انہوں نے تو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی تھی کہ وہ انہیں اور اُن کی اولاد کو بت پرستی سے محفوظ رکھے، بلکہ آپ تو اللہ کریم کی بارگاہ میں قلبِ سلیم لے کر آتے تھے اور آپ نے کبھی بھی شرک کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔

۲۔ نمرود کے ساتھ مناظرہ

ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ اَنْ اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ ۘ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّىَ الَّذِىْ يُحْىٖ وَيُمِيْتُ ۙ قَالَ اَنَا اُحْىٖ وَاُمِيْتُ ؕ قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ يَاْتِىْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۚ ۝	بھلا تم نے اس شخص کو نہیں دیکھا جو اس غرور کے سبب سے کہ خدا نے اس کو سلطنت بخشی تھی ابراہیمؑ سے پروردگار کے بارے میں جھگڑنے لگا۔ جب ابراہیم نے کہا میرا پروردگار تو وہ ہے جو جِلاتا ہے اور مارتا ہے۔ وہ بولا کہ جِلا اور مار تو میں بھی سکتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا کہ خدا تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے۔ تم اسے مغرب سے نکال دو (یہ سُن کر) کافر حیران رہ گیا اور خدا بے انصافوں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔

"اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِىْ حَآجَّ اِبْرٰهٖمَ فِىْ رَبِّهٖٓ" اس جملہ میں اس جھگڑا پر تعجب کا اظہار کیا گیا ہے اور جھگڑنے والے کے غرور اور بے عقلی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اس کا نام اس لیے نہیں لیا گیا کہ وہ اس قابل ہی نہیں کہ اس کا نام لیا جاتا۔ البتہ یہ بات یقینی ہے حضرت

لہ سورۃ البقرۃ آیت ۲۵۸

ابراہیم علیہ السلام سے جھگڑا کرنے والا یہ شخص طاغوتِ بابل نمرود تھا جس کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔

اَنْ اٰتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ اسے اس ناشائستہ موقف اختیار کرنے پر اس بات نے اکسایا کہ اسے اس بادشاہت پر غرور ہے، جسے خدا ہی نے اسے بخشا تھا، بجائے اس کے کہ وہ شکر بجالاتا اور دربارِ الٰہی میں سجدہ ریز ہوتا، اُس نے کفر کی راہ کو اختیار کیا، اپنی خدائی کا دعویٰ کیا اور اپنی رعایا سے کہا کہ اللہ تعالیٰ کے بجائے میری عبادت تم پر فرض ہے، گویا حکومت و سلطنت اس کے بے پناہ غرور، زبردست تکبر اور اپنی طاقت و قوت پر اترانے کا سبب تھی۔

اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَ یُمِیْتُ۔ بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ اس مناظرہ میں نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ پوچھا کہ ان بتوں کو توڑنے کا سبب کیا تھا؟ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے بتوں کو اس لیے توڑا کہ وہ اس قابل نہیں کہ ان کی پوجا پاٹ کی جائے، کیونکہ وہ نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ کسی نقصان سے بچا سکتے ہیں، لہٰذا میرے رب کی عبادت کرنا چاہیے جو جلاتا اور مارتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان ارشادات میں درحقیقت نمرود کے لیے بھی ایک طرح کا چیلنج تھا، لہٰذا وہ پکار اٹھا "اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ" میں لوگوں کا بادشاہ ہوں، میں بھی یہ کام کر سکتا ہوں کہ جسے سزائے موت کا حکم دیا گیا ہو، اُس کی سزا ختم کر کے اُسے زندگی بخش دوں اور جسے چاہوں موت کے گھاٹ اتار دوں۔ یہ بات اُس کی کم عقلی کی دلیل تھی، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو انشاء اور تکوین کے بارے میں بات کر رہے تھے، نہ کہ کسی بنائی ہوئی چیز کے بارے میں اسباب اختیار کرنے کی بابت!

"قَالَ اِبْرٰهٖمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ" ——— زندگی و موت سے کیا مراد ہے؟ اس بحث کو چھوڑتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کو خود تخلیق کرنے کے بارے میں چیلنج کر دیا اور پھر یہ چیلنج انسان سے متعلق نہیں، بلکہ سورج کے بارے میں تھا اور فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے،

تو اسے مغرب سے نکال کر دکھا؟ اس سوال کے جواب سے درحقیقت پہلی بات کی بھی مزید وضاحت ہو جاتی ہے۔

فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ یہ سُن کر کافر حیران رہ گیا اور نمرود کو یہ کہاں طاقت تھی کہ سورج کو مغرب سے نکال کر دکھا دیتا، اسے تو ایک مکھی کے پیدا کرنے کی بھی قدرت حاصل نہ تھی۔ وہ حیران رہ گیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوتِ حجت نے اسے مدہوش کر دیا اور ازراہِ تکبر خاموش ہو گیا، کیونکہ وہ حق کو قبول کر لینے کا خواہشمند ہی نہ تھا۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۔

اللہ عزوجل ہی کے قبضۂ اختیار میں سیدھے راستہ کی ہدایت ہے۔ انہوں نے پہلے سے یہ فیصلہ فرما لیا تھا کہ نمرود اور اس کی قوم ظالم اور کافر ہی رہیں گے۔ ان کے فساد و عناد کے باعث اللہ تعالیٰ نے اس بات کو پسند ہی نہ فرمایا کہ یہ ہدایت یافتہ ہوں۔

اس طرح حضرت خلیل الرحمٰن علیہ السلام نے نمرود کی دلیل کو باطل کر دیا۔ اس کی جہالت کو واضح کیا، اس پر حجت کو تمام کر دیا اور اس کی مجلس سے کامیاب و کامران واپس لوٹے

۴۔ حضرت ابراہیمؑ اور ہمارے دَور کے طاغوت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے طاغوت نے دعویٰ کیا تھا: أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ" یعنی میں جس کو چاہوں قتل کرا سکتا ہوں جس کے لئے چاہوں سزائے موت تجویز کروں اور پھر اسے چاہوں تو معاف بھی کر دوں، البتہ اس نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ میں نے آسمان، زمین، انسان، حیوان اور نبات کو پیدا کیا ہے، اسی طرح ہمارے دور کے یہ سرکش لوگ بھی جس کو چاہیں پھانسی کا حکم دیں اور جب چاہیں اس پر عمل درآمد کر گزریں یا اسے معاف کر دیں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے بھی اپنے آپ کو خدا کا شریک بنا رکھا ہے۔ انہوں نے بھی خود ساختہ قانون نافذ کر رکھے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ یہ قانون سازی اُن کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا حق نہیں ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کا یہ سرکش تو کئی سال تک خاموش رہا۔ اس عرصہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام مسلسل بتوں کی بُرائی بیان فرماتے رہے اور نمرود کو سرکشی سے ڈراتے رہے۔ اسی وجہ سے اس سرکش نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے مناظرہ کا پروگرام بنایا اور پھر وہ مناظرہ ہوا جس کو قرب وجوار کے سب لوگوں نے دیکھا اور جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بے مثال کامیابی حاصل ہوئی اور آپ اس جابر و سرکش کی مجلس سے صحیح وسلامت واپس تشریف لے آئے۔

ہمارے آج کے طاغوتوں کی بھی یہی روش ہے کہ وہ زبان بندی کرتے ہیں، آزادیوں کو سلب کرتے ہیں۔ لوگوں کو غلام بناتے ہیں اور جو شخص ان سرکش حکمرانوں میں سے کسی کی مخالفت کرے، وہ چند لمحوں یا چند دنوں بعد جیل کی کال کوٹھڑیوں میں دھکیل دیا جاتا ہے اور اس کے گھر والوں کو بھی یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اسے کہاں رکھا گیا ہے۔ یہ سزا ہے معمولی سی مخالفت کی اور اگر ان سے کوئی مناظرہ کی ٹھان لے تو خدا جانے خشمگیں ہو کر یہ کیا کیا سزا نہ دے ڈالیں!

اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے دور کے یہ جابر و سرکش حکمران اور طاغوت حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کے دور کے طاغوت سے ظلم و استبداد میں آگے بڑھے ہوئے ہیں۔

۵۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت توڑ دیئے

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ اٰتَيْنَآ اِبْرٰهِيْمَ رُشْدَهٗ	اور ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے ہدایت دی تھی
مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهٖ عٰلِمِيْنَ ۝	اور ہم ان (کے حال) سے واقف تھے جب
اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَا	انہوں نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے

هٰذِهِ التَّمَاثِيْلُ الَّتِيْٓ اَنْتُمْ لَهَا
عَاكِفُوْنَ ۔ قَالُوْا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا
لَهَا عٰبِدِيْنَ ۔ قَالَ لَقَدْ كُنْتُمْ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝
قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا بِالْحَقِّ اَمْ اَنْتَ
مِنَ اللّٰعِبِيْنَ ۔ قَالَ بَلْ رَّبُّكُمْ
رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الَّذِيْ
فَطَرَهُنَّ ۖ وَاَنَا عَلٰي ذٰلِكُمْ مِّنَ
الشّٰهِدِيْنَ ۔ وَتَاللّٰهِ لَاَكِيْدَنَّ
اَصْنَامَكُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِيْنَ ۝
فَجَعَلَهُمْ جُذٰذًا اِلَّا كَبِيْرًا
لَّهُمْ لَعَلَّهُمْ اِلَيْهِ يَرْجِعُوْنَ ۝
قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ
اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۔ قَالُوْا
سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ
لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ ۔ قَالُوْا فَاْتُوْا بِهٖ
عَلٰٓي اَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ
يَشْهَدُوْنَ ۔ قَالُوْٓا ءَاَنْتَ فَعَلْتَ
هٰذَا بِاٰلِهَتِنَا يٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۔ قَالَ
بَلْ فَعَلَهٗ ۖ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ
اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۔ فَرَجَعُوْٓا

یہ کہا کہ یہ کیا مورتیں ہیں، جن (کی پرستش) پر تم
معتکف (و قائم) ہو؟ وہ کہنے لگے کہ ہم نے اپنے
باپ دادا کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے (ابراہیم
نے) کہا کہ تم بھی (گمراہ ہو) اور تمہارے باپ
دادا بھی صریح گمراہی میں پڑے رہے، وہ بولے
کیا تم ہمارے پاس (واقعی) حق لاتے ہو، یا
(ہم سے) کھیل کی باتیں کرتے ہو (ابراہیم نے) کہا
(نہیں) بلکہ تمہارا پروردگار آسمانوں اور زمین کا پروردگار
ہے جس نے ان کو پیدا کیا ہے اور میں اس (بات)
کا گواہ (اور اسی کا قائل) ہوں اور خدا کی قسم
جب تم پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے
بتوں سے ایک چال چلوں گا۔ پھر ان کو توڑ کر
ریزہ ریزہ کر دیا، مگر ایک بڑے (بت) کو
(نہ توڑا) تاکہ ▪ اس کی طرف رجوع کریں۔
کہنے لگے کہ ہمارے معبودوں کے ساتھ یہ معاملہ
کس نے کیا؟ وہ تو کوئی ظالم ہے۔ لوگوں نے کہا کہ
ہم نے ایک جوان کو اُن کا ذکر کرتے ہوئے سنا ہے
اسے ابراہیم کہتے ہیں، وہ بولے کہ اسے لوگوں کے
سامنے لاؤ تاکہ وہ گواہ رہیں (جب ابراہیم آئے) تو
بُت پرستوں نے کہا کہ ابراہیم بھلا یہ کام ہمارے
معبودوں کے ساتھ تو نے کیا ہے؟ (ابراہیم نے)

إِلَىٰٓ أَنفُسِهِمْ فَقَالُوٓا۟ إِنَّكُمْ
أَنتُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ۝ ثُمَّ نُكِسُوا۟
عَلَىٰ رُءُوسِهِمْ لَقَدْ عَلِمْتَ
مَا هَٰٓؤُلَآءِ يَنطِقُونَ ۝ قَالَ
أَفَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ مَا
لَا يَنفَعُكُمْ شَيْـًٔا وَلَا يَضُرُّكُمْ ۝
أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِن
دُونِ ٱللَّهِ ۖ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝
قَالُوا۟ حَرِّقُوهُ وَٱنصُرُوٓا۟
ءَالِهَتَكُمْ إِن كُنتُمْ فَٰعِلِينَ ۝
قُلْنَا يَٰنَارُ كُونِى بَرْدًا وَ
سَلَٰمًا عَلَىٰٓ إِبْرَٰهِيمَ ۝ وَأَرَادُوا۟
بِهِۦ كَيْدًا فَجَعَلْنَٰهُمُ ٱلْأَخْسَرِينَ ۝
وَنَجَّيْنَٰهُ وَلُوطًا إِلَى ٱلْأَرْضِ
ٱلَّتِى بَٰرَكْنَا فِيهَا لِلْعَٰلَمِينَ ۝
وَوَهَبْنَا لَهُۥٓ إِسْحَٰقَ وَيَعْقُوبَ
نَافِلَةً ۖ وَكُلًّا جَعَلْنَا صَٰلِحِينَ ۝
وَجَعَلْنَٰهُمْ أَئِمَّةً يَهْدُونَ
بِأَمْرِنَا وَأَوْحَيْنَآ إِلَيْهِمْ
فِعْلَ ٱلْخَيْرَٰتِ وَإِقَامَ ٱلصَّلَوٰةِ
وَإِيتَآءَ ٱلزَّكَوٰةِ ۖ وَكَانُوا۟

کہا بلکہ یہ اُن کے اس بڑے (بُت) نے کیا
(ہوگا) اگر یہ بولتے ہیں، تو ان سے پوچھ لو۔
انہوں نے اپنے دل میں غور کیا، تو آپس میں
کہنے لگے بیشک تم ہی بے انصاف ہو۔ پھر
(شرمندہ ہوکر) سر نیچا کر لیا (اس پر بھی ابراہیم سے
کہنے لگے کہ) تم جانتے ہو یہ بولتے نہیں (ابراہیم
نے) کہا کہ پھر تم خدا کو چھوڑ کر کیوں ایسی چیزوں کو
پوجتے ہو جو نہ تمہیں کچھ فائدہ دے سکیں اور نہ
نقصان پہنچا سکیں؟ تف ہے تم پر اور جن
کو تم خدا کے سوا پوجتے ہو اُن پر، کیا تم عقل نہیں
رکھتے (تب وہ) کہنے لگے کہ اگر تمہیں (اس سے
اپنے معبود کا انتقام لینا اور) کچھ کرنا ہے تو اس
کو جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔ ہم نے
حکم دیا کہ اے آگ سرد ہو جا اور ابراہیم پر (موجب)
سلامتی (بن جا) ان لوگوں نے بُرا تو ان کا چاہا
تھا، مگر ہم نے انہی کو نقصان میں ڈال دیا اور ابراہیم
اور لوط کو اس سرزمین کی طرف بچا نکالا، جس
میں ہم نے اہل عالم کے لیے برکت رکھی تھی
اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق عطا کیے اور مستزاد
برآں یعقوب، اور سب کو نیک کیا اور ان کو پیشوا
بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ان کو

لَنَا عَابِدِیْنَ ۝ [1] نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا اور وہ ہماری عبادت کیا کرتے تھے

وَتَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ ۝ [2]

ابراہیم علیہ السلام کی قوم ہر سال شہر سے باہر کھلے میدان میں جاکر ایک سالانہ میلہ منایا کرتی تھی [3] ایک دفعہ آپ کے والد اور قوم کے دیگر لوگوں نے آپ کو بھی اس میلے میں شرکت کی دعوت دی، تو آپ نے فرمایا کہ میں بیمار ہوں، اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا،

فَنَظَرَ نَظْرَۃً فِی النُّجُوْمِ ۝ تب انہوں نے ستاروں کی طرف ایک نظر کی

فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ۝ [4] اور کہا میں تو بیمار ہوں۔

آپ نے کلام میں تعریض سے کام لیا اور بتوں کی اہانت جو آپ کا مطلوب و مقصود تھا اسے بھی آپ نے پالیا اور اللہ تعالیٰ کے دین حق کی نصرت و اعانت بھی فرمادی۔ یہ لوگ آپ کو اپنے حال پر چھوڑتے ہوئے اپنے میلے میں شرکت کے لیے چلے گئے۔ اگر انہیں علم ہوتا کہ ان کے جانے کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام ان کے بتوں کو پاش پاش کردیں گے تو وہ کبھی بھی آپ کو چھوڑ کر نہ جاتے۔

آپ نے جو یہ فرمایا تھا: "وَتَاللّٰہِ لَاَکِیْدَنَّ اَصْنَامَکُمْ بَعْدَ اَنْ تُوَلُّوْا مُدْبِرِیْنَ" اس سلسلہ میں ایک قول یہ ہے کہ یہ بات آپ نے آہستہ سے اپنے جی ہی میں کہی تھی۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان میں سے بعض لوگوں نے اسے سن بھی لیا تھا۔

فَجَعَلَھُمْ جُذٰذًا اِلَّا کَبِیْرًا لَّھُمْ لَعَلَّھُمْ اِلَیْہِ یَرْجِعُوْنَ ۝

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو موقع مل گیا تو آپ فوراً ان کے بت خانے کی طرف چلے گئے آپ

---

[1] سورۃ الانبیاء، آیت ۵۱ - ۷۳، [2] آیت ۵۱ - ۵۶ کی تفسیر قبل ازیں بیان کی جاچکی ہے۔

[3] معلوم ہوتا ہے کہ قوم ابراہیم کا یہ میلہ اور عید کچھ اس قبیل کا تھا جیسے آجکل یوم استقلال، مزدور ڈے، یا یوم پیدائش وغیرہ کے پروگرام بنائے جاتے ہیں [4] سورۃ الصافات، آیت ۸۸ - ۸۹

نے وہاں عجیب منظر دیکھا کہ تقرب کے حصول کے لیے بُت پرستوں نے لکڑی اور پتھر کے بنائے گئے بُتوں کے سامنے طرح طرح کے کھانے رکھے ہوئے ہیں۔ آپ نے ازراہِ طنز و مذاق اُن سے یہ کہا[1]

فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۝ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۝ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًاۢ بِالْيَمِيْنِ ۝[2]

آپ کے دستِ مبارک میں اس وقت تیشہ تھا، آپ نے اُس کے ساتھ ان بُتوں کو پاش پاش کر دیا، صرف ایک بڑے بُت کو رہنے دیا۔ بعض نے کہا ہے کہ آپ نے تیشہ بڑے بُت کے ہاتھ پر رکھ دیا، یہ اشارہ اس طرف تھا کہ بڑے بُت کو اس بات سے غیرت آئی کہ اس کے ساتھ ساتھ ان چھوٹے چھوٹے بُتوں کی بھی پوجا کی جائے۔

قَالُوْا مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ اِنَّهٗ لَمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ قَالُوْا سَمِعْنَا فَتًى يَّذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهٗٓ اِبْرٰهِيْمُ۔

لوگ جب میلے ٹھیلے سے واپس گھر آئے، تو اپنے بُتوں کو پاش پاش دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئے، مگر تقلید اور جمود نے انہیں اندھا کر دیا تھا کہ یہ سوچتے کہ بُت جب اپنے آپ سے کسی مصیبت کو دُور نہیں کر سکتے تو کسی اور سے کیا کریں گے؟ ہر زبان پر سوال یہ تھا، مَنْ فَعَلَ هٰذَا بِاٰلِهَتِنَآ ؟ (ہمارے خداؤں کا یہ بُرا حشر کِس نے کیا ہے؟) یہ تو ایک بڑی مصیبت اور بڑا ہولناک حادثہ ہے۔ اتنا بڑا حادثہ کہ تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور اتنا زبردست واقعہ جس نے ان کے عقائد کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔

نمرود کی پولیس نے اب اس واقعہ، جسے وہ ناقابلِ معافی جرم قرار دے رہے تھے، کی تحقیق کر کے مجرم کا سُراغ لگانا شروع کر دیا، گواہوں سے گواہی لینا شروع کر دی۔ نظریں بار بار حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اُٹھ رہی تھیں، کیونکہ آپ ہمیشہ ان بُتوں کی بُرائی بیان

---

[1] قصص الانبیاء، ابن کثیر ۱۷۸ [2] سورۃ الصافات، ۹۱ - ۹۳

فرماتے رہتے تھے۔ بالآخر کہنے لگے:

"فَأْتُوا بِهِ عَلَىٰ أَعْيُنِ النَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَشْهَدُونَ ٥"

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام کو بھی اس کا پہلے سے اندازہ تھا، ہر ہر طرف سے لوگوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ چلے آ رہے تھے تاکہ وہ عدالت کی کارروائی دیکھیں اور اس شخص کی باتیں بھی سنیں، جس نے اُن کے خداؤں کا یہ حشر کیا تھا، انہی کافر جماعتوں کے وسط میں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی کھڑے تھے، بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ، عزیمت کا پہاڑ اور استقامت کا کوہِ گراں بنے ہوئے کہ کافروں کی بڑی بڑی دھمکیاں بھی آپ کے پائے استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہ کر سکیں۔

قَالُوٓا ءَأَنتَ فَعَلْتَ هَٰذَا بِـَٔالِهَتِنَا يَٰٓإِبْرَٰهِيمُ ٥ قَالَ بَلْ فَعَلَهُۥ كَبِيرُهُمْ هَٰذَا فَسْـَٔلُوهُمْ إِن كَانُوا۟ يَنطِقُونَ ٥

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ کیوں کہا کہ اسے اِن کے بڑے بُت نے یہ کیا ہے اور یہ کیوں نہیں فرمایا کہ تمہارے ان بتوں کا یہ بُرا حشر میں نے کیا ہے؟ اور پھر کیا آپ کا یہ فرمانا اور اپنے آپ کو بیمار کہنا اور حضرت سارہ کو اپنی بہن بتلانا اس کذب کے قبیل میں سے ہے، جس سے توبہ کرنا فرض ہو جاتا ہے اور جو عصمت انبیاء کے منافی ہے؟

پہلے ہم اس مسئلہ سے متعلق صحیح احادیث ذکر کریں گے۔ اہل سنت کے موقف کی وضاحت اور پھر اپنی بات کی تائید و تصدیق کے لیے ثقہ اور قابلِ اعتماد علماء کے اقوال پیش کریں گے۔

ومن اللہ وحدہٗ نستمد العون والتوفیق!

حدیثِ اوّل:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین بار کذب سے کام لیا اور حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین بار کذب سے کام لیا۔ ان میں سے دو تو اللہ عزوجل کے لیے تھے

ایک اِنِّیْ سَقِیْمٌ (میں بیمار ہوں) کہنا اور دوسرا بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا (بلکہ اسے تو ان کے اس بڑے نے کیا ہے) کہنا۔ اسی طرح آپ نے بیان کیا کہ ایک دفعہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کا گزر ایک جابر بادشاہ کے پاس سے گزر ہوا۔ اس سرکش بادشاہ کو یہ اطلاع دے دی گئی تھی کہ اس شخص کے پاس بہت ہی خوبصورت عورت ہے۔ اُس نے آپ کی طرف پیغام بھیجا اور پوچھا کہ یہ عورت کون ہے؟ آپ نے فرمایا "میری بہن ہے۔" پھر آپ حضرت سارہ کے پاس آئے اور فرمایا "سارہ! اس وقت روئے زمین پر میرے اور آپ کے سوا اور کوئی مومن نہیں ہے اور اس ظالم نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا تو میں نے کہا کہ تم میری بہن ہو، لہٰذا میری بات کی تکذیب نہ کرنا۔" اس ظالم نے حضرت سارہ کو اپنے پاس بلایا۔ جب آپ گئیں تو اُس نے دست درازی کی کوشش شروع کی، مگر وہ جکڑ دیا گیا، تو اُس نے حضرت سارہ کی خدمت میں عرض کی کہ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دُعا کرو، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔ حضرت سارہ نے اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمائی تو اسے چھوڑ دیا گیا، مگر اس نے دوبارہ پھر حضرت سارہ کو پکڑنا چاہا، تو اسے پھر جکڑ دیا گیا، اُس نے دوبارہ پھر آپ سے یہ کہا کہ میرے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا کرو، میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا، آپ نے دُعا کی تو اُسے چھوڑ دیا گیا۔ اُس نے اپنے دربانوں میں سے ایک کو بلایا اور کہا کہ تم میرے پاس کسی انسان کو نہیں، بلکہ شیطان کو لے کر آئے ہو۔ اُس بادشاہ نے حضرت سارہؑ کو خدمت کے لیے ہاجرہ دے دی۔ آپ ہاجرہ کو لے کر آئیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔ آپ نے ہاتھ کے اشارے سے پوچھا کیا خبر ہے؟ تو حضرت سارہ نے جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے کافر و فاجر کی چال کو ناکام کر دیا اور خدمت کے لیے ہاجرہ دے دی۔

حضرت ابوہریرہؓ یہ حدیث بیان کرنے کے بعد فرمایا کرتے تھے "یہ تھیں تمہاری امی جان، اے آسمان کے پانی کے بیٹو!"[1] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ عرب کے لوگوں کو اس لقب سے اس لیے یاد

---

[1] اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں روایت کیا ہے۔ فتح الباری: ۶/۲۰۰، الحلبی؛ امام مسلم نے "الفضائل" میں مرفوعاً روایت کیا ہے۔ نیز احمد و ترمذی نے بھی اسے روایت کیا ہے اور امام ترمذی نے اسے حسن صحیح قرار دیا ہے۔

کرتے کہ وہ صحرانشیں تھے اور وہ ایسی جگہوں کی طرف نقلِ مکانی کرتے رہتے تھے، جہاں بارش کے باعث گھاس پھوس اور چارہ وغیرہ مل جائے تاکہ وہ اپنے جانوروں کو چرا سکیں۔

یہ حدیث اس شخص کی بھی دلیل ہے جو یہ کہتا ہے کہ تمام عرب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ ماء سماء سے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مراد زمزم ہے کیونکہ زمزم کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کے لیے پیدا فرمایا تھا اور آپ کے صاحبزادے نے اسی پانی سے پرورش پائی تھی تو جملہ عرب گویا اسی پانی کی اولاد ہوئے۔

امام ابن حبان اپنی "صحیح" میں فرماتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد میں سے ہر شخص کو آسمان کے پانی کا بیٹا کہا جائے گا، کیونکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے آبِ زمزم کے ساتھ پرورش پائی تھی اور آبِ زمزم آسمانی پانی ہے۔ [1]

حدیث دوم:

حدیثِ شفاعت یعنی قیامت کے دن فیصلوں کے بارے میں جو ایک لمبی حدیث ہے، اس میں ہے کہ لوگ ایک ایک نبی کے پاس جا کر مطالبہ کریں گے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی شفاعت کریں۔ اسی حدیث میں یہ بھی مذکور ہے کہ جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئیں گے تو کہیں گے اے ابراہیم! آپ اللہ کے نبی اور اہل زمین میں سے اس کے دوست ہیں لہٰذا اپنے رب کے پاس ہماری شفاعت کریں۔ آپ دیکھ نہیں رہے کہ ہم کس مصیبت میں پھنسے ہوئے ہیں؟ آپ انہیں جواب دیں گے کہ آج میرا رب اس قدر غصے میں ہے کہ آج سے پہلے کبھی اس طرح غصے نہیں ہوا اور نہ کبھی اس کے بعد اس طرح غصے میں ہوں گے۔ میں نے تین بار کذب سے کام لیا تھا۔

ابن حبان نے یہاں ان کذباتِ ثلاثہ کی تفصیل بھی بیان کی ہے ــــــ نفسی، نفسی، نفسی (مجھے اپنی جان کی پڑی ہوئی ہے) تم میرے سوا کسی اور کے

---

[1] فتح الباری ۳-۲/۷

پاس چلے جاؤ، جاؤ موسیٰ کے پاس چلے جاؤ ...... [1]

اب ہم اختصار کے ساتھ ذیل میں اہلِ سنت کے موقف کو بیان کریں گے۔ آپ نے جو یہ فرمایا:

بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَاسْئَلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ	(ابراہیم نے) کہا، بلکہ یہ اُن کے ان بڑے (بت) نے کیا (ہوگا) اگر یہ بولتے ہیں، تو اُن سے پوچھ لو

یعنی اگر یہ بت بول سکتے ہیں، تو پھر ان کے بڑے نے یہ کام سرانجام دیا ہوگا اور آپ کی قوم یہ بات بخوبی جانتی تھی کہ آپ کا ایمان اور اعتقاد یہ ہے کہ ان کے یہ بت نہ بولتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں جیسا کہ آپ نے اپنے باپ سے مخاطب ہو کر یہ فرمایا تھا،

يٰٓاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِىْ عَنْكَ شَيْئًا ٥	ابا! آپ ایسی چیزوں کو کیوں پوجتے ہیں جو نہ سنیں اور نہ دیکھیں اور نہ آپ کے کچھ کام آسکیں

نیز فرمایا:

هَلْ يَسْمَعُوْنَكُمْ اِذْ تَدْعُوْنَ ٥ اَوْ يَنْفَعُوْنَكُمْ اَوْ يَضُرُّوْنَ ٥	کیا یہ تمہاری باتوں کو سن سکتے ہیں، جب تم انہیں پکارتے ہو یا تمہیں (کچھ) نفع و نقصان پہنچا سکتے ہیں۔

اسی طرح جب آپ نے ان سے کہا کہ اپنے ہی بتوں سے پوچھو تو انہوں نے جواب دیا تھا،

---

[1] امام بخاریؒ نے اس حدیث کو اپنی صحیح کے مختلف ابواب میں متعدد طرق سے بیان کیا ہے۔ سورۃ بقرہ کی تفسیر میں بروایتِ انسؓ، سورۃ بنی اسرائیل کی تفسیر میں بروایتِ ابوہریرہؓ۔ متن میں جن الفاظ کو بیان کیا گیا ہے یہ اسی روایت کے ہیں۔ فتح الباری ۳۹۵/۸ مطبعہ سلفیہ ـــــ کتاب الرقاق میں بروایتِ انسؓ، کتاب التوحید میں حضرت انسؓ کی دو سندوں سے مسلم نے اسے بروایتِ ابوہریرہؓ و حذیفہؓ، امام احمد نے انس و ابن عباس کی دو دو سندوں کے ساتھ ابن خزیمہ نے بروایتِ انسؓ، حاکم نے بروایتِ ابن مسعودؓ طبرانی نے بروایت عبادہؓ بن صامت ابن ابی شیبہ نے بروایتِ سلمان فارسی اور ترمذی نے بروایتِ ابوہریرہؓ بیان کیا ہے (حاشیہ قصص الانبیاء)

لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۤءِ يَنْطِقُوْنَ آپ جانتے ہیں کہ یہ تو بولتے ہی نہیں۔

تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس جواب سے قوم یہ سمجھ گئی تھی کہ آپ ہی نے بتوں کو توڑا ہے، یعنی جب وہ بول نہیں سکتے، تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو توڑ بھی نہیں سکتے۔

۲۔ مناظرہ میں یہ بات جائز ہوتی ہے کہ مناظر اپنے مدِ مقابل کے قول کو اسی طرح تسلیم کرے اور پھر دلیل و برہان کے ساتھ اس کی تردید کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی اسلوب کو اختیار فرمایا، کیونکہ جب آپ کی قوم نے اس بات کا اعتراف کر لیا کہ ان کے یہ خدا تو بول ہی نہیں سکتے، تو آپ نے پھر فوراً انہیں یہ جواب دیا:

اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ	تم خدا کو چھوڑ کر کیوں ایسی چیزوں کو پوجتے ہو،
مَا لَا يَنْفَعُكُمْ وَلَا يَضُرُّكُمْ	جو نہ تمہیں کچھ فائدہ دے سکیں اور نہ نقصان پہنچا
اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ	سکیں۔ تف ہے تم پر اور جن کو تم خدا کے سوا
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔	پوجتے ہو اُن پر!

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اس جواب کے ذریعہ ان پر ایسی حیرت طاری کر دی، جس کی کوئی مثال نہ تھی، انہیں خود یہ محسوس ہونے لگا کہ ان کے عقائد کمزور ہیں اور ان کے حکمران شکست خوردہ ہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا	انہوں نے اپنے دل میں غور کیا، تو آپس میں کہنے
اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ ثُمَّ	لگے بیشک تم ہی بے انصاف ہو، پھر (شرمندہ
نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ لَقَدْ	ہو کر) سر نیچا کر لیا (اس پر بھی ابراہیم سے کہنے لگے
عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۤءِ يَنْطِقُوْنَ	کہ) تم جانتے ہو، یہ بولتے نہیں۔

بعض نے بعض کی طرف اس طرح دیکھا کہ ان کے دلائل ختم ہو گئے ہیں اور ان کے بجائے ان کے مدِ مقابل کے دلائل صحیح اور قوی ہیں۔

فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ بیشک تم ہی بے انصاف ہو۔

یعنی ایسے بے جان بتوں کی عبادت کر کے جو نہ بول سکتے ہیں، نہ سُن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں، تم اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہو، لیکن!

ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ پھر (شرمندہ ہو کر) انہوں نے سر نیچا کر لیا۔

اس کا سبب جہالت پر ندامت یا اپنے باطل موقف پر اصرار تھا۔

۳۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ فرمانا کہ:

بَلْ فَعَلَهٗ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا يَنْطِقُوْنَ ۝

بطور توریہ تھا، یعنی آپ کا اشارہ صحیح مقصود ہی کی طرف تھا، اگرچہ مخاطب اسے بظاہر کذب سمجھتا ہے، مگر آپ کی طرف سے اس میں کچھ کذب نہ تھا۔ اسی طرح آپ نے جو یہ فرمایا تھا کہ اِنِّیْ سَقِیْمٌ تو آپ اپنی قوم کی بت پرستی کے باعث رُوحانی مریض تھے اور بلاشبہ ایک مومن داعی جب اپنی قوم کو جہالت و شرک میں سرگشتہ و حیران دیکھتا ہے تو وہ غم و حزن اور مرض میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اسی طرح حضرت سارہ کو جو آپ نے بہن کہا تو یہ اُخوتِ اسلامی کی بنیاد پر تھا اور اس کی دلیل یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارہ سے کہا تھا کہ اس وقت رُوئے زمین پر میرے اور تیرے سوا اور کوئی مومن نہیں ہے اور اس سرکش نے مجھ سے آپ کے بارے میں پوچھا ہے، تو میں نے کہا ہے کہ تو میری بہن ہے لہٰذا میری تکذیب نہ کرنا۔ یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مقصود اخوتِ عقیدہ و دین تھا، جیسا کہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ سب مومن آپس میں بھائی بھائی ہیں

آپ کی مراد اُخوتِ نسب نہ تھی، یہ گویا شرعی تعریض کے قبیل سے تھی جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان فی معاریض الکلام مندوحۃ عن الکذب[1] — تعریضاتِ کلام جھوٹ سے بچنے کا ذریعہ ہیں

علامہ جوہری تعریضات کے بارے میں لکھتے ہیں کہ تعریض، خلافِ تصریح کو کہتے ہیں، یعنی ایک چیز کے ساتھ کسی دوسری چیز سے توریہ کرنا۔

امام راغب فرماتے ہیں کہ تعریض ایسے کلام کو کہتے ہیں جس کے دو پہلو ہوں ایک صدق کا اور دوسرا کذب کا یا ایک پہلو باطن کا اور دوسرا ظاہر کا۔[2]

حضرت سارہ کے اس جبار و سرکش حکمران کے ساتھ واقعہ پر مبنی ایک حدیث کی شرح میں حافظ ابن حجر عسقلانیؒ لکھتے ہیں کہ اس حدیث سے اسلامی اخوت کی مشروعیت ثابت ہوتی۔ نیز معلوم ہوا کہ کلام میں تعریض سے کام لینا بھی جائز ہے۔[3]

۴۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ بعض حالات میں کذب بیانی سے کام لینا بھی جائز ہے، چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ کلام مقاصد تک پہنچنے کا ایک وسیلہ ہے تو ہر وہ مقصود محمود جس تک کذب کے بغیر پہنچنا ممکن ہو، اس میں جھوٹ بولنا حرام ہے اور اگر جھوٹ کے بغیر ناممکن ہو تو پھر جھوٹ بولنا جائز ہے اور اگر اس مقصود کو حاصل کرنا مباح ہو تو کذب بھی مباح اور واجب ہو تو کذب بھی واجب ہوگا، مثلاً جب کوئی مسلمان کسی ایسے ظالم شخص سے چھپ گیا ہو جو اسے قتل کرنا چاہتا ہو یا اس کے مال کو چھیننا چاہتا ہو اور وہ اپنے مال کو چھپا لے تو کسی سے جب اس شخص کے بارے میں پوچھا جائے، تو اسے چھپانے کے لیے جھوٹ بولنا واجب ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی شخص کے پاس کوئی مال رکھا ہوا ہو اور کوئی ظالم اس سے چھیننا چاہتا ہو تو اس

---

[1] بخاری، ادب المفرد، بروایت عمران بن حصین، ادب المفرد ہی کی ایک دوسری روایت جو کہ بطریق ابی عثمان مہدی از حضرت عمرؓ ہے، میں یہ الفاظ ہیں "اما فی المعاریض ما یکفی المسلم من الکذب" اسے طبری نے "تہذیب" میں اور طبرانی نے "کبیر" میں روایت کیا ہے، اس کے رجال ثقہ ہیں۔ فتح الباری ۱۳/۲۱۶ [2] ایضاً [3] ایضاً، ۷/۲۰۴

مال کے مخفی رکھنے کے بارہ میں جھوٹ بولنا واجب ہوگا۔ لیکن ان سب صورتوں میں احتیاط اس میں ہے کہ آدمی کذب کے بجائے توریہ سے کام لے۔ توریہ کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا اپنی عبارت سے صحیح مقصود ہو اور اس کی نسبت سے جھوٹ نہ ہو، اگرچہ بظاہر الفاظ اور اس مفہوم کے اعتبار سے جسے مخاطب سمجھ رہا ہو، وہ جھوٹ ہی ہو، اگر کوئی توریہ کو ترک کرکے اس حال میں مطلقاً کذب کو اختیار کرے تو حرام نہیں۔

علماء کرام نے اس حال میں جوازِ کذب کے سلسلہ میں حدیث ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے استدلال کیا ہے کہ انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سُنا،

لیس الکذاب الذی یصلح بین الناس فینمی خیرًا او یقول خیرًا (متفق علیہ)

وہ شخص کذاب نہیں ہے جو لوگوں کے مابین صُلح کراتا ہے، اچھی باتوں کو منسوب کرتا ہے یا اچھی بات کہتا ہے۔

مسلم شریف کی ایک روایت میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ ام کلثومؓ سے روایت ہے کہ میں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں سُنا کہ آپ نے تین قسم کی باتوں کے علاوہ اور کسی میں رخصت دی ہو (۱) جنگ (۲) لوگوں کے مابین صلح اور (۳) آدمی کی اپنی بیوی سے گفتگو یا بیوی کی اپنے خاوند سے گفتگو۔ [۱]

حافظ ابن حجرؒ "فتح الباری" میں اس حدیث کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ میاں بیوی کو جو کذب کی اجازت ہے، تو یہ اس صورت میں ہے جبکہ دونوں میں سے کسی ایک کا حق ساقط نہ ہوتا ہو یا ایسی چیز کو لے لینا لازم نہ آتا ہو جس کا انہیں حق حاصل نہ ہو، اسی طرح بحالتِ جنگ اجازت ہے۔ امن کی صورت میں اجازت نہیں۔ اسی طرح اس بات پر بھی علماء کا اتفاق ہے کہ اضطراری حالت میں کذب بیانی جائز ہے جیسے کہ مثلاً کوئی ظالم کسی شخص کو قتل کرنے کے درپے ہو اور وہ کسی کے پاس چھپا ہوا ہو تو وہ کہہ سکتا ہے کہ

---

[۱] ریاض الصالحین، امام نووی، بیان مایجوز من الکذب ص ۵۰۵، مکتب اسلامی

میرے پاس نہیں ہے، بلکہ وہ قسم کھا کر بھی کہہ سکتا ہے، اس حالت میں کذب اور جھوٹی قسم کھانے پر بھی وہ گناہگار نہ ہوگا۔ واللہ اعلم۔[1]

یہ کذباتِ ثلاثہ جن کا حضرت ابراہیمؑ سے صدور ہوا، ان کی بابت خاتم الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ ان میں سے دو تو ذاتِ باری تعالیٰ کے لیے تھے، یعنی:

(۱) اِنِّیْ سَقِیْمٌ اور (۲) بَلْ فَعَلَہٗ کَبِیْرُھُمْ ھٰذَا۔ اس میں دو کے بارے میں صراحت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے تھے، اسی طرح تیسرا کذب یعنی حضرت سارہ کو بہن کہنا اگرچہ ایک طرح سے یہ اپنے لیے تھا، مگر اس کے بھی اللہ کے لیے ہونے پر وہ حدیث دلالت کناں ہے جسے امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سارہ کے بارے میں جو یہ کہا کہ یہ میری بہن ہے تو یہ بھی آپ نے اللہ تعالیٰ ہی کے لیے کہا تھا۔[2]

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ ہشام بن حسان کی مذکورہ روایت میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے صرف تین بار کے علاوہ اور کبھی بھی کذب بیانی سے کام نہیں لیا، اور یہ تین کذب بھی محض اللہ تعالیٰ ہی کی خاطر تھے۔

مسندِ احمد میں بروایت ابن عباسؓ ہے کہ آپ نے ان کذبات کو بھی اللہ تعالیٰ کے دین ہی کے لیے استعمال کیا۔

علامہ منذری نے اپنے حاشیہ "سنن" میں بعض اہلِ کتاب سے نقل کیا ہے کہ اس ظالم بادشاہ کی یہ عادت تھی کہ اس وقت تک کسی شادی شدہ عورت کو استعمال نہیں کرتا تھا جب تک اس کے خاوند کو قتل نہ کر دیتا، اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا کہ یہ میری بہن ہے کیونکہ اگر یہ عادل ہوگا، تو آپ سے اس کا رشتہ مانگے گا اور آپ کو امید تھی کہ اسے ٹال دیں گے اور اگر وہ ظالم ہوگا، تو آپ اُس کے ہاتھوں قتل سے نجات پا جائیں گے۔[3]

---

[1] فتح الباری ۶/۲۲۸ مطبعۃ الحلبی [2] صحیح بخاری ۳۰۵/۱۱ [3] فتح الباری ۲۰۱/۷۔ ہشام بن حسان کی روایت کو نسائی، بزار اور ابن حبان نے بیان کیا ہے۔

اگرچہ یہ کذباتِ ثلاثہ مشروع اور جائز تھے اور اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کے لیے تھے، مگر ان سے آپ کا مرتبہ متاثر ہوا اور آپ مقام و مرتبہ کے اعتبار سے حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے کم رہے اور آپ نے حیاء محسوس کی جیسا کہ حدیثِ شفاعت میں وارد ہے، کیونکہ انبیاء کرام تو جلال و جبروتِ الٰہی کے باعث ایسی باتوں سے بھی ڈرتے ہیں جن سے دوسرے لوگ نہیں ڈرتے

بہر آئینہ دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والوں کی ازبس یہ کوشش ہونی چاہیے کہ ان کے اقوال و افعال حق و صداقت پر مبنی ہوں اور انہیں اس فتنہ سے ہمیشہ ڈرتے رہنا چاہیے جس میں صرف ظالم لوگ ہی مبتلا نہیں ہوتے۔ اس بات سے دل خون کے آنسو روتا ہے کہ بعض دعاۃ و مبلغین نے مصلحت و سلامتی کا نام دے کر تعریضات کو بڑے وسیع پیمانے پر استعمال کرنا شروع کر دیا ہے، حالانکہ مصلحتِ دعوت کا تو تقاضا ہی یہ ہے کہ انسان کلی طور اپنے تئیں احکامِ الٰہی کا پابند کر دے، انبیاء و مرسلین کے نقشِ قدم پر چلے۔ داعیانِ دین کو دنیا میں لوگوں کی طرف سے جو ایذا بھی پہنچے؟ وہ اس سزا کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی جو قیامت کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ظالموں کو ملے گی۔ ہماری حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقابلہ میں کیا حیثیت ہے، جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِبْرٰهِيْمَ ؕ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا ۝

اور کتاب میں ابراہیم کو یاد کرو، بے شک وہ سچے پیغمبر تھے۔

نیز فرمایا ہے:

وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى ۝

اور ابراہیم جنہوں نے (حق و رسالت) کو پورا کیا

ان فضائل و مناقب کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے ان کذباتِ ثلاثہ سے ڈریں گے جو اللہ تعالیٰ ہی کی رضا کے لیے تھے اور ان پر آپ کو اجر و ثواب بھی ملا ہوگا، لیکن اس کے باوصف بھی آپ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوں گے، تو ہم میں سے بھی ہر شخص کو اپنا محاسبہ خود کرنا چاہیئے۔ اللہ سے ڈرنا چاہیے اور اس بات کو کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ اس وقت تک کسی

قوم کی حالت نہیں بدلتے، جب تک وہ خود اپنی حالت بدلنے پر آمادہ نہ ہو!

۵۔ ارشادِ باری تعالیٰ، بَلْ فَعَلَهُ كَبِيْرُهُمْ هٰذَا کی تفسیر میں سلسلۂ کلام کچھ دراز ہو گیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان کذباتِ ثلاثہ کی نسبت اہلِ سنّت کا جو موقف ہے، اس کی وضاحت سے درحقیقت دو قسم کے لوگوں کی تردید مقصود ہے:

(ا) معتزلہ اور ان کے نقشِ قدم پر چلنے والے لوگ جن کا یہ خیال ہے کہ یہ احادیث اگرچہ صحیح الاسناد ہیں، لیکن یہ حجت نہیں ہیں، کیونکہ یہ اخبار آحاد ہیں۔

جدید مصنفین میں سے جو لوگ اس قسم کے باطل افکار سے متاثر ہیں، ان میں سے شیخ عبدالوہاب نجار بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں، جنہوں نے اپنی کتاب قصص الانبیاء[1] کے بہت سے صفحے سیاہ کر کے کذباتِ ثلاثہ کی ان احادیثِ نبویہ کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ اخبار آحاد ہیں، حالانکہ یہ من حیث المعنی متواتر ہیں، کیونکہ کتاب اللہ کے بعد صحیح ترین کتاب صحیح بخاری میں وارد ہیں۔

(ب) بعض غالی لوگوں کا خیال ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام (نعوذ باللہ) اسلام سے مُرتد ہو گئے تھے، کیونکہ انہوں نے کذب بیانی کی۔ اس قسم کے بے دین لوگوں کے اقوال جاہل لوگوں میں خوب پھیلے ہوتے ہیں، کیونکہ جہالت تو ہر انحراف اور بے دینی کے لیے سازگار ماحول فراہم کرتی ہے۔ اس قسم کے جاہل لوگوں کی باتیں زبانی کلامی اور سینہ بسینہ ہی پھیلتی ہیں۔ ویسے بحمداللہ انہیں کتابوں اور رسالوں وغیرہ میں ان کے لکھنے کی قدرت نہیں ہو سکی۔ اس قسم کے باطل فرقوں کو کبھی بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی۔

---

[1] نجار کی کتاب "قصص الانبیاء" میں بہت سی ایسی باتیں ہیں جن میں وہ صحیح عقائد سے منحرف ہو گیا ہے، ان میں سے امورِ عقائد میں احادیثِ آحاد کی تردید اور عقل کی نقل پر فوقیت وغیرہ بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ نجار کا زیادہ تر انحصار اہلِ کتاب کے لٹریچر پر ہے۔ بحمداللہ کئی ثقہ علماء نے اس کی تردید کرتے ہوئے اس کی بہت سی فروگذاشتوں کی نشان دہی فرمائی ہے۔

معتزلہ اور دیگر گمراہ فرقوں کے اقوال سے صرفِ نظر بھی کرلیں، تو اہلِ سنت کے بعض مراجع ایسے ہیں کہ ان میں بھی یہ مسئلہ نظرِ ثانی کا محتاج ہے، چنانچہ استاذ سید قطب شہیدؒ لکھتے ہیں:

"اس مبنی بر مذاق جواب میں تحکم واضح ہے، لہٰذا اس بات کی کوئی ضرورت نہیں کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جھوٹ قرار دیا جائے۔ لیکن سوال یہ ہے اس کے علل واسباب کیا تھے؟ علل واسباب بہت تھے جو کہ مفسرین نے بیان کیے ہیں"[1]

یہ درست کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں مذاق کا پہلو واضح ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے کذب سے موسوم فرمایا ہے، بلکہ خود ابراہیم علیہ السلام نے اسے کذب سے تعبیر فرمایا ہے جیسا کہ اس حدیث شفاعت میں ہے، جسے امام بخاریؒ نے اپنی "صحیح" میں بیان فرمایا ہے۔ سید قطب رحمہ اللہ کو چاہیئے تھا کہ وہ یہاں ان صحیح احادیث کو بھی نقل کرتے جو اس موضوع سے متعلق کتب حدیث میں موجود ہیں اور پھر بعض حالات میں جوازِ کذب پر روشنی ڈالتے، لیکن ہم محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے یہاں عدد رجہ اختصار سے کام لیا ہے اور جتنی بات لکھی ہے، اس میں بھی قلم ڈگمگا گیا ہے، اگرچہ آپ کے کلام میں غلو یا اعتزال نہیں ہے۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ۔

۶۔ بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق

اس دن حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے اعتراف کیا کہ وہ خود ہی بے انصاف ہیں، کیونکہ وہ ایسے بتوں کی عبادت کرتے ہیں جو نہ بول سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں۔ یہ پہلی مرتبہ انہوں نے بتوں کی عاجزی و درماندگی کے بارے میں سوچا تھا، البتہ ان کے دلوں کی اس بیداری کی عمر چند لمحوں سے زیادہ نہ تھی، پھر شیطانی آواز ان میں سرایت کر گئی، کفر پر بدستور اصرار شروع

---

[1] فی ظلال القرآن ۵/۴۰، جزء ۱۷

کر دیا اور انہوں نے یہ ظالمانہ قرارداد پاس کی:

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا آلِهَتَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ فَاعِلِينَ ٥

کہنے لگے کہ اگر تمہیں (اس سے اپنے معبود کا انتقام لینا اور) کچھ کرنا ہے، تو اس کو جلا ڈالو اور اپنے معبودوں کی مدد کرو۔

اہلِ باطل کا یہی ہتھیار ہے جسے وہ انبیاء کرام، مرسلین عظام اور حامیانِ دین کے مقابلہ میں ہر دور اور ہر جگہ استعمال کرتے آئے ہیں کہ جب علم اور دلائل کے اعتبار سے ناکام ہوتے ہیں، تو طاقت کے استعمال پر اُتر آتے ہیں۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام کی قوم نے بھی اتفاق کیا کہ آپ کو قتل کر کے اپنے خداؤں کی مدد کریں، قتل کی بھی بدترین صورت انہوں نے تجویز کی یعنی یہ کہ آپ کو زندہ جلا دیا جائے اور پھر کسی معمولی سی آگ میں نہیں، بلکہ اس مقصد کی خاطر انہوں نے ایک بہت بڑی عمارت تیار کرائی جس میں بے پناہ ایندھن کے انبار لگا دیئے جس میں ساری قوم نے حصہ لیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے:

قَالُوا ابْنُوا لَهُ بُنْيَانًا فَأَلْقُوهُ فِي الْجَحِيمِ

وہ کہنے لگے کہ اس کے لیے ایک عمارت بناؤ پھر اس کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دو۔

ابن ابی حاتم کی ایک روایت میں ہے جو بطریقِ سدی ہے کہ عورتیں بیماری میں اس قسم کی نذر مانتی تھیں کہ اگر مجھے صحت ہوئی، تو میں بھی ابراہیم کے لیے جلائی جانے والی آگ میں ایندھن ڈالوں گی۔ [1]

ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ انہوں نے مسلسل ایک ماہ تک ایندھن اکٹھا کیا اور پھر اس میں آگ لگا دی۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کرنے لگے، حتیٰ کہ انتہائی بلندیوں پر اُڑنے والے پرندے بھی آگ کی شدت کے باعث اس جگہ کے اوپر سے نہیں، بلکہ اِدھر اُدھر سے ہو کر گزرتے تھے۔ پھر انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں میں بیڑیاں ڈالیں، ہاتھ بھی

---

[1] فتح الباری ۶/ ۲۰۶، مطبعۃ الحلبی [2] سورۃ الصافات، آیت ۹۷، تفسیر ابن کثیر

باندھ دیئے اور منجنیق میں رکھ دیا۔ ؎1

ان لمحات میں جب کہ کفر اپنی تمام تر طاقتوں کو استعمال میں لا کر آلام و مصائب میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کر رہا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے رب پر پہاڑوں کی مضبوط چٹانوں سے بھی زیادہ مستحکم ایمان تھا۔ اللہ تعالیٰ کی فتح و نصرت پر آپ کو پورا پورا اعتماد تھا اور آپ کو یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ کی تائید و حمایت روئے زمین کے تمام انسانوں کی تائید و حمایت سے زیادہ قوی ہے، لہٰذا آپ ان طاغوتی طاقتوں کے لشکر ہائے جرار، بھڑکتی اور شعلے برساتی ہوئی نار اور ان کی ناشائستہ و ناگفتہ گفتار سے قطعاً خائف نہ تھے

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب آگ میں ڈالا گیا تو اس وقت آپ یہ کہہ رہے تھے کہ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ اقدس پر بھی یہی کلمات تھے۔ جب لوگوں نے یہ کہا تھا:

اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَکُمْ فَاخْشَوْھُمْ فَزَادَھُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ ۝	کفار نے تمہارے (مقابلے کے) لیے (لشکر کثیر) جمع کیا ہے، تو ان سے ڈرو، تو ان کا ایمان اور زیادہ ہو گیا اور کہنے لگے ہم کو خدا کافی ہے اور وہ بہت اچھا کارساز ہے۔

حضرت ابن عباسؓ سے مروی ایک اور روایت میں ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آگ میں ڈالا گیا، تو آخری کلمات آپ کی زبان پر یہ تھے: حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ۔

حافظ ابن حجر "فتح الباری" میں فرماتے ہیں کہ حضرت ابن عباسؓ سے مروی ان دونوں حدیثوں میں اس طرف بھی اشارہ ہے جسے اس واقعہ کے سلسلہ میں ابن اسحاق نے نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ؎2

قُلْنَا یٰنَارُ کُوْنِیْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ۔

؎1 تفسیر القرطبی ۳۰۴/۱۱ ؎2 صحیح بخاری، فتح الباری ۲۲۹/۸ مکتبۃ الریاض الحدیثۃ

بَرْدًا میں اس طرف اشارہ تھا کہ آگ تو ٹھنڈی ہو جا کہ حرارت اور تمازت ابراہیم کو تکلیف نہ پہنچائے اور سَلٰمًا کہہ کر اس طرف اشارہ فرمایا کہ اس قدر ٹھنڈی بھی نہ ہو نا کہ ٹھنڈک کی شدت سے آپ کو تکلیف پہنچے۔ کسی مسلمان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ سوال کرے کہ آگ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کیوں نہ جلایا؟ کیوں کہ بات بالکل واضح ہے کہ جس ذاتِ اقدس نے آگ میں جلانے کی تاثیر ودیعت رکھی ہے۔ اسی نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جائے، کیونکہ

اِنَّمَآ اَمْرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيْـًٔا	اس کی شان یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا
اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ[1]	ہے، تو اس سے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتی ہے

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ۔

ان کا ارادہ تو یہ تھا کہ آپ کو آگ میں جلا کر اپنے خداؤں کی مدد کریں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو خائب و خاسر اور ناکام بنا دیا اور دُنیا و آخرت کی ناکامیوں اور نامرادیوں کے سوا کچھ اور ان کے ہاتھ نہ آیا وَذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ ۝

اللہ تعالیٰ کی یہ سنت رہی ہے کہ جب صورتِ حال انتہائی خراب ہو جاتے تو وہ اپنے رسولوں کی مدد فرمایا کرتا ہے اور اپنے متکبر دشمنوں کو ذلیل و خوار کر دیا کرتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے؛

حَتّٰٓى اِذَا اسْتَيْــَٔسَ الرُّسُلُ	یہاں تک کہ جب پیغمبر نا اُمید ہو گئے اور انہوں
وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ قَدْ كُذِبُوْا	نے خیال کیا کہ (اپنی نصرت کے بارے میں جو بات
جَآءَهُمْ نَصْرُنَا ۙ فَنُجِّيَ	انہوں نے کہی تھی اس میں) وہ سچے نہ نکلے تو ان
مَنْ نَّشَآءُ ۭ وَلَا يُرَدُّ	کے پاس ہماری مدد آ پہنچی، پھر جسے ہم نے چاہا بچا
بَاْسُنَا عَنِ الْقَوْمِ	دیا اور ہمارا عذاب (اُتر کر) گناہگار لوگوں سے
الْمُجْرِمِيْنَ ۝[2]	پھرا نہیں کرتا۔

---

[1] سورۃ یٰسین، آیت ۸۲ [2] سورۃ یوسف، آیت ۱۱۰

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن نارِ نمرود سے زندہ و سلامت باہر تشریف لے آئے۔ قوم نے اپنے سر کی آنکھوں سے اس منظر کا مشاہدہ کیا، مگر پھر بھی کوئی نصیحت حاصل نہ کی، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کفر و عناد کے باعث، ہلاکت و بربادی کو ان کا مقدر کر رکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ دلائل و براہین اور معجزات بھی ان کے لیے مفید نہ ہو سکے۔

۷۔ ہجرتِ ابراہیمؑ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کو یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس بات سے عاجز و قاصر ہیں کہ حضرت خلیل الرحمٰن کو شہید کر سکیں یا آپ کو اپنے ان افکار و نظریات سے روک سکیں، جن کی آپ دعوت دے رہے تھے۔ اس قوم کا سرکش و جابر حکمران بھی حیران و ششدر رہ گیا کہ اب کرے تو کیا کرے، کیونکہ اس کی شعلہ بار آگ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جسمِ اطہر کے کسی حصہ، کسی ناخن یا آپ کے لباس تک کو بھی نقصان نہ پہنچا سکی تھی۔

ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی پورا پورا یقین ہو گیا کہ شرک نے آپ کی قوم کے افراد کے دلوں اور عقلوں میں اپنی جڑیں نہایت گہرائی تک پہنچا لی ہیں۔ آپ نے ان کے سامنے نہایت ٹھوس اور ناقابلِ تردید دلائل و براہین پیش کیے۔ محیر العقول قسم کے معجزات دکھائے، مگر یہ لوگ اپنی ہٹ کے اتنے پکے تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوتے، بلکہ اپنے باطل مذہب پر ڈٹے رہے اور حق قبول کرنے سے بدستور انکار کرتے رہے، حتیٰ کہ اب تو ہر قسم کی وعظ و نصیحت ان کے لیے بے فائدہ تھی!

ان حالات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے محسوس فرمایا کہ اس بنجر اور بے آب و گیاہ زمین میں مزید قیام کا کوئی فائدہ نہیں ہے جس کے بسنے والے عذابِ الٰہی کے طلب گار ہیں، نبیوں اور رسولوں کے منکر ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو اور آپ کے رفقاء کو ایک بابرکت زمین کی طرف ہجرت کرنے کا حکم دے دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَخْسَرِيْنَ ۔ وَنَجَّيْنٰهُ وَلُوْطًا اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا لِلْعٰلَمِيْنَ ۔ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ نَافِلَةً ؕ وَكُلًّا جَعَلْنَا صٰلِحِيْنَ ۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَا اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ۚ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ۔[1]	ان لوگوں نے بُرا تو ان کا چاہا تھا، مگر ہم نے انہی کو نقصان میں ڈال دیا اور ابراہیم اور لوط کو اس سرزمین کی طرف بچا نکالا جس میں ہم نے اہلِ عالم کے لیے برکت رکھی تھی اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق عطا کیے اور مستزاد برآں یعقوب اور سب کو نیک کیا اور ان کو پیشوا بنایا کہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور نیک کام کرنے اور نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا اور وہ ہماری عبادت کیا کرتے تھے۔

نیز فرمایا:

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ ۘ وَقَالَ اِنِّيْ مُهَاجِرٌ اِلٰى رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۔[2]	پس ان پر (ایک) لوط ایمان لائے اور ابراہیم کہنے لگے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف ہجرت کرنے والا ہوں، بیشک وہ غالب حکمت والا ہے

نیز فرمایا:

قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ ۔ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ ۔ وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ	وہ کہنے لگے کہ اس کے لیے ایک عمارت بناؤ، پھر اس کو آگ کے ڈھیر میں ڈال دو۔ غرض انہوں نے ایک ساتھ ایک چال چلنی چاہی اور ہم نے انہیں کو زیر کر دیا اور (ابراہیم) بولے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا

---

[1] سورۃ الانبیاء، آیت ۷۰ - ۷۳ [2] سورۃ العنکبوت، آیت ۲۶

اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَيَهْدِيْنِ[1] ہوں، وہ مجھے رستہ دکھائے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ نے بابل کو اس وقت چھوڑا، جبکہ وہاں کی زمین بالکل بنجر ہوگئی اور ایک عام قحط نے سارے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا، اس سے کچھ فرق نہیں آتا کہ اس ہجرت میں آپ کا باپ آزر بھی آپ کے ہمراہ تھا، کیونکہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت وہ بہت ہی سن رسیدہ ہو اور کوئی اس کی نگہداشت کرنے والا نہ ہو، لہذا اس نے بھی اپنے بیٹے کی رفاقت ہی کو ترجیح دی ہو، باوجودیکہ اسے اپنے آباؤ اجداد کے عقائد پر بڑا اصرار تھا، جیسا کہ اس بات سے بھی حقیقت میں کوئی فرق نہیں آتا کہ جب آپ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے راہِ خدا میں ہجرت فرمائی تو اُس وقت بابل کے علاقے میں ایک قحط پڑا ہوا تھا۔ حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام نے ہجرت فرمائی، جس طرح آپ سے قبل حضرت نوح علیہ السلام اور آپ کے بعد حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی تھی۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ ورقہ بن نوفل نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ یہ تو وہی فرشتہ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل فرمایا تھا۔ اے کاش! میں اس وقت توانا ہوتا، اے کاش! میں اُس وقت زندہ ہوتا!! جب آپ کی قوم آپ کو نکال دے گی۔ آپ نے فرمایا: کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے؟ ورقہ نے عرض کیا، جی ہاں! اس لیے کہ جب بھی کوئی شخص آپ جیسے پیغام اور دعوت کو لے کر آیا، تو اُن کے ساتھ دشمنی کی گئی۔ اگر میں اس دن تک زندہ رہا تو میں آپ کی خوب خوب مدد کروں گا[2]۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہا، اپنے بچپن کے ساتھیوں سے جُدائی اختیار کی۔ اہل وعیال اور قوم کے قریبی لوگوں کو چھوڑا اور دین کو لے کر اللہ تعالیٰ کی بہت ہی کشادہ اور وسیع زمین میں نکل کھڑے ہوئے اور آپ کے ساتھ اُس وقت دو ہی مسلمان تھے ایک ان کا برادرزادہ تھا اور دوسری اُن کی بیوی تھی۔

---

[1] سورۃ الصافات، آیت ۹۷-۹۹ [2]

حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت لوطؑ اور حضرت سارہ پر مشتمل تین افراد کا یہ قافلہ جو ہجرت کر کے جا رہا تھا۔ اُس وقت کے مسلمانوں کی تمام جماعت تھی اور رُوئے زمین پر اُس وقت اُن کے سوا اور کوئی مسلمان نہ تھا جو اللہ کا نام لیتا ہو، اس میں عبرت کا سامان ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو کثرت ہی پر انحصار کرتے ہیں اور اگر کارکن کم ہوں، تو اُن کی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہی نہیں کرتے۔

اس قافلۂ ایمان نے چلتے چلتے بالآخر بلادِ شام کے علاقہ حران میں سکونت اختیار کر لی، ان دنوں اس علاقہ کے لوگ خدا پرستی کے بجائے ستاروں کی پرستش کرتے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ نے انہیں دعوت دی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توحید کے عقیدہ کو اختیار کریں اور شرک سے اجتناب کریں، مگر انہوں نے آپ کی اس دعوت پر لبیک نہ کہا۔ کچھ دیر حران میں قیام کرنے کے بعد آپ نے سرزمینِ بیت المقدس کی طرف رختِ سفر باندھا اور پھر وہاں سے مصر تشریف لے گئے۔

مصر ہی کے بادشاہ کے ساتھ حضرت سارہ کا وہ قصہ پیش آیا، جسے ہم قبل ازیں کذباتِ ثلاثہ پر بحث کے ضمن میں ذکر کر آئے ہیں۔

یہ قصہ بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسلسل آزمائشوں میں سے ایک آزمائش تھا، سب سے زیادہ ابتلاء کا حضرات انبیاء کرام ہی کو سامنا کرنا پڑتا ہے اور ان میں سے بھی اُولوالعزم پیغمبروں کی آزمائش زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے بڑھ کر داعیِ دین کی اور کیا آزمائش ہو سکتی ہے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے یہ دردناک منظر دیکھے کہ اس کی بیوی کو چھین کر طاغوتِ وقت کے محل میں داخل کیا جا رہا ہے۔ پھر وہ طاغوت اور حضرت سارہ ایک ہی کمرہ میں خلوت میں ہیں اور خدا اس سرکش کو تباہ و برباد کرے، وہ آپ کی رِدائے عزّ و شرف کو تار تار کرنا چاہتا ہے‘ حضرت سارہ کے پاس تو اتنی طاقت نہیں کہ وہ اپنا دفاع کر سکیں۔ ادھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے خدا تعالیٰ سے لو لگائی، نماز اور دُعا شروع فرما دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کی بیوی کو باعزت و آبرو واپس لوٹائے اور اسے ظالم فرعون کے ظلم و استبداد سے محفوظ رکھے۔

وہ قادرِ مطلق ذاتِ اقدس جس نے حضرت ابراہیمؑ کے لیے نارِ نمرود کو گلزار بنا دیا تھا، اس

نے خلیل کو اس عار سے بھی محفوظ رکھا اور حضرت سارہ کو عزو شرف اور عزت و آبرو کے ساتھ آپ کی طرف لوٹا دیا، جب تک اللہ نے چاہا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام مصر میں اقامت پذیر رہے اور پھر وہاں سے بیت المقدس کی طرف رجوع ہو گئے۔ اس مرتبہ آپ کے ساتھ بہت سے مویشی، غلام اور بڑا مال و دولت تھا، وہ قبطی خاتون ہاجرہ بھی آپ کے ساتھ تھیں جسے فرعونِ مصر نے حضرت سارہ کو خدمت کے لیے دیا تھا۔

حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کے حکم سے بیت المقدس سے غور کی طرف چلے گئے۔

سرسبز و شاداب وسیع زمین، بے شمار مویشی، مال و دولت اور غلام اب تنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملکیت تھے، اللہ تعالیٰ نے جس قدر بھی انبیاء کرام مبعوث فرمائے، وہ سب کے سب آپ ہی کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ کے بعد جو بھی آسمانی کتاب نازل ہوئی وہ آپ کی آل و اولاد ہی پر نازل ہوئی تھی۔

ان نعمتوں اور نوازشوں کو دیکھ کر جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فرمائیں ہمیں مسلمانوں کی ہجرتِ حبشہ یاد آ رہی ہے۔ نیز وہ عزت، آزادی اور امن یاد آ رہا ہے جس کا نجاشی نے مسلمانوں کے ساتھ مظاہرہ کیا تھا۔ نجاشی کے اس حُسنِ سلوک سے متاثر ہو کر صحابی رسول حضرت عبداللہ بن حارث بن قیسؓ نے مکہ میں مقیم اپنے بھائیوں کی طرف ایک خط میں درج ذیل اشعار لکھے تھے:

یا راکبا بلغن عنی مغلغلة　　　من کان یرجو بلاغ اللہ والدین

اے سوار! میری طرف سے یہ پیغام ہر اس شخص کو پہنچا دو جو اللہ تعالیٰ کے احکام اور دین کی سربلندی کی امید رکھتا ہے

کل امرئ من عباد اللہ مضطهد　　　ببطن مکة مقهور و مفتون

اللہ تعالیٰ کے اُن بندوں میں سے ہر ایک تک میرا یہ پیغام پہنچا دو جو مکہ میں مجبور، مقہور اور آزمائش میں مبتلا ہیں

انا وجدنا بلاد اللہ واسعة　　　تنجی من الذل والمخزاة والهون

کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کی سرزمین کو بہت وسیع پایا ہے، جو کہ ذلت و خواری اور رسوائی سے نجات دینی ہے

فلا تقیموا علی ذل الحیاۃ وخزی فی المماۃ وعیب غیر مأمون[1]

(لہٰذا تم بھی ذلت کی زندگی رُسوائی کی موت، نکتہ چینی اور خوف کی حالت میں قیام نہ کرو اور ہمارے پاس یہاں آجاؤ)

آج کس قدر شدید ترین ضرورت ہے کہ غریب الدیار داعیانِ دین ان اشعار کے معنی و مفہوم کو سمجھیں اور ہجرت اور وطن اور اہل و عیال سے دوری کے دور کے اسوۂ ابراہیمی کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائیں کہ غریب الوطنی کے دور میں بھی آپ کے پیشِ نظر سب سے اہم کام دعوت الی اللہ تھا۔ مال و دولت یا مویشیوں وغیرہ کی محبت کا کوئی کانٹا آپ کے دل میں نہ تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ان تمام نعمتوں اور نوازشوں سے سرفراز فرمادیا، نہ آپ نے اس دورِ ہجرت میں ایسے خطوط یا قصائد لکھے، حُبِّ وطن یا وطن کی طرف واپس لوٹنے کے اشتیاق کا جن میں اظہار کیا گیا ہو۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والے غریب الدیار دُعاۃ و مبلغین کے ہاں عقیدے کا رشتہ مٹی اور گارے کے رشتہ سے زیادہ مضبوط اور مستحکم ہونا چاہیے۔ اہل و عیال، اعزہ و اقارب اور قوم و قبائل کے تعلقات سے دین کے تعلقات قوی ہونے چاہئیں اور اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر ان کا ایمان اس قدر پختہ ہونا چاہیے کہ دُنیا کی کوئی آزمائش یا ابتلاء ان کے پایۂ استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہ کرسکے۔ مہاجرین کی بابت ارشادِ خداوندی ہے:

وَمَنْ يُّهَاجِرْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اور جو شخص خدا کی راہ میں گھر بار چھوڑ جائے
يَجِدْ فِي الْاَرْضِ مُرٰغَمًا	وہ زمین میں بہت سی جگہ اور کشائش پائے
كَثِيْرًا وَّسَعَةً ۭ وَمَنْ يَّخْرُجْ	گا اور جو شخص خدا اور اُس کے رسول کی طرف
مِنْۢ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ	ہجرت کرکے گھر سے نکل جائے، پھر اُس کو
وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ	موت آپکڑے تو اُس کا ثواب خدا کے ذمے

---

[1] سیرت ابن ہشام ۳۳۰/۱، مطبعۃ و مکتبۃ البابی الحلبی۔

فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۟ؑ
ہوچکا اور خدا تعالیٰ بخشنے والا ہے۔

باقی رہا نمرود اور اُس کی مشرک قوم کا انجام تو وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک اور تباہ و برباد کر دیا، ان کی ہلاکت کا سامان خواہ ان مچھروں کے ذریعہ ہوا ہو، جنہوں نے ان کے گوشت اور خون کا صفایا کر کے انہیں ہڈیوں کے بے جان ڈھانچوں میں تبدیل کر دیا تھا جیسا کہ ابن کثیر نے زید بن اسلم کے طریق سے روایت کیا ہے یا ہلاکت کسی دوسرے ذریعہ سے ہوئی ہو، باعثِ عبرت ہے کہ اتنی طاقتور اور جابر و سرکش قوم کا آج نام و نشان تک باقی نہیں، صرف اتنا ہی معلوم ہے کہ اس قسم کے لوگ شیطانی لشکر کے سپاہی، ضلالت و گمراہی کے امام اور شر اور برائی کی علامت تھے۔ والعیاذ باللہ

لہ سورۃ النساء، آیت ۱۰۰

مبحث چہارم

اسباق ونصائح

پہلا سبق	:	ہمارے دور کے سرکش قوم ابراہیم کے سرکشوں سے زیادہ ظالم ہیں۔
دوسرا سبق	:	حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے نہ ڈرتے تھے۔
تیسرا سبق	:	سب مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں۔
چوتھا سبق	:	عصر حاضر کے بتوں کی دو مثالیں۔
پانچواں سبق	:	مشرکین سے عدم موالات
چھٹا سبق	:	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوت وحجت
ساتواں سبق	:	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ساری زندگی دعوت الی اللہ کیلئے وقف تھی

پہلا سبق

ہمارے دور کے سرکش قوم ابراہیم علیہ السلام کے سرکشوں سے زیادہ ظالم ہیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے طاغوتوں نے آپ کو اجازت دے رکھی تھی کہ آپ جو بات کہنا چاہیں بلا جھجک، بلا تامل، بغیر کسی کمی بیشی اور زیادتی و زبردستی کے برملا کہہ سکتے ہیں، بات کہنے کے جرم کی پاداش میں نہ تو آپ کو پیٹا گیا اور نہ آپ کا بائیکاٹ کیا گیا اور نہ یہ کیا گیا کہ پہلے آپ کو پابندِ زنجیر و سلاسل کر کے طرح طرح کی تکلیفیں دی گئی ہوں اور پھر آپ کا بیان ٹیپ ریکارڈر کی مدد سے ریکارڈ کیا گیا ہو اور پھر اس میں سے بھی ایسے حصوں کو سنسر کی نذر کر دیا گیا ہو جو حکومت کے مفاد کے خلاف ہوں۔

جب عدالت میں آپ کے خلاف کیس چل رہا تھا تو اُس وقت بوڑھے، عورتیں، جوان اور بچے سبھی عدالت کی کاروائی دیکھتے اور بتوں کو تہس نہس کرنے والے کی بات کو بھی خوب کان لگا کر سُنتے اور آپ کے دلائل کے مقابلہ میں حکومتِ وقت کے جو دلائل تھے، وہ بھی خوب سنتے اور پھر دونوں کے مابین تقابل و تجزیہ کرتے۔

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن علیہ السلام نے بڑی ہمت و جرأت کے ساتھ عدالت میں اپنے آراء و افکار اور معتقدات پیش کیے اور اس بات کی قطعاً کوئی پرواہ نہ کی کہ یہ ظالم و سرکش لوگ آپ کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ آپ نے انہیں جھوٹا قرار دیا، مجنون اور پاگل کہا اور ان کے جھوٹے خداؤں کو بُرا بھلا کہا۔ قاضیوں اور ججوں نے بھی آپ کے موقف اور آپ کی ان

تمام باتوں کو سُنا اور یہ کہہ کر خاموش نہ کرایا کہ آپ اپنے دفاع سے تجاوز کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دور کے ظالم و سرکش حکمران داعیان دین کے بارے میں عصرِ حاضر کے حکمرانوں سے کم نفرت و عداوت رکھتے تھے۔ موجودہ دور کے یہ ظالم حکمران تو معمولی سی آزادی دینے کے لیے بھی تیار نہیں، جبکہ ان کے اسلاف ان سلسلہ میں کافی آزادی دیا کرتے تھے، حالانکہ قدیم و جدید ہر دور میں ان ظالم و سرکش حکمرانوں کی ذہنیت اور اغراض و مقاصد ایک ہی جیسے رہے ہیں۔

آہ! مصر میں مفکرِ اسلام سید قطب رحمۃ اللہ کو تختۂ دار پر لٹکا دیا گیا۔ دشمنوں نے آپ پر ہر طرح کی الزام تراشی کی، آپ کو خوفناک مجرم قرار دیا۔ استعماری طاقتوں کا ایجنٹ بتایا۔ الغرض وہ کونسی تہمت اور جھوٹا الزام تھا جو آپ پر نہ لگایا گیا اور پھر ستم یہ کہ آپ کو ان بیہودہ الزامات کے جواب کا حق بھی نہ دیا، اتنی اجازت بھی نہ دی کہ آپ اپنے موقف کی وضاحت کے لیے کوئی بیان ہی جاری کر سکیں۔ اطراف و اکناف عالمِ اسلام کے وکلا نے پیشکش کی کہ وہ آپ کے مقدمہ کے لیے بلا معاوضہ اپنی خدمات پیش کرتے ہیں، لیکن جمال عبدالناصر کی حکومت نے کسی بھی وکیل کو مصر میں داخل ہونے کی اجازت ہی نہ دی۔ آہ! جمال عبدالناصر اور اس کی حکومت نے سید قطب، جو کہ تہجد گزار اور شب زندہ دار تھا "فی ظلال القرآن" "التصویر الفنی فی القرآن" اور "العدالۃ الاجتماعیۃ فی الاسلام" جیسی بلند پایہ کتب کا مصنف تھا، کے مقدس خون کے ساتھ ہولی کھیلی اور اس بلند پایہ مفکرِ اسلام اور بے مثل داعیٔ دین کو تختۂ دار پر لٹکا دیا۔ وقت کی ظالم حکومت نے اپنی راگنی ہی گائی اور اس بات کی اجازت نہ دی کہ لوگ آپ کے موقف کو بھی سُن سکتے۔

بغداد میں بعث پارٹی کی حکومت نے داعیٔ اسلام شیخ عبدالعزیز بدریؒ کو شہید کر دیا، آپ بیوی و بچوں کے ساتھ گھر میں مقیم تھے کہ ظالموں نے آپ کو آپ کے گھر سے گرفتار کیا، حالانکہ آپ نے کسی جرم کا ارتکاب نہ کیا تھا اور پھر چند دن بعد ان ظالم حکمرانوں نے آپ کے

اہل و عیال کو یہ روح فرسا خبر سنائی کہ حرکتِ قلب بند ہو جانے سے آپ کا انتقال ہو گیا ہے اور پھر انھوں نے خود ہی آپ کی تجہیز و تکفین کا انتظام کیا اور آپ کے شاگردوں، اہل و عیال اور عقیدت مندوں میں سے کسی کو بھی آپ کے جنازہ میں شرکت کی اجازت نہ دی۔ صرف آپ کے ایک بھائی کو یہ کامیابی ہوئی کہ وہ فوج اور پولیس کے حصار کو توڑ کر میت تک پہنچ گیا اور جب اُس نے اپنے مرحوم بھائی کے چہرے سے کفن کو ہٹا کر دیدار کیا، تو وہ یہ ہولناک منظر دیکھ کر لرز اُٹھا کہ کس طرح آپ کو آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنایا گیا، جس کی تاب نہ لاتے ہوئے آپ کی رُوح نے قفسِ عنصری سے پرواز کیا۔

آہ! بعث پارٹی کے مجرم حکمرانوں نے عراق کے ایک نہایت ممتاز اور بلند پایہ عالمِ دین اور داعی و مفکر شخصیت کو شہید کر دیا۔ اور لوگوں کو آج تک یہ معلوم ہی نہ ہو سکا کہ کس جرم کی بنا پر آپ کو گرفتار کر کے شہید کر دیا گیا، بلکہ ستم بالائے ستم یہ کہ حکومت نے اپنے موقف کی بابت بھی آج تک کچھ نہیں کہا کہ اُس نے انسانی جانوں سے ہولی کھیلتے ہوئے یہ ہتک آمیز رویہ کیوں اختیار کیا تھا؟

بلادِ شام جس کا تنِ ہمہ داغ داغ شد کا منظر پیش کر رہا ہے۔ یہاں کی "تدمر" نامی ایک جیل میں صرف چند گھنٹوں کے اندر اندر نصیری پارٹی کے ظالم حکمرانوں نے سینکڑوں نوجوان داعیانِ دین کو موت کے گھاٹ اتار دیا، جن میں ڈاکٹر، انجینئر، پروفیسر اور خطیب و واعظ ہر قسم کے قیمتی لوگ تھے۔ شہید کرنے کے بعد ظالموں نے ان سب کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا، جبکہ ان میں سے کچھ لوگ ابھی تک موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا تھے اور پوری طرح فوت بھی نہ ہوتے تھے۔ ان ظالم حکمرانوں نے شام کے اسلامی شہر "حماۃ" کی اکثر آبادی کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اس مقتل میں قربان ہونے والوں کی تعداد تیس ہزار سے کسی طرح کم نہ تھی۔ ان سفاک لوگوں نے خواتین کی عزتوں اور عصمتوں کو بھی پامال کیا۔ نوخیز بچوں اور معمر بوڑھوں کے خون سے اپنے ناپاک ہاتھوں کو رنگنے سے بھی دریغ نہیں کیا، بلکہ ان خبیثوں نے

شہر کی بڑی بڑی مسجدوں کو پیوندِ خاک کرنے سے بھی کوئی شرم محسوس نہ کی۔

نصیری پارٹی کی چیرہ دستیاں "تدمر" اور "حماۃ" تک ہی محدود نہ تھیں، بلکہ انہوں نے سارے ہی سوریا کو جیل بنا دیا تھا، قتل و غارت، گرفتاریاں اور پھانسیاں اب اہلِ شام کے لیے کوئی نئی باتیں نہیں ہیں۔ اب تو صورتِ حال یہ ہے کہ جب کسی کا کوئی بیٹا یا بھائی بچھڑ جائے تو اس کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ فوت ہو گیا ہے یا ابھی تک بقیدِ حیات ہے۔

"مشتے نمونہ از خروارے" ان بے شمار ہولناک واقعات میں سے یہ چند ایک کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جن سے اس وقت عالمِ اسلام دوچار ہے، اس سلسلہ میں ظالم و سفاک حکمران سب ایک جیسے ہیں، خواہ وہ فوجی ہوں یا ڈیموکریٹ، ماڈرن ذہن کے ہوں یا رجعت پسند!

موجودہ دور کے سرکش و ظالم حکمرانوں کے عقائد و افکار کی صحیح تصویر دعوتِ اسلامی کے ایک شاعر نے پیش کی ہے اور یہ درحقیقت ترجمہ ہے کرنل حمزہ بسیونی ڈائریکٹر جیل خانہ جات قاہرہ کی اس بات کا جو وہ جیل میں موجودہ علماء و دُعاۃ سے مخاطب ہو کر کہا کرتا تھا ؎

انی انا القانون اعلیٰ سلطة　　من ذا یحاسب سلطة القانون

میں قانون ہوں جس کی حکومت بڑی اعلیٰ ہے اور پھر قانون کی حکومت کا کون محاسبہ کر سکتا ہے؟

من منکم احییته فبرحمتی　　واذا امت فذاك ملك یمینی

تم میں سے میں جس کو زندگی بخشوں، تو یہ میری رحمت ہے اور اگر کسی کو موت کے گھاٹ اتار دوں، تو یہ میرے غلام ہیں۔

کس قدر قابلِ تعجب ہے یہ بات کہ مصنفین و واعظین کی ایک بہت بڑی تعداد اپنی کتابوں کے صفحات سیاہ کر رہی ہے اور ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کئی کئی گھنٹے صرف کر رہی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کی گمراہی کے بیان کے لیے ـــــ مگر یہ لوگ عصرِ حاضر کے طاغوتوں کے لیے اپنی زبان سے ایک بات بھی نہیں نکالتے، اِلّا یہ کہ ان کے طاغوت اور کسی دوسرے طاغوت کے درمیان کوئی معرکہ برپا ہو۔

دوسرا سبق

حضرت ابراہیم علیہ السلام

اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے

بعض لوگ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ان کے ذہن اس بات کے ساتھ اُلجھ کر رہ جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی کیسی کیسی مدد فرمائی، کس کس طرح اپنی تائید سے نوازا اور تمام امتحانوں اور آزمائشوں میں آپ کس طرح اپنے دشمنوں کے بالمقابل عزیمت و استقامت کے ساتھ کھڑے رہے، لیکن یہ لوگ دانستہ یا نادانستہ اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ وہ راستہ کس قدر کٹھن اور دشوار گزار تھا، جسے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے لیے منتخب فرمایا تھا۔ اپنی قوم میں رہتے ہوئے بھی آپ غریب الوطن تھے۔ لوگ آپ کے شدید ترین دشمن تھے اور اس فتح و نصرت کے حصول سے قبل آپ کو بے پناہ آلام و مصائب کا تختۂ مشق بننا پڑا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بُتوں کو پاش پاش کر رہے تھے، تو آپ کو اس بات کا علم نہ تھا کہ اس کی پاداش میں قوم آپ کو نار میں پھینک دے گی اور اللہ تعالیٰ اسے گلزار بنا دے گا۔ زیادہ سے زیادہ آپ یہ جانتے تھے کہ یہ طاغوتی حکمران آپ سے اس کا انتقام ضرور لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ آپ کو شہید کر دیں۔ راہِ خدا میں موت بھی آپ کو گراں محسوس نہ ہوتی تھی جیسا کہ اللہ تعالیٰ کی طاقتوں اور قوتوں کے مقابلہ میں طاغوتوں کی طاقتوں کو آپ انتہائی حقیر تصور کرتے تھے، اسی طرح دنیوی لذات و خواہشات کی آپ کے ہاں کوئی اہمیت نہ تھی، بلکہ آپ کا ایمان تھا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کی قدر و قیمت مچھر کے پر جتنی بھی نہیں ہے۔

جب آپ کی قوم نے آپ کو ڈانٹ ڈپٹ پلائی تو آپ نے بڑی قوت و ہمت کے ساتھ جواب دیا:

وَكَيْفَ اَخَافُ مَاۤ اَشْرَكْتُمْ وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا ؕ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۘ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْۤا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۠

بھلا میں ان چیزوں سے جن کو تم (خدا کا) شریک بناتے ہو، کیونکر ڈروں، جبکہ تم اس سے نہیں ڈرتے ہو کہ خدا کے ساتھ شریک بناتے ہو جس کی اُس نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ اب دونوں فریق میں سے کونسا فریق امن (اور جمعیت خاطر) کا مستحق ہے۔ اگر سمجھ رکھتے ہو (تو بتاؤ) جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو (شرک کے) ظلم سے مخلوط نہیں کیا' ان کے لیے امن (اور جمعیتِ خاطر ہے) اور وہی ہدایت پانے والے ہیں

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ میں تمہارے ان بتوں سے کیونکر ڈروں، حالانکہ میں جانتا ہوں کہ ان بتوں کو جامد پتھروں سے بنایا گیا ہے جو نفع و نقصان کا قطعاً کوئی اختیار نہیں رکھتے میں تمہارے اس فائد اور طاغوتوں سے کیسے خوف کھاؤں' کیونکہ تمام مال و دولت اور لاؤ لشکر کے باوجود یہ مد درجہ ضعیف و کمزور ہیں' میں ان سے کیوں ڈروں، حالانکہ ان کا بھی حال یہ ہے کہ جب ان کے پاس پیامِ اجل آجائے' تو اس میں یہ کسی کمی بیشی کی قدرت نہیں رکھتے، لہٰذا میری نسبت تو انہیں زیادہ ڈرنا چاہیے' کیونکہ یہ غیر اللہ کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کی نعمتوں اور نوازشوں کے منکر ہیں' حالانکہ ہر چیز میں خدا کی قدرت و حکمت کے نشانات بالکل واضح ہیں' لہٰذا میرے بجائے تمہیں زیادہ ڈرنا چاہیے' کیونکہ موت کا فرشتہ تمہیں پکار رہا ہے۔ جہنم کے بھڑکتے شعلے تمہارے منتظر ہیں اور جس دن تم اللہ کی بارگاہ میں برہنہ پاؤں اور برہنہ جسم پیش کیے جاؤ گے' تو تمہاری یہ دولت اور تمہاری یہ جائیداد تمہارے کچھ کام نہ آسکے گی۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خصوص

کے بجائے عموم کی طرف انتقال فرماتے ہوئے قوم سے مخاطب ہو کر فرمایا :

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ لَمْ یَلْبِسُوْٓا اِیْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰٓئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝

جو لوگ ایمان لائے اور اپنے ایمان کو (شرک کے) ظلم سے مخلوط نہیں کیا، ان کے لیے امن (اور جمعیت خاطر) ہے اور وہی ہدایت پانے والے ہیں۔

یعنی وہ لوگ جو اللہ پر ایمان لائے، اس کے سامنے جھک گئے، اس کی قضا و قدر پر ان کے دل مطمئن ہو گئے اور پھر انہوں نے اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ آلودہ نہ کیا تو ایسے نیک لوگوں کے لیے امن ہے خواہ وہ دنیا میں جیل کی کوٹھڑیوں میں ہوں یا ظالموں کی قربان گاہوں کی بھینٹ چڑھ رہے ہوں، کیونکہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ملاقات کے شوق میں ہنسی خوشی آلام و مصائب کو خندہ پیشانی سے برداشت کر لیا اور دنیا کی دلچسپیوں کے بجائے انہوں نے اللہ تعالیٰ کے جوارِ رحمت کو ترجیح دی۔

اس کے برعکس کافروں کی زندگی ایک ناقابلِ برداشت جہنم ہے اور ان کے دلوں پر ایسا خوف اور رعب طاری کر دیا گیا ہے، جس کو یہ آسانی سے برداشت ہی نہیں کر سکتے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا وَ مَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَ بِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ ۝ [1]

ہم عنقریب کافروں کے دلوں میں تمہارا رعب بٹھا دیں گے کیونکہ یہ اللہ کے ساتھ شرک کرتے ہیں جس کی اُس نے کوئی بھی دلیل نازل نہیں کی اور اُن کا ٹھکانا دوزخ ہے، وہ ظالموں کا بہت بُرا ٹھکانا ہے۔

یہ رعب جو اللہ تعالیٰ نے مشرکوں اور کافروں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔ اس کی واضح علامت یہ ہے کہ ان بڑے صاحبانِ اقتدار طاغوتوں کی یہ خواہش ہے کہ اے کاش وہ بھی سڑکوں

---

[1] سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۱

اور راستوں پر اسی طرح بے تکلف آجا سکیں اور چل پھر سکیں، جس طرح عام لوگ چلتے پھرتے ہیں، مگر خوف اور ڈر کے باعث انہیں اس بات کی جرأت نہیں ہوتی۔ پیدل تو یہ لوگ بالکل نہیں چل سکتے، مگر جب بھی گھر سے باہر نکلتے ہیں، تو گاڑی میں اور محافظوں کے پہرہ میں پھر بھی ہر وقت خوف وہراس ان کے سروں پر مسلط ہوتا ہے اور ہر لحہ انہیں یہ خدشہ محسوس ہوتا ہے کہ نہ جانے کب کسی کی گولی کا نشانہ بن جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ لوگ ہر وقت ہر کسی کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے قریبی رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کی طرف سے بھی یہ بےخوف نہیں ہوتے اور پھر ان طاغوتوں اور ظالموں میں سے جب کوئی مر جاتا ہے تو وہ اپنے رب کے ہاں ایک نئی زندگی کا آغاز کرتا ہے جو کہ عذاب اور بدبختی سے تعبیر ہوتی ہے۔

اس کے برعکس مومن اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دیتے ہیں اور اس کی راہ میں جہاد کرتے ہیں، لہٰذا راہِ خدا میں پیش آنے والی ہر تکلیف ان کے لیے باعثِ خیر و بھلائی اور موجب سعادت ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

قُلْ هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَآ إِلَّآ إِحْدَى ٱلْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمُ ٱللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِندِهِۦٓ أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوٓا۟ إِنَّا مَعَكُم مُّتَرَبِّصُونَ ۝ [1]

کہہ دو کہ تم ہمارے حق میں دو بھلائیوں میں سے ایک کے منتظر ہو اور ہم تمہارے حق میں اس بات کے منتظر ہیں کہ خدا (یا تو) اپنے پاس سے تم پر کوئی عذاب نازل کرے یا ہمارے ہاتھوں سے (عذاب دلوائے) تو تم بھی انتظار کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتے ہیں۔

حضرات صحابہ کرام، تابعین عظام اور سلف صالح کے سامنے یہ باتیں بالکل اظہر من الشمس تھیں۔ رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

ایرانی لشکر کے سپہ سالار رستم نے جب حضرت ربعی بن عامر سے یہ پوچھا کہ تم کس لیے

---

[1] سورۃ براۃ، آیت ۵۲

آئے ہو؟ تو آپ نے جواب دیا ہمیں اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا تاکہ اپنے جن بندوں کی بابت وہ چاہے ہم انہیں انسانوں کی پوجا و پرستش کی بجائے اللہ تعالیٰ کی عبادت پر لگا دیں۔ دُنیا کی تنگنائیوں سے نکال کر انہیں شاہراہِ حیات کی وسعتوں اور کشادگیوں سے آشنا کر دیں۔ ادیان و مذاہب کے ظلم و ستم کے بجائے اسلام کے عدل و انصاف سے مستفید ہونے کا موقعہ فراہم کریں۔ اس نے اپنا دین عطا فرما کر ہمیں اپنی مخلوق کی طرف بھیجا ہے تاکہ ہم اسے دعوتِ دین دیں، لہٰذا جو شخص ہمارے اس پیغام کو قبول کر لے، ہم اسے تسلیم کر لیتے اور اس سے پیچھے پلٹ جاتے ہیں اور جو اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دے، ہم اس کے خلاف جہاد کرتے ہیں تا آنکہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ آجائے۔ رستم نے پوچھا اللہ تعالیٰ کے وعدہ سے کیا مُراد ہے؟ آپ نے فرمایا جو اس کے منکر کے ساتھ جہاد کرتے ہوئے شہید ہو جائے، اُس کے لیے جنت اور جو خلعتِ شہادت سے سرفراز نہ ہو اُس کے لیے فتح و نصرت ہے۔[1]

شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ فرمایا کرتے تھے کہ دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں، کیونکہ جنت اور باغ و بہشت تو میرے سینے میں جلوہ افروز ہیں۔ میں جہاں بھی جاؤں یہ ہمیشہ میرے ساتھ ساتھ رہتے ہیں اور مجھ سے کبھی بھی جدا نہیں ہوتے، اگر مجھے نظر بند کر دیں تو مجھے خلوت میسر آجائے گی، مجھے قتل کر دیں، تو یہ شہادت ہو گی، جلا وطن کر دیں تو سیر و سیاحت ہو گی۔ نیز آپ فرمایا کرتے تھے محبوس تو دراصل وہ ہے جو اپنے دل کو اللہ سے دُور کرے اور اسیر وہ ہے جو اپنی خواہشات میں گرفتار ہو، جب آپ کو قلعہ میں بند کر دیا گیا، آپ نے قلعہ کے اندر داخل ہو کر جب قلعہ کی دیوار پر نظر ڈالی تو فرمایا:

فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ۔	پھر ان کے بیچ میں ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہو گا جو اُس کی جانب اندرُونی ہے اس میں تو رحمت ہے اور جو جانب بیرونی ہے اس طرف عذاب۔

---

[1] البدایۃ والنہایۃ ۷/ ۳۹

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ بخدا! میں نے نہیں دیکھا کہ شیخ الاسلام ابن تیمیہؒ سے کوئی اچھی زندگی بسر کر رہا ہو، حالانکہ آپ کو اسبابِ عیش و آرام میسر نہ تھے، بلکہ اس کے برعکس آپ کو قید و بند کی صعوبتوں سے دوچار ہونا پڑا، لیکن اس کے باوجود آپ کی زندگی بڑی طیب، آپ کا سینہ بڑا کشادہ، آپ کا دل نہایت مضبوط اور آپ کا نفس بہت خوش خوش تھا، خوشی و مسرت اور شادمانی کے اثرات جبینِ اقدس سے نمایاں تھے، بلکہ جب ہم پر کبھی خوف کی کوئی کیفیت طاری ہوتی۔ ہمارے بارہ میں بدگمانیوں سے کام لیا جاتا اور زمین تنگ محسوس ہوتی، تو ہم آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور جب آپ کو دیکھتے اور آپ کی گفتگو سنتے، تو ہماری یہ ساری پریشانیاں دور ہو جاتیں اور ہمیں بھی انبساط و انشراحِ قلب و صدر کی دولت نصیب ہو جاتی۔ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو فتح و نصرت سے نوازا گیا، جس طرح کہ آپ کے بعد خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابہ کرام، تابعین اور — خیر القرون کے لوگوں کو فتح و نصرت سے سرفراز کیا گیا ہے۔ وہ امت کبھی شکست کھا بھی نہیں سکتی جسے ایسے علماء کرام داعیانِ عظام قیادت کے فرائض سرانجام دینے کے لیے میسر ہوں، جن کا اعتقاد یہ ہو کہ جیل خلوت، جلاوطنی سیاحت اور موت شہادت ہے۔

جب امت اس پایہ کے داعیانِ دین کے وجودِ مسعود سے محروم ہو گئی تو پھر اللہ تعالیٰ نے ہم پر ہمارے دشمنوں کو مسلط کر دیا، ہم قوموں کے لیے بازیچۂ اطفال بن گئے اور ہم مسلمانوں کی حالت خس و خاشاک سے بھی ابتر ہو گئی۔

افسوسناک بات یہ ہے کہ اکثر مبلغین و دعاۃ کی حالت یہ ہے کہ جب ان میں سے کوئی یہ سنتا ہے کہ حکومت اس کی حرکات و سکنات پر کڑی نظر رکھے ہوئے ہے، تو اس پر خوف اور قلق و اضطراب طاری ہو جاتا ہے اور وہ قریبی دوستوں کو بھی شک کی نگاہ سے دیکھنے لگ جاتا ہے۔ بعض پر تو اس خوف کا اس قدر اثر ہوتا ہے کہ وہ دماغی توازن کھو بیٹھتا ہے۔ والعیاذ باللہ!

---

[1] الکلم الطیب، ابن قیم، بحوالہ الکواکب الدریہ فی مناقب شیخ الاسلام ابن تیمیہ

یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جو ان طاغوتی حکمرانوں کے لیے نفاق کا کام کرتے ہیں، وہ ان سے کسی منصب یا مالی منفعت کا مطالبہ نہیں کرتے، بلکہ وہ یہ چاہتے کہ وہ ان سے، ان کے کارندوں، فوجوں، ایجنٹوں اور جاسوسوں سے محفوظ رہیں۔ حکمرانوں اور بڑے بڑے افسروں کی مجلسوں میں شرکت کے باعث ان کا ایمان کمزور ہو جاتا ہے، حتّٰی کہ یہ لوگ بھی ان سرکش و ظالم حکمرانوں کے آلۂ کار بن جاتے ہیں کہ نہ تو ان کے کسی حکم کی مخالفت کرتے ہیں اور نہ ان کے کسی مطالبہ کو پورا کرنے سے کتراتے ہیں اور پھر عجیب بات یہ کہ یہ علماء و مفکرین گھنٹوں گھنٹوں اس آیت پر درس بھی دیتے ہیں:

اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ يُخَوِّفُ اَوْلِيَآءَهٗ ۖ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ[1]	یہ (خوف دلانے والا) تو شیطان ہے جو اپنے دوستوں سے ڈراتا ہے، تو اگر تم مومن ہو تو ان سے مت ڈرنا اور مجھی سے ڈرتے رہنا

اے اللہ! ہمارے دلوں کو اپنے اور اپنے جہنم کے خوف سے بھر دے اور اے رب العالمین اپنے غیر کے خوف سے ہمارے دلوں کو آزاد کر دے۔ اللہ! اپنی راہ میں شہادت کی موت عطا فرما اور ہمارا اور سب مسلمانوں کا خاتمہ اچھا کر دے اور اے اللہ! اپنے ان انبیاء کرام کے اسوہ پر چلنے کی توفیق عطا فرما جو تیرے سوا کسی سے نہیں ڈرتے تھے۔

---

[1] سورۃ آل عمران، آیت ۱۷۵

تیسرا سبق

مسلمان ایک جسم کی مانند ہیں

مُسلمانوں کی مثال جسدِ واحد کی سی ہے جیسے کہ جب کسی جسم کا کوئی ایک عضو مبتلائے درد ہو تو سارا جسم بخار اور بیداری کے باعث بے قرار ہو جاتا ہے، اسی طرح جب کسی مسلمان کو کوئی تکلیف ہو تو ساری ملتِ اسلامیہ کو وہ اپنی تکلیف سمجھنی چاہیے۔ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو اپنے دور میں امت میں وہ حیثیت حاصل تھی جو سر کو باقی دھڑ میں حیثیت حاصل ہے بلکہ کہنا یوں چاہیے کہ خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد آپ ہی کو مقام و مرتبہ حاصل ہے، لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایک مسلمان صبح و شام ان قصص و واقعات کو یاد کرتا رہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنی مجرم و ظالم قوم کے ساتھ پیش آئے تھے۔ ان بہت سے واقعات میں سے ہم "مشتے نمونہ از خروارے" چھپکلی کے واقعہ کی طرف اشارہ کریں گے۔

حضرت سعید بن مسیبؒ، حضرت ام شریکؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چھپکلیوں کے مار دینے کا حکم دیا اور فرمایا کہ یہ اس آگ میں پھونکیں مارتی تھیں جسے حضرت ابراہیمؑ کے لیے جلایا گیا تھا۔[1]

مسند احمد میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چھپکلی کو مارو، کیونکہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی گئی آگ میں پھونکیں مارتی تھی۔

---

[1] اس حدیث کو امام بخاری نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے، فتح الباری ۷/۴/۲۰۰، مسلم نے اسے بروایت ابن جریج اور نسائیؒ و ابن ماجہ نے اسے بروایت سفیان بن عیینہ بیان کیا ہے۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معمول تھا کہ آپ انہیں مار دیا کرتی تھیں۔ مسند احمد کی ایک اور روایت میں ہے کہ ایک عورت حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئی، تو اُس نے ایک گاڑا ہوا نیزہ دیکھا، تو پوچھا کہ یہ نیزہ کیا ہے؟ آپ نے فرمایا ہم اس کے ساتھ چھپکلیوں کو مارتے ہیں۔ پھر آپ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی بیان کیا کہ جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا، تو چھپکلی کے سوا سب جانور اسے بجھانے کی کوشش کر رہے تھے اور چھپکلی اس میں پھونکیں مارتی تھی۔ یاد رہے کہ امام احمدؒ ان دونوں روایتوں کے بیان کرنے میں منفرد ہیں۔[1]

سُبحان اللہ! یا اللہ تیرا یہ دین کتنا عظیم الشان ہے جس کی طرف تو نے ہماری رہنمائی فرمائی اور پھر اُس کے اتباع کی توفیق بخشی اور پھر یہ قدریں کس قدر مشترک ہیں جنہیں اسلام نے اپنے پیروکاروں میں پیدا فرما دیا ہے کہ ہزاروں برسوں سے یہ معمول ہے کہ جب بھی مسلمان چھپکلی کو دیکھتے ہیں، تو اسے مار دینے کے لیے فوراً آمادہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ اُس نے ہمارے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے جلائی گئی آگ میں پھونکیں ماری تھیں اور یہ ظاہر ہے کہ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دشمن ہے، وہ ہر مسلمان کا بھی دشمن ہے۔ مسلمان بھی قیامت تک اس کے دشمن رہیں گے۔ دشمنان خدا کے ساتھ کوئی محبت اور کوئی مصالحت نہیں ہو سکتی، خواہ وہ چھپکلیوں کی طرح کے چھوٹے چھوٹے جانور ہی کیوں نہ ہوں۔

---

[1] قصص الانبیاء، ابن کثیر ص ۱۸۵، دار الکتب الحدیثۃ، تحقیق مصطفےٰ عبدالواحد محقق نے اس واقعہ کے بارے میں یہ لکھا ہے کہ ہم ان روایات پر مطمئن نہیں کیونکہ یہ عقل کے مخالف ہیں اور پھر حیوانات مکلف نہیں اور نہ چھپکلی کا شمار ان فاسق جانوروں میں سے ہے جن کے قتل کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ہے اور اگر یہ بات پایۂ صحت کو پہنچ جاتی، تو پھر قتل کا کوئی سبب ہوگا؛ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ کونسی عقل ہے جو ان احادیث کے مخالف ہے، جسے بخاری و مسلم نے اپنی صحیحین میں روایت فرمایا ہے۔ علاوہ ازیں امام احمدؒ نسائی اور ابن ماجہ نے بھی انہیں روایت کیا ہے۔ عبدالواحد نے بزعم خود جو البدایۃ والنہایۃ کو ایڈٹ کیا ہے تو کس قدر ستم کیے حافظ ابن کثیر پر۔

چھپکلی کے اس قصہ کو سب عام و خاص مسلمان جانتے ہیں، حتیٰ کہ کسی دور دراز کی بستی میں بسنے والا چھوٹا مسلمان بچہ بھی چھپکلی کو دیکھے، تو وہ اسے مارنے کے لیے فوراً آمادہ ہو جاتا ہے کیونکہ اُس نے اپنے بڑوں کو اسے قتل کرتے دیکھا اور ان سے یہ سنا ہے کہ یہ حضرت خلیل الرحمٰن علیہ السلام کے لیے جلائی گئی آگ میں پھونکیں مارتی تھی۔

یہ بات افسوسناک ہے کہ ہمارے اس دور میں اسلامی جسم کے ان مختلف اعضاء کے درمیان باہمی ربط و تعلق اور اشتراک و تعاون کے جذبات ضعف و انحلال کا شکار ہو گئے ہیں۔ آج دشمنانِ اسلام کتنے ہی مبلغین و دعاۃ الی اللہ کو پابند زنجیر و سلاسل کر رہے، بلکہ تختۂ دار پر لٹکا رہے ہیں، لیکن عالم اسلام میں بسنے والے ان کے مسلمان بھائیوں کو ان کے بارے میں کچھ خبر نہیں ہوتی اور خبر اگر ہو بھی جاتے اور وقتی طور پر اس سے متاثر بھی ہوں، تو ان کے یہ تاثرات ساون کے بادلوں کی طرح فوراً ختم ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو تباہ و برباد کرنا اور انہیں آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنانا اس قدر عام ہو چکا ہے کہ باید و شاید! آج مسلمانوں کی کسمپرسی کا یہ حال ہے کہ لبنان کی صبرا اور شاتیلا بستیوں میں مسلمانوں کے مقدس خون کے ساتھ جو دردناک ہولی کھیلی گئی، عالمی ذرائع ابلاغ نے اسے اتنی اہمیت بھی نہ دی، جتنی وہ دو ملکوں کے درمیان فٹ بال یا کرکٹ کے مقابلہ کو دیتے ہیں۔ کس قدر المناک ہے یہ بات کہ ایک یہودی کے قتل یا گرفتاری پر تو پوری دنیا اُٹھ کھڑی ہوتی ہے، لیکن مسلمانوں کو ہر جگہ نہایت بے دردی کے ساتھ ذبح کیا جا رہا ہے اور کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی، بلکہ ان درندوں، سفاکوں اور ظالموں کو تمام سُپر پاورز کی تائید و حمایت حاصل ہوتی ہے، بلکہ کچھ ایسے ملکوں کی تائید و حمایت بھی حاصل ہے، جن میں مسلمان بستے ہیں۔

چوتھا سبق: عصرِ حاضر کے بت

جو شخص بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ کرتا ہے، وہ آپ کی قوم کی بیوقوفی، کم عقلی اور سنگدلی پر تعجب کا اظہار کرتا ہے کہ اس نے یہ کیونکر گوارا کیا کہ ایک عقلمند، دانشور اور حکیم انسان کو آگ میں ڈال دیا جائے، جبکہ اس کا جُرم صرف یہ ہے کہ اُس نے کچھ ایسے بُتوں اور مورتیوں کو توڑ پھوڑ دیا تھا، جن کو وہ اپنے معبود سمجھتے تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ عصرِ حاضر میں شقاوتِ قلبی اور ظلم و استبداد کے مظاہرے ہوتے ہیں، ان پر تعجب کا اظہار کیوں نہیں؟ ہم اپنی بات کی وضاحت کے لیے دو مثالیں پیش کریں گے۔

پہلی مثال: آج اگر کوئی شخص کسی اسلامی حکومت کے قصرِ حکومت میں جا کر، وہاں کے پرچم کو اتار کر پھاڑ دے، تو اس کا کیا انجام ہوگا؟

دوسری مثال، یا کوئی شخص کسی ایسی تصویر کو پھاڑ دے جو ملک کی آزادی اور استقلال کی علامت سمجھی جاتی ہے ——— مثلاً حاکمِ وقت کی تصویر، یا کسی ملک کے بانی کی تصویر۔ تو غور فرمایئے کہ ایسے "مجرم" کا کیا انجام ہوگا؟ بلاشک و شبہ اس قسم کے آدمی کو پرچم یا تصویر کی طرف دست درازی سے قبل ہی خاک و خون میں تڑپا دیا جائے گا، کیونکہ عصرِ حاضر کے ان بُتوں کی دن رات حفاظت کے لیے پولیس اور فوج کے پہرے متعین ہیں اور انہیں حکم ہے کہ اس قسم کے حالات میں فوراً گولی چلا دیں۔

اگر اس قسم کا کوئی شخص قتل ہونے سے بچ بھی جائے، تو پھر اسے ساری زندگی جیل کی ایسی کال کوٹھڑیوں میں بسر کرنا ہوگی، جن پر متعین داروغوں کے دل شفقت اور رحمت جیسے الفاظ سے بالکل خالی ہیں۔ جیل کی ان کال کوٹھڑیوں بلکہ شبِ دیجور کی تاریکی کو لیے ہوئے ان بھیانک غاروں

میں، جن میں رات اور دن میں کوئی فرق محسوس نہیں کیا جاسکتا اور ایسی خوفناک فضاؤں میں جن کی کوئی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ مجرموں سے تحقیق و تفتیش کی جاتی ہے اور اگر ثابت ہوجائے کہ اس کا تعلق کسی تنظیم یا جماعت کے ساتھ ہے، تو پھر اس کے ساتھ ساتھ اس تنظیم اور جماعت کے سربراہ کو بھی تختہ دار پر لٹکا دیا جاتا ہے اور اگر تحقیق سے معلوم ہو کہ اس کا کسی تنظیم کے ساتھ کوئی تعلق نہیں، تو پھر تنہا اسے خاک و خون میں تڑپا دیا جاتا ہے۔ بہرکیف دونوں صورتوں میں اس بات کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی کہ مجرم اپنے موقف کو بیان کرسکے اور اس بات کی وضاحت کرسکے کہ وہ کیا اسباب ہیں، جن کے باعث اس نے ایسا کیا ہے؟

قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ کپڑے کے اس ٹکڑے جسے جھنڈا کہا جاتا ہے یا کسی حکومت کے بانی کی تصویر اور قومِ ابراہیم کے بتوں کے مابین کوئی فرق نہیں ہے۔ الّا یہ کہ عصرِ حاضر کے یہ تازہ بت زیادہ قیمتی ہیں، کیونکہ تصویروں کو بڑے بڑے قیمتی فریموں میں سیٹ کیا جاتا ہے اور مزاروں پر سونے سے گنبد اور مینار بنائے جاتے ہیں۔

اس ساری تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم عصرِ حاضر کے طاغوتوں کی نسبت کم خبیث تھی، کیونکہ قومِ ابراہیم نے تنہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ کیا اور آپ کی جماعت ——— حضرت لوط اور حضرت سارہ ——— سے کوئی تعرض نہ کیا تھا مگر ہمارے ترقی یافتہ دور کے یہ مہذب حکمران تو معمولی سے معمولی شبہ پر بھی لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں اور مجرم کی جماعت، اور اس کے اعزہ و اقارب بھی بچ نہیں سکتے، خواہ وہ بے گناہ ہی کیوں نہ ہوں۔

سوال یہ ہے کہ یہ لوگ ابراہیمؑ، نوحؑ اور دیگر انبیاء علیہم السلام کی قوموں کے بتوں کا ذکر کیوں کرتے ہیں، اور عصرِ حاضر کے ان جدید بتوں کو کیوں فراموش کردیتے ہیں۔ آہ! مفتی اعظم حاکمِ وقت کے ساتھ جھنڈے کو سلامی دینے اور اس کی تعظیم بجالانے کے لیے بھی کھڑے ہوجاتے ہیں، جبکہ قومی ترانہ بھی موسیقی کے سُروں اور ساز کے ساتھ گایا جا رہا ہوتا ہے۔ ان مناظر میں بھی ہم مشائخ، مفتیوں اور علماء کرام کے چہروں پر خوشی و مسرت کے آثار دیکھتے ہیں!

پانچواں سبق

مشرکین کے ساتھ عدم موالات

ہم ہر روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ کچھ لوگوں کے بے وقوف اور ملحد قسم کے قریبی رشتہ داروں اور سربراہوں کے ساتھ نہایت گہرے مراسم ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان کی مجلسوں میں آتے جاتے اور ان کی محفلوں میں شرکت کرتے ہیں، حالانکہ یہ دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور ہمارے یہ ساتھی اُن کی مجلسوں میں بیٹھے رہتے ہیں اور ان کے چہروں پر ناگواری یا اللہ کے لیے ناراضگی کے قطعاً اثرات نمایاں نہیں ہوتے۔

بلکہ بسا اوقات یہ لوگ اخبارات میں ایسے مضامین بھی لکھتے ہیں، جن میں ان ظالم و سرکش حکمرانوں کے بعض اعمال کی مدح و ستائش ہوتی ہے اور جب ان سے اس سلسلہ میں پوچھا جاتا ہے، تو کہتے ہیں کہ ہمیں اسلام نے یہ سکھایا ہے کہ جو کوئی اچھا کام کرے تو ہم اس کی ستائش کریں اور جو کوئی بُرا کام کرے، تو اسے ہم یہ کہیں کہ تو نے درست بات کی مخالفت کی ہے اور اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ آپ انتہائی رقیق القلب تھے۔ بہت حلیم تھے، آپ کا سینہ انتہائی کشادہ تھا، اپنے والد اور اہل و عیال کے ساتھ آپ کا سلوک حد درجہ مشفقانہ تھا، آپ کے انہی اوصاف کی طرف اللہ تعالیٰ نے اس طرح اشارہ فرمایا ہے:

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَحَلِيمٌ أَوَّاهٌ مُّنِيبٌ۔[1] بیشک ابراہیم بڑے تحمل والے نرم دل اور رجوع کرنے والے تھے۔

اور آپ کی اپنے دشمنوں کے لیے بددُعا ان الفاظ میں تھی:

---

[1] سورۂ ہود، آیت ۷۵

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَ مَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ[1] — سو جس شخص نے میرا کہا مانا، وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے

لیکن نہیں معلوم کہ یہ لوگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس اسلوب ہی سے کیوں استدلال کرتے ہیں، جسے آپ نے آغازِ دعوت کے وقت اختیار فرمایا تھا اور آپ کے اس اسلوب کو کیوں فراموش کر دیتے ہیں، جبکہ آپ کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ باپ اور قوم اپنے شرک کو چھوڑنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں، تو آپ نے بھی کھلم کھلا عداوت اور دشمنی کا اعلان فرما دیا، ان سے برأت کا اظہار فرما دیا۔ ان کی عام ہوں یا خاص، سب محفلوں سے علیحدگی اختیار فرمائی اور ہر ہر موقعہ پر اپنے عقیدہ و مذہب کا امتیاز برقرار رکھتے، بلکہ اپنے موقف اور اپنے عقیدہ کی تائید و حمایت کے لیے آپ نے ان کے بتوں کو پاش پاش کر دیا اور پوری جرأت اور قوت کے ساتھ ان سے مخاطب ہو کر کہا:

اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ — تُف ہے تم پر اور جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو اُن پر، کیا تم عقل نہیں رکھتے۔

تمہاری ان جامد عقلوں پر تُف ہے، جنہوں نے ان پتھروں کو خدا تسلیم کر لیا ہے!

تُف ہے کہ تم اپنے آباؤ اجداد کی تقلید اور گمراہی کو مضبوطی سے تھامے ہوتے ہو!!

تُف ہے تمہارے ان خود ساختہ معبودوں پر جو اپنے لیے کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں، کسی اور کے لیے کیا ہوں گے!!!

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا — تمہیں ابراہیم اور ان کے رفقاء کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے، جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور

---

[1] سورۃ ابراہیم، آیت ۳۶

بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَ مِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ.

ان (بتوں) سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو، بے تعلق ہیں (اور) تمہارے (معبودوں کے کبھی قائل نہیں (ہو سکتے) اور جب تک تم اللہ واحد پر ایمان نہ لاؤ، ہم میں تم میں ہمیشہ کھلم کھلا عداوت اور دشمنی رہے گی۔

یہ تھا حضرت خلیل الرحمٰن علیہ السلام کا اُسوۂ حسنہ کہ آپ نے اپنے باپ، قوم اور ہر اُس چیز سے جس کی وہ اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کرتے تھے، برأت کا اظہار کر دیا اور ان سے دُشمنی اور عداوت کا اعلان فرما دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ۔

ہاں ابراہیم نے اپنے باپ سے یہ (ضرور) کہا کہ میں آپ کے لیے مغفرت مانگوں گا

کے بارے میں اکثر مفسرین کا یہ قول ہے کہ اُس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول اُسوہ نہیں ہے[1] حالانکہ آپ کا یہ قول دعوت کے آغاز میں تھا، جبکہ آپ امید رکھتے تھے کہ شاید باپ کا دل نرم ہو جائے گا اور وہ حق کو قبول کر لے، لیکن جب آپ کے سامنے یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے، تو آپ نے اس سے برأت کا اعلان کر دیا۔

ضروری ہے کہ دعوت و تبلیغ کے آغاز میں لب و لہجہ نرم اختیار کیا جائے، لیکن جب لوگ اپنے شرک ہی پر اصرار کریں، تو پھر یہ جائز نہیں کہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ کے دشمنوں سے اظہارِ محبت کیا جائے۔

یاد رہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے محبت کرے گا، اُس کا شمار اللہ تعالیٰ کے دشمنوں ہی میں ہوگا، لہذا دعوت و تبلیغ کے میدان میں کام کرنے والوں کو یہ بات کبھی بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ انہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقش قدم پر چلنا چاہیے۔

---

[1] اضواء البیان ۸/ ۱۳۹۔

اور بودے عذروں اور باطل دلیلوں کا سہارا انہیں ڈھونڈنا چاہیئے۔ جب انہیں کلمۂ حق کہنے کی قدرت نہ ہو تو پھر وہ باطل بات بھی نہ کہیں اور یہ ایمان کی کمزوری کی علامت ہے کہ انسان برملا کلمۂ حق نہ کہہ سکے۔

یہ مصلحت پسند لوگ جو ملحد خطا کاروں سے یہ کہتے ہیں کہ تمہاری بات حق کے منافی ہے، جب اپنے مبلغین و دُعاۃ بھائیوں سے ہم کلام ہوتے ہیں تو ان کا لب ولہجہ حد درجہ ناشائستہ ہوتا ہے۔ ان مصلحت پسندوں، کفار کے مقابلہ میں نرم اور مسلمانوں کے ساتھ سخت رویہ اختیار کرنے والوں کو ڈرنا چاہیے کہ کہیں عذاب الٰہی میں مبتلا نہ ہو جائیں۔

چھٹا سبق

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوت و جرات

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت میں ہمیں یہ بات بہت نمایاں اور ممتاز نظر آتی ہے کہ آپ نے دعوتِ حق کے سلسلہ میں اپنے باپ، اپنی قوم اور نمرود کے ساتھ بہت مناظرے کیے۔ ان تمام مناظروں میں آپ نے مدِمقابل لوگوں کے منہ بند کر دیئے۔ دلائل قاطعہ کے ساتھ ان کی زبان کو لگام دے دی اور اس سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ آہستہ آہستہ قوم کو دلائل میں اس طرح جکڑ لیتے کہ ان کے لیے سوائے کٹ حجتی کے اور کوئی راستہ باقی ہی نہ رہتا۔ بہرکیف ان تمام مناظروں میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیابی عطا فرمائی اور آپ نے ان پر اس حجت کو تمام کر دیا، جس کی دعوت و تبلیغ کا منجانب اللہ آپ پر فریضہ عائد تھا۔

ذرا اس مناظرہ کو بھی ملاحظہ فرمایئے جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حجت و دلیل کی استواری کے ساتھ نمرود کو عبرتناک شکست دے دی۔ اللہ تعالیٰ نے اس مناظرہ کو بیان کرتے ہوئے نمرود کی شکستِ فاش کو ان الفاظ میں بیان فرمایا ہے:۔

فَبُهِتَ الَّذِىْ كَفَرَ
کافر حیران رہ گیا

اسی طرح جب دلائلِ قاطعہ و براہینِ ساطعہ کے ساتھ آپ نے اپنی قوم کو خاموش کر دیا، تو اس کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

فَرَجَعُوْٓا اِلٰٓى اَنْفُسِهِمْ فَقَالُوْٓا اِنَّكُمْ اَنْتُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۙ ثُمَّ نُكِسُوْا عَلٰى رُءُوْسِهِمْ ۚ لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۗءِ يَنْطِقُوْنَ ○

انہوں نے اپنے دل میں غور کیا تو آپس میں کہنے لگے بے شک تم ہی بے انصاف ہو۔ پھر (شرمندہ ہو کر) سر نیچا کر لیا (اس پر بھی ابراہیم سے کہنے لگے کہ) تم جانتے ہو یہ بولتے نہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ قوتِ بیانی اللہ تعالیٰ کی رحمت کی رہینِ منت تھی، جس نے آپ پر یہ فضل و کرم فرمایا کہ آپ کو ان دلائل کی قدرت بخشی جس کے ساتھ آپ مدِ مقابل کو قائل کر سکیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰى قَوْمِهٖ ۭ نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ؁

اور یہ ہماری دلیل تھی جو ہم نے ابراہیم کو ان کی قوم کے مقابلے میں عطا کی تھی ہم جس کے چاہتے ہیں، درجے بلند کر دیتے ہیں، بیشک تمہارا پروردگار دانا (اور) خبردار ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنی ان نعمتوں اور نوازشوں سے بخوبی آگاہ ہے، جن سے اس نے اپنے بندے اور رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نوازا تھا۔ آپ انتہائی ذہین و فطین تھے، آپ کا حُسنِ اسلوب بے مثال، علم کے سمندر اور نیّت کے سچے تھے۔ انہی اوصافِ حمیدہ کی بدولت تنہا ہوتے ہوئے بھی ایک اُمّت کی مانند تھے اور عزیمت و استقامت کا ایک کوہِ گراں تھے، حالانکہ بیوی اور بھتیجے کے سوا سب لوگ آپ کے مخالف تھے۔

اس کے برعکس آج ہمارے دور میں مبلغین و دُعاۃ کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے، لیکن یہ سب کے سب مل کر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سی قوت و جرأت کا مظاہرہ نہیں کر سکتے، تو اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس مسئلے کا انحصار کیفیت پر ہے کمیت پر نہیں ہے۔

ہمارے آج کے مبلغین و دعاۃ میں سے بہت ہی کم لوگ ایسے ہوں گے جو صدقِ نیّت، غزارتِ علم، مناسب مواقع پر حسبِ حال گفتگو کی قدرت اور علی الاعلان اظہارِ حق کی جرأت جیسے اوصاف سے متصف ہوں۔

لہ سورۃ الانعام: آیت ۸۳

بہت سے سچے مجاہد تو موجود ہیں، لیکن قلتِ علم اور احکامِ دین سے مکمل آگاہی نہ ہونے کے باعث، معاملات کی حقیقت ان کے سامنے آشکارا نہیں ہوتی۔ اسی طرح بہت سے حضرات علماء کرام بھی موجود ہیں، لیکن ان میں اظہارِ حق کی جرأت نہیں ہے۔

آہ! ملتِ اسلامیہ کو آج ایسی شخصیتوں کی کس قدر شدید ضرورت ہے جو اُسوۂ ابراہیمی کی حامل ہوں اور وہ ہر دور میں اور ہر جگہ خلقِ خدا پر اللہ تعالیٰ کی حجت تمام کرنے کے لیے ہر وقت سرگرم عمل ہوں۔

ساتواں سبق
حضرت ابراہیم علیہ السلام دعوت الی اللہ کیلئے وقف تھے

جب سے اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو رشد و ہدایت عطا فرمائی، آپ اسی وقت سے دعوت الی اللہ کے لیے سرگرم عمل تھے۔ آپ کو جب بھی کوئی موقع ہاتھ آتا، اللہ تعالیٰ کی توحید اور بتوں اور مورتیوں کی پوجا پاٹ ترک کرنے کی دعوت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ فرماتے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت مخفی نہ تھی جو کہ صرف چند لوگوں تک محدود ہو، اور عوام الناس کو اس کی بابت علم ہی نہ ہو، بلکہ آپ کی دعوت اس قدر کھلم کھلا اور عام تھی کہ عوام ہوں یا خواص، شہروں کے بسنے والے ہوں یا گاؤں کے رہنے والے، سب لوگ اس سے واقف تھے۔

جب آپ کے باپ نے آپ کو ڈانٹ ڈپٹ پلائی اور کہا کہ ابراہیم اگر باز نہ آؤ گے تو پتھر مار مار کر سنگسار کر دیئے جاؤ گے اور جب قوم نے بھی دھمکیاں دیں کہ ابراہیم اگر ہمارے بتوں کی مذمت سے باز نہ آؤ گے تو قتل کر دیئے جاؤ گے یا تختۂ دار پر لٹکا دیئے جاؤ گے، تو اس قسم کی شدید نوعیت کی دھمکیاں بھی آپ کے پائے استقلال میں کوئی جنبش پیدا نہ کر سکیں۔ آپ اپنے موقف سے ذرہ بھر بھی پیچھے نہ ہٹے، اپنے اصول دعوت میں سے کسی ایک میں بھی کوئی تبدیلی پیدا نہ کی، نہ آپ نے کوئی حیلے بہانے اور عذر پیش کیے نہ کسی غار میں چھپے، نہ مصلحت کے باعث بتوں کی مذمت سے خاموش ہوتے۔ الغرض ان میں سے کسی ایک بات کو بھی آپ نے اختیار نہ فرمایا، اختیار فرماتے بھی کیسے جبکہ اللہ تعالیٰ نے امانت، استقامت، صداقت اور وفا کو آپ کی سیرت کا جوہر قرار دیا ہے۔ آپ کے نزدیک اللہ کے دین کی دعوت، دنیا کے ہر کام سے اہم اور اپنے نفس، اہل و عیال،

باپ، قوم، مال و دولت اور دُنیا کی ہر قیمتی متاع سے عزیز تر تھی اور آپ کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا تھی۔ انتہائی خطرات کو مول لیتے ہوئے آپ نے اپنی قوم کے بُتوں کو پاش پاش کر دیا تھا، جبکہ آپ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ یہ بُت قوم کو بڑے عزیز ہیں اور پھر اس جُرأت مندانہ اقدام کے بعد آپ نے نہ تو اپنے آپ کو کہیں چُھپایا اور نہ کوئی راہِ فرار اختیار کی، بلکہ عین ان لمحات میں بھی آپ نے دعوت الی اللہ کا فریضہ انجام دیا جبکہ قوم کی عدالت آپ سے بُتوں کی اس بے حرمتی کے بارے میں تحقیق و تفتیش کر رہی تھی۔ آہ! آپ کسی اور انداز سے سوچتے تھے اور آپ کی بُت پرست قوم کی سوچ کچھ اور تھی!

تاریخ کے صفحات کی ورق گردانی کرنے والا ہر شخص اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ حضرات انبیاء کرام اور دُعاۃ و مصلحینِ عظام دعوتِ دین کے سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نقشِ قدم پر چلتے رہے، انہیں دُور و نزدیک کا ہر شخص جانتا تھا، وہ برملا حق کا اظہار فرماتے، سرکشوں اور ظالموں سے قطعاً نہیں ڈرتے تھے آلام و مصائب ان کے پایۂ استقلال میں قطعاً کوئی جنبش پیدا نہ کر سکتے، بلکہ انہیں مزید عزیمت و استقامت بخشتے تھے، وہ اپنے موقف پر کوہِ گراں بن کر ڈٹے رہتے یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے ان کی دعوت پر لبیک کہا اور اللہ تعالیٰ کے دین کو ان پاکباز حضرات انبیاء و مصلحین کے وجود سے فتح و نصرت نصیب ہوئی، لیکن اس کے مقابلہ میں چھپے ہوئے دعاۃ ہیں، جنہیں لوگ جانتے ہی نہیں اور یہ لوگوں کے ڈر کے باعث چُھپے رہتے ہیں۔ ڈرتے ہیں کہ کب ان پر کوئی آزمائش نہ آجائے۔ ہر وقت شکوک و شبہات اور اوہام میں مبتلا رہتے ہیں اور جب کوئی ادنیٰ سی بھی آزمائش آتی ہے، تو ان کے عزائم مضمحل ہو جاتے ہیں، تو اس قسم کے کم ہمت جو اپنے اندر کوئی تبدیلی پیدا نہ کر سکے، وہ ملک و قوم میں کیا انقلاب لائیں گے؟

وہ لوگ جو دعوت اور مصلحت میں تمیز نہیں کر سکتے، اپنی زندگیوں کا اکثر حصہ پوشیدہ دعوت میں گزار دیتے ہیں اور جابر و سرکش قسم کے حکمرانوں سے محبت کی پینگیں بڑھانے میں بھی کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے، تو ایسے لوگ دعوتِ اسلامی کے دشمنوں سے بھی زیادہ

خطرناک ہیں اور اس قسم کے شیوخ کے متبعین کو بھی چاہیے کہ وہ ان کے فتوؤں میں مضمر خطرات کو بھی ہمیشہ نگاہ میں رکھیں۔

یہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ کرنا ضروری ہے کہ داعیانِ دین کو کبھی کبھی واقعی اس بات کی ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ اپنی دعوت کو مخفی رکھیں، جیساکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوت کے آغاز میں اسے مخفی رکھا تھا لیکن یہ استثنائی صورت ہے، دعوت کا اصول نہیں ہے۔ ایک ناگزیر ضرورت ہے۔ دعوت کا طریقِ کار اور پروگرام نہیں ہے، خصوصاً حسبِ ذیل ارشاد باری تعالیٰ:

فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ

پس جو حکم تم کو (اللہ تعالیٰ کی طرف سے) ملا ہے وہ (لوگوں کو) سنا دو اور مشرکوں کا (ذرا) خیال نہ کرو۔

کے بعد اس کی ضرورت ہی نہیں کہ دعوت کے تمام پہلو مخفی ہوں، بلکہ ایسی شخصیتوں کا وجود از بس ضروری ہے جو برملا اور علی الاعلان دعوت و تبلیغ کا کام کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں آنے والی ہر تکلیف کو خندہ پیشانی سے گوارا کریں اور سیدنا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مانند ان کی ساری زندگی دعوت الی اللہ کے لیے وقف ہو۔
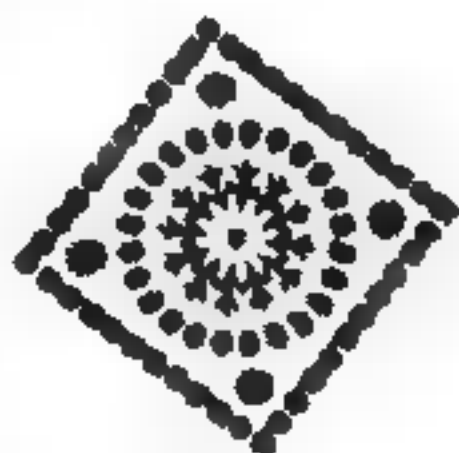
قومِ لوط کی بداخلاقی

حضرت لُوط علیہ السلام کا سلسلۂ نسب اس طرح ہے ، لُوط بن ہاران بن آزر، آپ اپنے چچا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہہ کر مشرف بہ ایمان ہوئے تھے جیساکہ آپ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بابل سے ہجرت کی سعادت بھی حاصل کی تھی، ارشاد باری تعالیٰ ہے :

فَاٰمَنَ لَهٗ لُوْطٌ وَقَالَ اِنِّیْ مُهَاجِرٌ اِلٰی رَبِّیْ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔

آپ پر حضرت لُوط ایمان لے آئے اور انہوں نے کہا کہ میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں، بیشک وہی غالب حکمت والا ہے۔

تمام سفروں میں آپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ رہے، حتیٰ کہ مصر سے واپسی کے بعد سرزمین غور زغر میں سدوم کے مقام پر سکونت پذیر ہوگئے۔ آپ کا قرآن کریم میں ستائیس بار ذکر آیا ہے اور جن سورتوں میں آپ کا تذکرہ ہوا ہے، وہ حسب ذیل ہیں: (۱) اعراف، (۲) ہود (۳) حجر (۴) شعراء (۵) نمل (۶) تحریم [1]

سدوم کے لوگ سب دُنیا سے زیادہ بدکار تھے۔ سب سے زیادہ بدترین سیرت کے مالک تھے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے انبیاء کرام سے جنگ کرتے، زمین میں فتنہ و فساد برپا کرتے،

---

[1] قصص الانبیاء، نجار ص ۸۷۔ مفسرین کے دو قول ہیں کہ "وقال انی مہاجر الی ربی" کی ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیمؑ ہیں یا حضرت لوطؑ — بہرحال یہ بات یقینی ہے کہ حضرت لوطؑ نے حضرت ابراہیمؑ کی معیت میں راہِ خدا میں ہجرت فرمائی تھی۔

راستے منقطع کرتے، دوستوں کی خیانت کرتے، حیا اور شرمندگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی محفلوں میں علی الاعلان منکرات کا ارتکاب کرتے اور ان میں کوئی ایک بھی رجل رشید نہ تھا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُونَ ۝ [1]

اور (اس طرح جب ہم نے) لوط کو پیغمبر بنا کر بھیجا، تو اُس وقت انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم ایسی بے حیائی کا کام کیوں کرتے ہو کہ تم سے پہلے اہلِ عالم میں سے کسی نے اس طرح کا کام نہیں کیا، یعنی خواہشاتِ نفسانی پورا کرنے کے لیے عورتوں کو چھوڑ کر لونڈوں پر گرتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تم لوگ حد سے نکل جانے والے ہو۔

اور فرمایا:

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ أَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ وَأَنتُمْ تُبْصِرُونَ ۝ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّن دُونِ النِّسَاءِ ۚ بَلْ أَنتُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُونَ ۝ [2]

اور لوط کو (یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم بے حیائی (کے کام) کیوں کرتے ہو اور تم دیکھتے ہو، کیا تم عورتوں کو چھوڑ کر لذت (حاصل کرنے) کے لیے مردوں کی طرف مائل ہوتے ہو، حقیقت یہ ہے کہ تم احمق لوگ ہو۔

اور فرمایا:

---

[1] سورۃ الاعراف، آیت ۸۰-۸۱

[2] سورۃ النمل، آیت ۵۴-۵۵

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ ۡ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَىِٕنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُوْنَ السَّبِيْلَ وَتَاْتُوْنَ فِيْ نَادِيْكُمُ الْمُنْكَرَ۔ ^(1)	اور لوط کو یاد کرو، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم (عجب) بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو تم سے پہلے اہل عالم میں سے کسی نے ایسا کام نہیں کیا۔ کیا تم (لذت کے ارادے سے) لونڈوں کی طرف مائل ہوتے اور (مسافروں کی) راہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام کرتے ہو۔

اور فرمایا:

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ ِۨ الْمُرْسَلِيْنَ ۚ اِذْ قَالَ لَهُمْ اَخُوْهُمْ لُوْطٌ اَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ اِنِّيْ لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِيْنٌ ۝ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝ وَمَآ اَسْــَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ ۚ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا عَلٰي رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَتَاْتُوْنَ الذُّكْرَانَ مِنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَتَذَرُوْنَ مَا خَلَقَ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ اَزْوَاجِكُمْ ۭ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ عٰدُوْنَ ۝ ^(2)	(اور) قوم لوط نے بھی پیغمبروں کو جھٹلایا، جب اُن سے اُن کے بھائی لوط نے کہا کہ تم کیوں نہیں ڈرتے، میں تو تمہارا امانت دار پیغمبر ہوں، تو خدا سے ڈرو اور میرا کہا مانو اور میں تم سے اس (کام) کا بدلہ نہیں مانگتا۔ میرا بدلہ (خدائے پاک) رب العالمین کے ذمے ہے۔ کیا تم اہل عالم میں سے لڑکوں پر مائل ہوتے ہو اور تمہارے پروردگار نے جو تمہارے لیے تمہاری بیویاں پیدا کی ہیں ان کو چھوڑ دیتے ہو۔ حقیقت تو یہ ہے کہ تم حد سے نکل جانے والے لوگ ہو۔

---

^(1) سورۃ العنکبوت، آیت ۲۸-۲۹ ^(2) سورۃ الشعراء آیت ۱۶۰-۱۶۶

حضرت لوط علیہ السلام کی قوم فحاشی میں مبتلا تھی، وہ عورتوں کے بجائے مردوں سے اپنی جنسی تسکین کرتی تھی، یہ اس قدر گندہ کام ہے کہ اس سے پہلے اور کسی قوم نے اس کا ارتکاب نہیں کیا تھا۔ اکثر آیات جن میں حضرت لوط علیہ السلام کا نام آیا ہے۔ ان میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ آپ کی قوم کی فطرت خراب ہو چکی تھی کہ اس نے ان عورتوں کو تو ترک کر دیا جنہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی جنسی تسکین کے لیے پیدا فرمایا ہے اور اس کے بجائے وہ مردوں سے اپنی ضرورت کو پورا کرتے تھے۔

حضرت لوط علیہ السلام کی دعوت کی سب سے اہم بات یہ تھی کہ آپ اس بُرائی و بے حیائی کے کام کی سخت مذمت فرماتے تھے، کیونکہ اگر وہ لوگ ایمان باللہ اور عدم شرک کی دعوت کو قبول بھی کر لیتے، تو اس کے کوئی معنی نہ تھے، جب تک وہ اپنی ان خبیث عادات کو نہ ترک کرتے، جن میں ساری قوم مبتلا تھی، ارتکاب کرتے ہوئے کسی ستر پوشی کی ضرورت بھی محسوس نہ کرتی بلکہ یہ بدکاری اُن کی زندگی میں اس قدر رچ بس چکی تھی کہ حضرت لوط علیہ السلام نے جب اسے ترک کر دینے کی دعوت دی، تو آپ کی قوم نے اس پر انتہائی تعجب کا اظہار کیا۔ مردوں سے جنسی تسکین کو حاصل کرنا اگر صرف چند لوگوں کی عادت ہوتی، تو مجرم چوری چھپے اس جرم کا ارتکاب کرتے، مگر یہ قوم سب کی سب اس جرم میں مبتلا ہو چکی تھی کہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے کہ اس قوم میں ایک بھی رجل رشید نہ تھا۔ یہاں ایک اہم بات کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک نبی کو اس لیے مبعوث فرمایا کہ وہ اپنی قوم کو ہدایت کا راستہ بتائیں اور اُس کے ان اخلاق و عادات کی اصلاح فرمائیں، جو خراب ہو چکے ہوں، اس سے معلوم ہوا کہ حضرات انبیاء کرام کی کوشش ہوتی تھی کہ وہ ان بیماریوں کا علاج کریں کہ جس میں قوم مبتلا ہوں، خواہ اس سلسلے میں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینا پڑیں۔ ہمارے دور کے بعض داعیانِ دین کا طرزِ عمل حضراتِ انبیاء کرام کے طریق کار کے مخالف ہے، کیونکہ یہ دور از کار باتیں کرتے ہیں اور ان مسائل سے سکوت اختیار کرتے ہیں، جن پر لب کشائی طاغوتی طاقتوں کے غضب کو بھڑکانے کا باعث ہو، یعنی یہ دُعاۃ و مبلغین اس قسم کی بے ضرر سی دعوت دیتے ہیں اور ایسی دعوت سے اجتناب کرتے ہیں جو اُن کے لیے مصائب و آلام کا باعث ہو۔

قوم کی طرف سے حضرت لوط علیہ السلام کی مخالفت

قوم لوط نے نہ صرف یہ کہ اپنے نبی کی دعوت و تبلیغ کو قبول نہ کیا اور اس سے اعراض کیا، بلکہ آپ کو دھمکیاں بھی دیں کہ وہ آپ کو اپنے علاقے سے جلاوطن کر دیں گے اور انہوں نے ان دھمکیوں کے اسباب بیان کرنے سے بھی کوئی ندامت و خجالت محسوس نہ کی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی دھمکی کو اس طرح ذکر فرمایا ہے:

لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰلُوْطُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُخْرَجِيْنَ[1] — کہنے لگے کہ لوط اگر تم باز نہ آؤ گے تو شہر بدر کر دیئے جاؤ گے۔

یعنی آپ کو بستی سے باہر نکال دیا جائے گا اور آپ کی املاک پر قبضہ کر لیا جائے گا۔

یہ دھمکی اسی طرح کی ہے، جس طرح آج کی زبان میں کہا جاتا ہے کہ (NATIONALATY) سے محروم کر دیا جائے گا۔ آپ کی جلاوطنی کا سبب اُن کے نزدیک یہ تھا:

اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ[2] — لوط کے گھر والوں کو اپنے شہر سے نکال دو یہ لوگ پاک بننا چاہتے ہیں۔

یعنی یہ لوگ کہتے تھے کہ حضرت لوط نیکی کا حکم دیتے ہیں، برائی سے منع کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی توحید اختیار کرنے اور شرک نہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں، مردوں سے ہم جو جنسی ضرورت پورا کرتے ہیں، اس سے ہمیں منع کرتے ہیں اور فواحش و منکرات، بغاوت اور گناہ کے کاموں سے یہ اجتناب کرتے ہیں۔

باغیوں اور سرکشوں کی یہ عادت معروف ہے کہ وہ حقائق کو مسخ کر دیتے ہیں۔ مبلغین و دعاۃ کی طرف بُرے کام منسوب کرتے ہیں اور بزعمِ خود اپنے آپ کو مصلح قرار دیتے ہیں۔ قوم لوط نے تو

---

[1] سورۃ الشعراء، آیت ۱۶۷ [2] سورۃ النمل، آیت [illegible]

نہایت صراحت و وضاحت اور واشگاف انداز میں کہا کہ پاکباز لوگوں کے لیے ہماری زمین میں کوئی جگہ نہیں اور ہم عزت وعفت نامی کسی چیز کو تسلیم کر لینے کے لیے تیار نہیں۔

عصر حاضر کے طاغوت بھی بہت سے پہلوؤں سے قوم لوط کے ساتھ مشابہت رکھتے ہیں، مثلاً مبلغین و دعاۃ کو جلا وطن کرنا، فحاشی و بے حیائی کے دلدادہ لوگوں کی حوصلہ افزائی کرنا مجرموں اور شراب اور دیگر منشیات کے تاجروں کے ساتھ تعاون کرنا اور ملحدین، مفسدین، اور بے دین لوگوں کو اونچے اونچے عہدوں پر فائز کر دینا وغیرہ۔ کسی شاعر نے کہا ہے ؎

فإن لم تكونوا قوم لوط بعينهم

فما قوم لوط منكم ببعيد

(اگر تم بعینہٖ قوم لوط نہیں بھی ہو تو قوم لوط تم سے کوئی بعید بھی نہیں ہے)

ہمارے دور کے یہ طاغوت قوم لوط سے صرف ایک ہی پہلو سے مختلف ہیں کہ یہ لوگ برائی و بے حیائی کو اس کے نام سے موسوم نہیں کرتے اور بزعم خویش یہ لوگ اپنے آپ کو اصلاح و انقلاب کے علمبردار سمجھتے ہیں۔ دعوت الی اللہ کے میدان میں کام کرنے والوں کو یہ مجرم اور راہزن قرار دیتے ہیں۔

قوم لوط کی حماقت و جہالت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ انہوں نے عذاب الٰہی کی جلد آمد کا مطالبہ شروع کر دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَلُوطًا إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ إِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُم بِهَا مِنْ أَحَدٍ مِّنَ الْعَالَمِينَ ۝ أَئِنَّكُمْ لَتَأْتُونَ الرِّجَالَ وَتَقْطَعُونَ السَّبِيلَ وَتَأْتُونَ فِي نَادِيكُمُ الْمُنكَرَ

اور لوط (کو یاد کرو) جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ تم (عجب) بے حیائی کے مرتکب ہوتے ہو۔ تم سے پہلے اہل عالم میں سے کسی نے ایسا کام نہیں کیا۔ کیا تم (لذت کے ارادے سے) لونڈوں کی طرف مائل ہوتے اور (مسافروں کی) رہزنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں ناپسندیدہ کام

فَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ	کرتے ہو تو اُن کی قوم کے لوگ جواب میں بولے
اِلَّآ اَنْ قَالُوا ائْتِنَا بِعَذَابِ	تو یہ بولے کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب لے
اللّٰهِ اِنْ كُنْتَ مِنَ	آؤ (لوط نے) کہا کہ اے میرے پروردگار
الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ رَبِّ	ان مفسد لوگوں کے مقابلے میں مجھے نصرت
انْصُرْنِيْ عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ[1]	عنایت فرما۔

انہوں نے جو یہ مطالبہ کیا کہ اگر تم سچے ہو تو ہم پر عذاب لے آؤ، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بدترین لوگوں کا یہ خیال تھا کہ حضرت لوط علیہ السلام سچے نہیں ہیں، ان پر کبھی عذاب نہیں آسکتا، کبھی کوئی مصیبت نہیں ٹوٹ سکتی۔ ان کے حالات میں کبھی بھی کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا بلکہ ان کی مرضی و منشا کے مطابق زمانہ اُن کے لیے اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ سازگار رہے گا۔

"اے میرے پروردگار! ان مفسد لوگوں کے مقابلہ میں مجھے نصرت عنایت فرما۔"

حضرت نوح علیہ السلام کا پیمانہ صبر بھی جب لبریز ہو گیا، تو آپ نے اسی طرح کی دُعا کی اور لوط علیہ السلام نے بھی جب یہ دیکھا کہ آپ کی قوم کی احکامِ الٰہی کے مقابلے میں جرأت بہت بڑھ گئی ہے۔ فسق و فجور کی تمام حدود سے تجاوز کر گئے ہیں اور اخلاق و کردار کی تمام قدروں کو انہوں نے اپنے پاؤں تلے روند ڈالا ہے، تو دُعا کی۔

آپ نے اپنی ضعفِ قوّت، کمی تدبیر اور قوم کے مقابلہ میں کمزوری کا اظہار کرتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں جب مذکورہ دُعا کی، تو آپ کا دل اس یقین سے سرشار تھا کہ اللہ تعالیٰ نہ آپ کا ساتھ چھوڑے گا اور نہ آپ کو رُسوا ہونے دے گا، کیونکہ آپ اللہ تعالیٰ کے نیک بندے اور سچے نبی تھے اور پھر ان نیک بندوں کی مدد کرنا جو اسبابِ نصرت کو اختیار کریں، اللہ تعالیٰ کی ایک ایسی سنتِ ثابتہ ہے جس میں کوئی تغیر و تبدل رُونما نہیں ہو سکتا۔

---

[1] سورۃ العنکبوت، آیت ۲۸ — ۳۰

فرشتوں نے اپنے پروگرام کے بارے میں

لوطؑ سے پہلے حضرت ابراہیمؑ کو کیوں خبر دی؟

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی حضرت لوط علیہ السلام کی دُعا، "رَبِّ انْصُرْنِي عَلَى الْقَوْمِ الْمُفْسِدِيْنَ" کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور قوم لوط کی طرف اپنے فرشتے بھیج دیئے تاکہ وہ سدوم کی اس بستی کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکیں جو نیک لوگوں کے وجود سے خالی ہو چکی تھی، جن کے لیے وعید و تہدید بھی بے سُود ثابت ہوئی تھی اور طویل عرصہ تک دعوت و تبلیغ میں مصروف رہنے کے باوجود ایک آدمی نے بھی اللہ تعالیٰ کے پیغمبر حضرت لوطؑ کی دعوت پر لبیک نہیں کہا تھا۔

اللہ تعالیٰ کی مشیت یہ تھی کہ قوم لوطؑ کی تباہی کے لیے متعین فرشتے سب سے پہلے "تیمن" نامی بستی میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے ملاقات کریں۔ حضرت ابراہیمؑ کے پاس جب یہ انسانی صورتوں میں آئے تو آپ نے انہیں بالکل نہ پہچانا، ہاں البتہ جو عمدہ سے عمدہ کھانا میسر ہو سکتا تھا وہ آپ نے اُن کی خدمت میں پیش کیا، اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جُود و سخا اور مہمان نوازی ایک فطری خوبی اور طبعی وصف ہے جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور دیگر انبیاء کرام متصف تھے۔

آپ نے جب یہ دیکھا کہ مہمان گائے کے بھنے ہوئے گوشت کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہے، تو آپ نے ڈر سا محسوس کیا، تو فرشتوں نے فوراً اپنا تعارف کرا دیا اور اپنی آمد کا مقصد اور وہ مقصد بھی بتا دیا جس کے لیے اللہ رب العزت نے ان کی ڈیوٹی لگائی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے قوم لوطؑ کی بابت ان فرشتوں سے جھگڑا شروع کر دیا، کیونکہ آپ بڑے حلیم، نرم خُو اور رحمدل تھے۔

آپ چاہتے تھے کہ قوم لوط اس بدترین انجام سے دوچار نہ ہو جیسا کہ آپ یہ ڈر بھی محسوس کرتے تھے کہ کہیں حضرت لوط علیہ السلام کو بھی کوئی تکلیف نہ پہنچے۔

فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کو یہ کہہ کر ختم کر دیا کہ اس بستی کی تباہی کا اللہ تعالیٰ نے فیصلہ فرما لیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر کو ٹالا نہیں جا سکتا، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام تو خود اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ جب امرِ الٰہی آجائے تو اس میں ایک لمحہ کی بھی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔

اس مبارک ملاقات کے دوران فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے اسحاق اور اسحاق کے بیٹے یعقوب کی بشارت سنائی۔ نیز یہ خوشخبری بھی کہ قوم لوط کی تباہی کے دوران حضرت لوطؑ کو قطعاً کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ ہاں البتہ آپ کی بیوی کو معاف نہیں کیا جائے گا، کیونکہ وہ خائن تھی اور حضرت لوطؑ کی باتیں اپنی قوم کو جا کر بتا دیا کرتی تھی۔ فرشتوں کی اس ملاقات سے جو شخص زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہے وہ سورۂ ہود، حجر، عنکبوت اور ذاریات کا مطالعہ فرمائے۔

سوال یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے قبل حضرت ابراہیمؑ کو اپنے پروگرام کے بارے میں کیوں خبر دی، حالانکہ ان کا پروگرام سدوم میں تھا نہ کہ تیمن میں؟

ہمارے جواب اس سلسلہ میں حسب ذیل ہیں:

(۱) بابل میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والے سب سے پہلے شخص حضرت لوط علیہ السلام تھے جو اکثر آلام و مصائب میں آپ کے ساتھ بھی شریک رہے۔ آپ کی معیت میں انہوں نے اللہ کی راہ میں ہجرت بھی کی۔ اللہ تعالیٰ نے جب انہیں نبوت عطا فرمائی تو پھر بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تعلقات منقطع نہ ہوئے، کیونکہ دونوں کے مابین بہت سی قدریں مشترک تھیں۔ دونوں حزبِ الٰہی کے رکن تھے، اگرچہ مرتبہ کے اعتبار سے فرق تھا یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام ابو الانبیاء، خلیل الرحمٰن اور اولو العزم انبیاء کرام میں سے ہیں اور خاتم الانبیاءؐ والمرسلین حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد دیگر تمام انبیاء کرام سے مقام و مرتبہ کے اعتبار

سے سب سے بڑے ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ مسلمان جو ایک ہی دور میں اور قریب قریب کے علاقوں میں رہ رہے ہوں، ان کے مابین روابط اور تعلقات نہ ہوں۔

(۲) کچھ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت لوطؑ کے نبی بننے کے بعد حضرت ابراہیمؑ سے تعلقات نہ تھے اور پھر یہ فرشتوں کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ کسی ایسے شخص کے پاس جائیں جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے انہیں بھیجا ہی نہ ہو اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے بھی یہ جائز نہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے فرشتوں سے قومِ لوط کی بابت جھگڑا کر کے دخل در معقولات دیتے۔

کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یا فرشتوں کے بارہ میں اس طرح کے خیالات کا اظہار کرے۔ سابقہ ساری تفصیل سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سدوم پر آنے والے عذاب کی اطلاع دینے کے لیے ان کے پاس آئے، کیونکہ آپ اس بات کے مستحق تھے کہ آپ کو حضرت لوط علیہ السلام سے قبل اس واقعہ کی اطلاع ہو کیونکہ آپ اُن کے قائد اور استاد تھے، جیسا کہ اپنے عہد کے ہر موحد کے بھی قائد تھے۔ فرشتوں نے آپ کو اطلاع دینے کے لیے آپ کے پاس قیام کیا، وگرنہ وہ چشم زدن میں بلا توقف سدوم پہنچ سکتے تھے۔

(۳) ہم نے آیاتِ قرآنیہ سے یہ مفہوم اخذ کیا ہے کہ آپ حضرت لوطؑ کے قائد و امام تھے۔ نیز اپنے عہد کے ہر موحد کے بھی قائد تھے، تاہم اس میں بھی کوئی مضائقہ نہیں کہ اپنے موقف کی تائید و حمایت میں ہم محققین اور مؤرخین کے اقوال بھی پیش کر دیں۔ چنانچہ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں:

"لوط علیہ السلام نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حکم سے اپنے مال و دولت کے انبار سے علیحدگی اختیار کر لی اور سرزمینِ غور کی طرف رختِ سفر باندھ لیا۔"

ہمارا اس سے استدلال یہ ہے کہ حضرت لوطؑ، حضرت ابراہیمؑ کے حکم سے غور کی طرف گئے تھے اور اس طرح کا حکم صرف سپہ سالار ہی اپنے کسی سپاہی کو دے سکتا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

سرکشوں کے ایک ٹولے نے حضرت لوطؑ پر تسلط جما لیا تھا۔ انہوں نے آپ کو گرفتار کیا

مال و دولت کو چھین لیا، آپ کے مویشی ہانک کر لے گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب اس واقعہ کی اطلاع ہوئی، تو آپ تین سو اٹھارہ لوگوں کی معیت میں گئے اور ظالموں کے قبضہ سے حضرت لوطؑ کو چھڑایا، مال و دولت واپس دلائے۔ اللہ اور اُس کے رسولوں کے دشمنوں میں سے ایک جم غفیر کو تہ تیغ کر دیا اور انہیں شکستِ فاش سے دوچار کیا۔ ان کا تعاقب کرتے کرتے آپ دمشق کے شمال میں چلے گئے۔ جبکہ لشکر بیرونی جانب مقام برزہ کی طرف چلا گیا۔ [1]

ہم نے اس بات پر کہ حضرت ابراہیم و لوط علیہما السلام کے آپس میں گہرے روابط تھے، [2] اس لیے زور دیا ہے تاکہ مسلمان اس بات کو اچھی طرح معلوم کر لیں، خواہ وہ جہاں بھی ہوں اور جس ملک میں بھی رہ رہے ہوں کہ حزب الٰہی سے وابستہ سب لوگ ایک ہی جماعت ہیں سب کا ایک مشن اور ایک ہی نصب العین ہے، سب کی ایک ہی قیادت ہے، مگر افسوس کہ آج ہماری قیادتیں جو متعدد ہیں اور ہماری جماعتوں میں جو اختلاف ہے، اس صورتِ حال کو کسی طرح بھی مستحسن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اس بیماری کے علاج کے لیے ہر مسلمان کو اپنی ذمہ داری کا احساس کرنا چاہیے تاکہ مسلمان پھر سے پہلے کی مانند ایک بہترین اُمت بن جائیں، لوگوں کی بہتری و بھلائی کے لیے سرگرم عمل ہوں اور اللہ تعالیٰ کے دین کو سرفرازی و سربلندی نصیب ہو

---

[1] قصص الانبیاء، ابن کثیر ۱۹۸ ـ ۹۹/۱ تحقیق عبدالواحد

[2] کتاب طبع ہونے سے پہلے ایک دوست نے جب اس مقام کو ملاحظہ کیا، تو انہوں نے اس مسئلہ میں مجھ سے اتفاق نہیں کیا، کیونکہ ان کے بقول اس سلسلہ میں میرے پاس کوئی دلیل نہیں اور نہ ہی مجھ سے پیشتر کسی نے اس قول کو اختیار کیا ہے۔ اپنے اس دوست کے ان خیالات کی میں قدر کرتا ہوں، لیکن اس کے باوصف میں نے جو موقف اختیار کیا ہے، اس پر میرا دل مطمئن ہے کیونکہ نصِ قرآنی کو میں نے کسی ایسے معنی پر محمول نہیں کیا، جس کی گنجائش ہی نہ ہو اور نہ اس نص کے سمجھنے میں مَیں نے کسی نص شرعی یا کسی اسلامی اصول کی مخالفت کی ہے۔

قوم لوط کی تباہی

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَمَّا جَآءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا
سِيٓءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ
ذَرْعًا وَّقَالَ هٰذَا يَوْمٌ عَصِيْبٌ ۝
وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ
اِلَيْهِ ؕ وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ
السَّيِّاٰتِ ؕ قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ
بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا
اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ؕ
اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝
قَالُوْا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِيْ
بَنٰتِكَ مِنْ حَقٍّ ۚ وَاِنَّكَ
لَتَعْلَمُ مَا نُرِيْدُ ۝ قَالَ لَوْ
اَنَّ لِيْ بِكُمْ قُوَّةً اَوْ اٰوِيْٓ اِلٰى
رُكْنٍ شَدِيْدٍ ۝ قَالُوْا يٰلُوْطُ
اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا
اِلَيْكَ فَاَسْرِ بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ

اور جب ہمارے فرشتے لوط کے پاس آئے تو
وہ ان (کے آنے) سے غمناک اور تنگ دل
ہوئے اور کہنے لگے کہ آج کا دن بڑی مشکل کا
دن ہے اور لوط کی قوم کے لوگ ان کے پاس
بے تحاشا دوڑتے ہوئے آئے اور یہ لوگ پہلے
ہی سے فعل شنیع کیا کرتے تھے۔ (لوط نے) کہا
کہ اے قوم! یہ (جو) میری (قوم کی) لڑکیاں ہیں
یہ تمہارے لیے (جائز اور) پاک ہیں، تو اللہ سے
ڈرو اور میرے مہمانوں (کے بارے) میں میری
آبرو نہ کھوؤ۔ کیا تم میں کوئی بھی شائستہ آدمی نہیں؟
وہ بولے تم کو معلوم ہے کہ تمہاری (قوم کی) بیٹیوں
کی ہمیں کچھ حاجت نہیں ہے اور جو ہماری غرض ہے
اسے تم خوب جانتے ہو (لوط نے) کہا کہ اے کاش
مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا کسی مضبوط
قلعے میں پناہ پکڑ سکتا۔ فرشتوں نے کہا لوط ہم تمہارے
پروردگار کے فرشتے ہیں۔ یہ لوگ تم تک ہرگز نہیں

مِنَ الَّيْلِ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ ط اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَآ اَصَابَهُمْ ط اِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ ط اَلَيْسَ الصُّبْحُ بِقَرِيْبٍ ۝ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ لا مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ ط وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝[1]

پہنچ سکیں گے تو کچھ رات رہے سے اپنے گھر والوں کو لے کر چل دو اور تم میں سے کوئی شخص پیچھے پھر کر نہ دیکھے، مگر تمہاری بیوی کو جو آفت ان پر پڑنے والی ہے، وہی اُس پر پڑے گی۔ ان کے (عذاب کے) وعدے کا وقت صبح ہے اور کیا صبح کچھ دُور ہے؟ تو جب ہمارا حکم آیا ہم نے اس (بستی) کو (الٹ کر) نیچے اوپر کر دیا اور ان پر پتھر کی تہ بہ تہ (پے در پے) کنکریاں برسائیں جن پر تمہارے پروردگار کے ہاں سے نشان کیے ہوتے تھے اور وہ (بستی ان) ظالموں سے کچھ دُور نہیں۔

سِیْٓءَ بِهِمْ — آپ فرشتوں کی آمد سے غمناک اور تنگ دل اس لیے ہوئے کہ آپ کو اپنی قوم کی طرف سے بدتمیزی کا خدشہ تھا جیسا کہ مفسرین نے کہا ہے یہ فرشتے جب ارضِ سدوم میں آئے، تو بڑے ہی خوبصورت نوجوانوں کی صورت میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے قوم لوط کی آزمائش کی خاطر انہیں اس روپ میں بھیجا تھا۔

طبری نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی روایت بیان کی ہے کہ جب فرشتے لوط علیہ السلام کے پاس آئے، اس وقت آپ اپنی زمین میں کام کر رہے تھے، فرشتوں سے کہا گیا تھا۔ واللہ اعلم کہ قوم لوط کو اس وقت تک ہلاک نہ کرنا جب تک حضرت لوط خود مشاہدہ نہ کرلیں، فرشتے جب آپ کے پاس آئے، تو کہنے لگے کہ آج رات ہم آپ کے مہمان ہوں گے۔ آپ انہیں اپنے ساتھ لے کر چل پڑے اور کچھ دیر چلنے کے بعد ان سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تمہیں خبر نہیں کہ اس بستی کے لوگ کس قدر برا کام کرتے ہیں بخدا روئے زمین پر ان سے زیادہ خبیث لوگ نہیں ہیں۔ آپ ان کے ساتھ

---

[1] سورۃ ہود، آیت ۷۷ ـ ۸۳

ساتھ چلتے رہے۔ پھر یہی بات دوہرائی۔ چلتے چلتے آپ انہیں لے کر گھر پہنچ گئے۔ جب آپ کی بدترین بیوی نے دیکھا، تو اُس نے اُن کو ڈرایا دھمکایا۔ ؎

وَجَآءَهٗ قَوْمُهٗ يُهْرَعُوْنَ اِلَيْهِ — آپ کی قوم کے لوگ آپ کے پاس بے تحاشا دوڑتے ہوئے آئے۔ ان کے اعصاب پر بڑی ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ گویا کوئی انہیں ہانک کر لا رہا ہے۔ حضرت نے بڑی کوشش فرمائی کہ ان مہمانوں کی آمد کا راز مخفی رہے، مگر اس بُری عورت نے اس راز کو فاش کر دیا جس کا نتیجہ قوم لوط کی تباہی و بربادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ حالانکہ حضرت لوطؑ کو خبر بھی نہ تھی کہ اللہ تعالیٰ انہیں کس طرح کیفرِ کردار تک پہنچانے والے ہیں۔

وَمِنْ قَبْلُ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ السَّيِّاٰتِ — بے شمار قسم کی بدترین باتیں جن میں قوم لوط مبتلا تھی، ان میں سرِ فہرست یہ تھی کہ وہ عورتوں کے بجائے مردوں سے اپنی جنسی ضرورت پوری کیا کرتے تھے اور پھر اپنی محفلوں میں یہ کام سرِ عام کرتے تھے۔

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ اَلَيْسَ مِنْكُمْ رَجُلٌ رَّشِيْدٌ ۝ — آپ اپنی قوم کو منع فرماتے اور انہیں اس بے حیائی کے ارتکاب سے منع کرتے، مگر وہ اس دروازے کو کھولنے پر اصرار کرتے جسے بند کر دیا گیا تھا، جب آپ انہیں باز رکھنے سے عاجز و قاصر آ گئے اور مہمانوں کے سلسلہ میں ذلت و خواری کا خدشہ محسوس فرمانے لگے، تو آپ نے فرمایا:

قَالَ يٰقَوْمِ هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ — کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی فاسق و مجرم قوم کے سامنے اپنی بیٹیوں کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ ان سے جس طرح چاہو مستفید ہو جاؤ، لیکن یہ بات بالکل بے دلیل ہے اور حضرات انبیاء و مرسلین کرام کی بابت اہل سنت کا جو عقیدہ ہے، یہ اُس کے بھی مخالف ہے۔ اس طرح کی بات تو کوئی شریف آدمی بھی نہیں کر سکتا، چہ جائیکہ اسے اللہ تعالیٰ کے ایک نبی مرسل کی طرف منسوب کیا جائے۔ حضرت لوطؑ

؎ تفسیر طبری ۱۰/۴۰۸

کی دعوت میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ آپ ترکِ لواطت کی دعوت دیتے تھے تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ آپ لواطت سے تو منع فرمائیں، مگر زنا کی دعوت دیں، بلکہ کسی مسلمان کے شایانِ شان ہی نہیں کہ وہ ایسا سوچے کہ حضرت لوط علیہ السلام نے اپنی بیٹیوں کے ساتھ زنا کی دعوت دی؟ آپ نے تو فرمایا تھا۔

هٰٓؤُلَآءِ بَنَاتِيْ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ ـــ طہارت اور زنا تو یکجا ہو ہی نہیں سکتے، جیسے خون کو اگر پیشاب کے ساتھ دھویا جائے تو کیا وہ پاک ہو جائے گا؛ لوط علیہ السلام کے بارے میں اس قسم کا اعتقاد ہرگز ہرگز درست نہیں، خواہ آپ کا یہ گمان بھی کیوں نہ ہو کہ وہ آپ کی اس پیشکش کو قبول نہیں کریں گے، بلکہ اس صورت میں بھی یہ کبیرہ گناہوں میں سے شمار ہوگا؛ کیونکہ یہ امر بالمنکر ہے اور پھر دعوتِ زنا ـــــ هُنَّ اَطْهَرُ لَكُمْ ـــــ کے بھی معارض ہے جیسے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخْزُوْنِ فِيْ ضَيْفِيْ ـــــ کے ساتھ بھی اس کا تعارض واضح ہے کیونکہ زنا تقوٰی نہیں، بلکہ تقوٰی کی عمارت کو منہدم کر دینے والا سنگین جرم ہے۔

یہ اعتقاد رکھنا کہ لوط علیہ السلام نے اپنی قوم کو اپنی بیٹیوں کے ساتھ زنا کی دعوت دی؛ اہل سنت کے عقائد کے مخالف ہے، اس سلسلہ میں کوئی دلیل بھی نہیں، بلکہ یہ بات اسی آیت کے آخری حصہ کے متعارض بھی ہے جس میں طہارت و تقوٰی کی دعوت دی گئی ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر کوئی مضائقہ نہیں کہ ہم ان بعض اقوال کو نقل کر دیں جنہیں مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں بیان کیا ہے۔

سردارانِ قوم نے آپ سے آپ کی حقیقی بیٹیوں کا رشتہ طلب کیا تھا، مگر آپ نے انہیں رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا، مگر آج اپنے مہمانوں کی عزت کے خیال سے آپ نے انہیں رشتہ دینے پر رضامندی کا اظہار کر دیا۔ یہ ابن عباسؓ کا قول ہے۔

آپ نے اس آیت میں درحقیقت بستی کی ان بیٹیوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی جو ان کے نکاح میں تھیں، کیونکہ ہر نبی کی قوم کے مرد بیٹے اور عورتیں اس کی بیٹیاں ہوتی ہیں۔ یہ سب سے

زیادہ ضعیف قول ہے، اس کے قائل مجاہد اور سعید بن جبیر ہیں۔

یہ بات تو بالکل معقول نہیں ہے کہ بستی کے لوگ تو دوڑتے ہوئے آئیں تاکہ فرشتوں سے اپنی ضرورت کو پورا کریں اور حضرت لوط انہیں یہ پیشکش کریں کہ میں تمہارے دو بڑے سرداروں کے نکاح میں اپنی دو بیٹیوں کو دے دیتا ہوں جیسا کہ بعض مفسرین نے ذکر کیا ہے۔

قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ — یعنی انہوں نے کہا کہ لوطؑ آپ جانتے ہیں کہ ہمیں آپ کی بیٹیوں کی کوئی حاجت نہیں، ہم تو وہ چاہتے ہیں، جس سے آپ ہمیں منع فرماتے ہیں۔

قَالَ لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ۔

ابو جعفر (طبری) فرماتے ہیں کہ جب قوم نے فحاشی و سرکشی میں رہنے پر اصرار کیا اور آپ مایوس ہو گئے کہ یہ لوگ اس دعوت پر لبیک کہنے کے لیے بالکل آمادہ نہیں ہو رہے جو آپ نے ان کے سامنے پیش کی ہے، تو آپ نے فرمایا اے کاش! میرے انصار و مددگار ہوتے، جو اس سلسلہ میں میری مدد کرتے یا اے کاش! میں آج کسی مضبوط قلعے میں پناہ پکڑ سکتا، یعنی میرا تعلق کسی ایسے مضبوط خاندان سے ہوتا جو تمہارے مقابلہ میں آج میری مدد کرتا۔ اے کاش! سے شروع ہونے والی اس تمنا کا جواب محذوف ہے اور اس محذوف جواب پر کلام دلالت کر رہا ہے اور خود بخود سمجھ میں آرہا ہے۔[1]

جب لوط علیہ السلام حد درجہ غمناک و تنگ دل ہو گئے اور آپ نے ساری قوم میں سے کوئی شائستہ آدمی بھی نہ پایا، بلکہ ساری قوم بیوقوفوں، فاسقوں، فاجروں اور کافروں پر مشتمل تھی، تو حسرت کے ساتھ آپ بے ساختہ پکار اٹھے۔

لَوْ أَنَّ لِي بِكُمْ قُوَّةً أَوْ آوِي إِلَىٰ رُكْنٍ شَدِيدٍ ۝

---

[1] تفسیر طبری ۱۵/۱۸، ۴، دار المعارف قاہرہ علاوہ ازیں ان آیات کی تفسیر کے لیے تفسیر المنار، محمد رشید رضا ۱۲/۱۳۴، دار المعرفۃ تفسیر القرطبی ۷۶/۱۰، دار الکتاب العربی سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی یہ روایت بیان فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرماتے۔ آپ کسی مضبوط قلعے میں پناہ ڈھونڈتے تھے۔"

حافظ ابن حجر اس حدیث کی شرح میں بیان فرماتے ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اس قوم میں کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ تھا جو نسب میں حضرت کے ساتھ تعلق رکھتا ہو، کیونکہ یہ سب لوگ سدوم کے تھے جو شام کی ایک بستی تھی اور حضرت ابراہیم و لوط علیہما السلام کا تعلق سرزمین عراق سے تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب شام کی طرف ہجرت کی، تو حضرت لوط علیہ السلام نے بھی آپ کے ساتھ ہی ہجرت کی تھی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حضرت لوطؑ کو اہل سدوم کی طرف نبی بنا کر مبعوث فرمادیا۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اے کاش! میرے اعزہ اقارب یہاں ہوتے، تو اُن کی تائید وحمایت اور نصرت واعانت حاصل کر کے تمہیں اپنے مہمانوں سے دُور رکھتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس حدیث کے بعض طرق میں ہے جیسا کہ مسند احمد کی اس روایت میں ہے جسے بطریق محمد بن عمرو از ابی سلمہ از ابی ہریرہؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا گیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ حضرت لوطؑ نے کہا تھا کہ اے کاش! مجھے تمہارے مقابلے کی طاقت ہوتی یا کسی مضبوط قلعے میں پناہ پکڑ سکتا۔ مضبوط قلعے سے آپ کی مراد اعزہ واقارب اور افرادِ خاندان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو قوم کے بلند لوگوں میں سے مبعوث فرمایا ہے۔[1]

يٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّكَ لَنْ يَّصِلُوْٓا اِلَيْكَ

یعنی اے لوط! جمع خاطر رکھیے یہ لوگ آپ کو یا آپ کے مہمانوں کو کوئی تکلیف نہیں پہنچا سکیں گے، کیونکہ اب تو امرِ الٰہی آگیا ہے۔ اب حضرت لوطؑ کو علم ہوا کہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے فرستادہ فرشتوں کے جلو میں ہیں اور ان کا قلعہ تو بے پناہ مضبوط ہے، اس سے آپ کو اطمینانِ قلب کی دولت نصیب ہوگئی اور تمام قلق واضطراب ختم ہوگئے۔ جبریل علیہ السلام کھڑے ہوئے، جیسا کہ مفسرین نے

---

[1] فتح الباری بشرح البخاری ۲۲۶/۷، مطبعۃ البابی الحلبی

ذکر کیا ہے — اور انہوں نے اس سرکش قوم کے لوگوں کے چہروں پر اپنا ایک پر مارا اور ان کی آنکھیں پھوٹ گئیں[1]۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَنْ ضَيْفِهِ	اور ان سے ان کے مہمانوں کو لے لینا چاہا تو
فَطَمَسْنَآ أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا	ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں (سو اب) میرے
عَذَابِي وَنُذُرِ ۝ وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ	عذاب اور ڈرانے کے مزے چکھو اور ان پر
بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ۝ [2]	صبح سویرے ہی اٹل عذاب آ نازل ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت لوطؑ نے فرشتوں سے مطالبہ کیا کہ اب جلد عذاب آجانا چاہیئے تو فرشتوں نے جواب دیا:

إِنَّ مَوْعِدَهُمُ الصُّبْحُ أَلَيْسَ	ان کے (عذاب کے) وعدے کا وقت صبح
الصُّبْحُ بِقَرِيبٍ ۝	ہے اور کیا صبح کچھ دُور ہے؟

صبح تو بہت قریب تھی اور اللہ تعالیٰ کا وعدہ بھی بلاریب سچا تھا، ہر چیز کا اس کے ہاں ایک مقرر اندازہ ہے، لہٰذا ان کی تباہی و ہلاکت میں ذرہ بھر تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی تھی۔ وقت کا تعین طلوعِ آفتاب کے قریب کا تھا۔ ارشاد ہے:

فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُشْرِقِينَ	طلوعِ آفتاب کے وقت انہیں عذاب نے آ لیا۔

نیز فرمایا:

وَقَضَيْنَآ إِلَيْهِ ذَٰلِكَ الْأَمْرَ	اور ہم نے لوط کی طرف وحی بھیجی کہ ان لوگوں
أَنَّ دَابِرَ هَٰٓؤُلَآءِ مَقْطُوعٌ مُّصْبِحِينَ [3]	کی جڑ صبح ہوتے ہوتے کاٹ دی جائے گی

حضرت لوطؑ اپنی دونوں بیٹیوں کے ہمراہ اس بستی سے نکل گئے جس کے باشندے ظالم تھے، البتہ آپ کی بیوی ہلاک و برباد ہونے والوں کے ساتھ تھی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

---

[1] قصص الانبیاء، ابن کثیر / ۲۲۶ [2] سورۃ القمر آیت ۳۷، ۳۸

[3] سورۃ الحجر، آیت ۶۶

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِيْنَ۝

تو وہاں جتنے مومن تھے، ان کو ہم نے نکال لیا، اور اس میں ایک گھر کے سوا مسلمانوں کا کوئی گھر نہ پایا۔

حضرت لوط علیہ السلام اپنی صاحبزادیوں کے ہمراہ رات کو بستی سے باہر نکل آئے۔ مال و متاع کو بھی خیر باد کہہ دیا اور قوم پر جو عذاب آیا، اس طرف نہ تو التفات فرمایا اور نہ کسی ندامت کا اظہار کیا، ارشادِ باری تعالیٰ تھا،

وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ اِلَّا امْرَاَتَكَ اِنَّهٗ مُصِيْبُهَا مَا اَصَابَهُمْ۔

تم میں سے کوئی شخص پیچھے پھر کر نہ دیکھے مگر تمہاری بیوی کہ جو آفت ان پر پڑنے والی ہے، وہی اس پر بھی پڑے گی۔

فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهَا حِجَارَةً مِّنْ سِجِّيْلٍ مَّنْضُوْدٍ ۝ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ وَمَا هِيَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ۝

سِجِّیْل ، نہایت مضبوط اور سخت پتھر

منضود ، جو آسمان سے مسلسل برس رہے تھے۔

مُسَوَّمَة ، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نشان زدہ تھے۔

چند لمحوں بعد ایک زبردست زلزلہ آیا جس سے سارا علاقہ پیوند خاک ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے سارے علاقے کو تہس نہس کر دیا، نیچے کا حصہ اوپر اور اوپر کا حصہ نیچے کر دیا۔ سخت پتھروں کی بارش برسائی اور ساری قوم کو ان کی بدکرداریوں کے باعث تباہ و برباد کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس علاقے کو بحر مردار کی شکل میں تبدیل کر دیا ہے کہ نہ تو یہاں کے پانی سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، اور نہ گرد و پیش کی اراضی سے ــــ یہ واقعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و عظمت کا ایک بہت بڑا نشان ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں سے انتقام لینے پر کس قدر قدرت رکھتے

ہیں جو آپ کے احکام کی مخالفت کریں، انبیاء کرام کی تکذیب کریں اور اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی کریں۔ ارشاد ہے:

وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ○	اور ہم نے ان پر (پتھروں کا) مینہ برسایا سو دیکھ لو کہ گنہ گاروں کا انجام کیسا ہوا۔
وَاَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا فَسَآءَ مَطَرُ الْمُنْذَرِيْنَ ○ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً وَّمَا كَانَ اَكْثَرُهُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ○	اور ان پر مینہ برسایا سو جو مینہ ان (لوگوں) پر برسا جو ڈرائے گئے تھے، وہ برا تھا۔ بیشک اس میں نشانی ہے اور ان میں اکثر ایمان لانے والے نہیں تھے
وَلَقَدْ تَّرَكْنَا مِنْهَا اٰيَةً بَيِّنَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ○	اور ہم نے سمجھنے والے لوگوں کے لیے اس بستی سے ایک کھلی نشانی چھوڑ دی۔

وَمَا هِىَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ بِبَعِيْدٍ ———— یعنی قوم لوط کا علاقہ ان کافروں سے جو ہمارے نبی کی تکذیب کرتے ہیں، کوئی زیادہ دُور نہیں ہے۔ لہٰذا انہیں چاہیے تھا کہ شام کی طرف سفر کے لیے آتے جاتے ہوئے عبرت حاصل کرتے کہ یہاں کے لوگوں کو کس قدر دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا گیا تھا، انہیں ڈرنا چاہیے تھا کہ ہمارے پیغمبر حضرتِ محمد مصطفٰے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی تکذیب کے باعث انہیں بھی کہیں اسی طرح کے عذاب سے دوچار نہ ہونا پڑے، چنانچہ اس مفہوم کی اور بھی بہت سی آیاتِ کریمہ ہیں:

وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ○ وَبِالَّيْلِ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ○	اور تم دن کو بھی ان (کی بستیوں) کے پاس سے گزرتے رہتے ہو اور رات کو بھی تو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟

قومِ لوط کا یہ بحیرہ اور اس کے یہ کھنڈرات سب ظالموں کے لیے باعثِ عبرت ہیں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی علاقے سے ہو اور یہ حماقت و جہالت کی سب سے بدترین قسم ہے کہ مشرک اور جابر لوگ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور مضبوط گرفت سے غافل ہو کر اپنی قوت و طاقت پر اتراتے رہیں۔

حالانکہ انہیں چاہیے کہ اس بات کو کبھی بھی فراموش نہ کریں کہ جس ذاتِ اقدس نے قومِ لوط کو ہلاک کیا اور پھر چند لمحوں میں انہیں صفحۂ ہستی سے حرفِ غلط کی طرح مٹا دیا، اس بات پر بھی قادر ہے کہ انہیں ہلاک کر دے، ان کی حکومت کو پارہ پارہ کر دے، خواہ ان کی طاقت کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو اور پکڑ کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو؟ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ دَمَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلِلْكٰفِرِيْنَ اَمْثَالُهَا۔ [1]

کیا انہوں نے ملک میں سیر نہیں کی تاکہ دیکھتے کہ جو لوگ ان سے پہلے تھے، ان کا انجام کیسا ہوا؟ خدا نے ان پر تباہی ڈال دی اور اسی طرح کا (عذاب) ان کافروں کو ہوگا۔

جی ہاں! کافروں کو بھی اسی طرح کا عذاب ہوگا۔ ہر روز دلائل زیادہ نکھر کر سامنے آ رہے ہیں کہ شیطان کی تدبیر بہت کمزور ہے۔ وہ لوگ جو اللہ تعالیٰ کے اصولوں اور دنیوی نظام سے متعلق ضابطوں سے غافل ہیں۔ وہ بھی بے پناہ خسارہ میں ہیں۔ یہ خسارہ کبھی کبھی فتنہ تک پہنچا دیتا ہے۔ (والعیاذ باللہ سبحانہ وتعالیٰ)

---

[1] سورۂ محمد، آیت ۱۰

لواطت کے خطرناک نتائج

لواطت کے تباہ کن اثرات و نتائج کے سلسلہ میں ہم ذیل میں وہ کچھ ذکر کر رہے ہیں جو اس سلسلہ میں متخصص (SPECiALiST) اہل علم نے بیان کیا ہے:

۱- عورت سے بے رغبتی

لواطت مرد کو عورت سے بے رغبت کر دیتی ہے، بلکہ اس قدر ناکارہ کر دیتی ہے کہ وہ عورت کے ساتھ مباشرت کر ہی نہیں سکتا اور اس طرح وظیفۂ زوجیت ادا کرنے سے جو سب سے اہم مقصد یعنی بقاء نسل ہے، وہ معطل ہو کر رہ جاتا ہے۔ لواطت کے مرض میں مبتلا انسان اگر شادی کر لے تو اس کی بیوی قربانی کا بکرا بن جاتی ہے، اسے وہ سکون، وہ محبت اور وہ شفقت ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی جو شادی شدہ زندگی کا سب سے بڑا تحفہ ہے۔ اس کی زندگی بڑی اجیرن اور اجاٹ ہوتی ہے، یعنی ایسی عورت نہ شادی شدہ ہوتی ہے اور نہ غیر شادی شدہ!

۲- اعصاب پر اثر

یہ بری عادت خود انسان کے اپنے نفس کے خلاف جنگ ہے، اس سے انسان کے اپنے اعصاب حد درجہ متاثر ہوتے ہیں، نفسیاتی طور پر انسان ایک ایسی الجھن میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اسے مرد نہیں ہونا چاہیے تھا، اس کے اس منفی شعور و احساس ہی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ عورتوں کے بجائے ہم جنس پرستی کی طرف اس کا میلان ہو جاتا ہے۔ اس کے ناپاک خیالات عورتوں کی طرف جانے کے بجائے اپنے ہی جیسے مردوں کے تناسلی اعضاء میں دلچسپی لیتے ہیں۔ اس سے آپ اس بات کا سبب بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ بعض گھٹیا کردار کے حامل نوجوان عورتوں کی طرح آرائش و زیبائش کا اہتمام کیوں کرتے ہیں؟ اپنے چہروں پر مختلف قسم کے میک اپ کیوں کرتے ہیں، اپنے ابروؤں اور پلکوں کو کیوں بنا سنوار کر رکھتے

ہیں اور اپنی چال میں نسوانیت کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں؟ اور اس طرح کی دیگر بے شمار باتیں بھی ہیں جن کا ہم ہر جگہ مشاہدہ کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر ہماری آنکھیں اس قسم کے مناظر دیکھتی رہتی ہیں۔ کتبِ طب میں اس علت سے متعلق اور بھی عجیب و غریب عادات کا پتہ چلتا ہے، جن کے ذکر سے ہم صرفِ نظر کرتے ہیں۔

صرف یہی نہیں کہ لواطت کرنے والا نفسیاتی الجھنوں میں مبتلا ہو جاتا ہے بلکہ اس فحاشی کے باعث طبیعی و جسمانی طور پر بھی بے پناہ کمزوری پیدا ہو جاتی ہے۔ اعصابی، نفسیاتی، اور جسمانی امراض کے باعث انسان لذتِ حیات کھو بیٹھتا ہے۔ استرخاء مفاصل کا مرض اسے لاحق ہو جاتا ہے اور اس بے حیائی و برائی کے باعث اور بھی طرح طرح کے اعصابی امراض اس پر اپنا تسلط جما لیتے ہیں۔ ان اعصابی و نفسیاتی امراض میں سے امراضِ خبیثہ، ماسوشیہ اور فیتشزم جیسے امراض بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

۳۔ دماغ پر اثر

ان مذکورہ امراض کے ساتھ ساتھ لواطت انسان کے دماغی توازن کو درہم برہم کر دیتی ہے۔ افکار و تصورات میں بگاڑ پیدا کر دیتی ہے عقل کو ماؤف کر کے انسان کو کند ذہن بنا دیتی ہے اور قوتِ ارادی میں شدید ضعف بھی پیدا کر دیتی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ لواطت سے ان اندرونی رطوبات میں شدید کمی پیدا ہو جاتی ہے، جنہیں غدہ درقیہ (THYROID GLAND) اور غدود جنم دیتے ہیں جو گردے کے اوپر ہوتے ہیں۔ لواطت سے یہ غدود شدید طور پر متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح یہ اپنے کام صحیح طور پر سرانجام نہیں دے سکتے۔

اسی طرح الینر وستانیا اور لواطت کا بھی آپس میں گہرا رابطہ ہے جس کے باعث لواطت کا مریض بھی کند ذہنی، دماغی انتشار، جنون اور جوانی میں موت کا شکار ہو جاتا ہے۔

۴۔ مالیخولیا لواطت مالیخولیا کے مرض کا سبب بھی ہے یا کم از کم اس مرض کے پیدا ہوتے میں ایک نہایت مؤثر کردار ادا کرتا ہے اور اس بے حیائی سے مالیخولیا کے مرض میں بہت زیادہ اضافہ ہو جاتا ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ اس برائی و بے حیائی کے باعث انسان وظیفۂ زوجیت ادا نہیں کر سکتا اور اس کے جسم کے اعصاب کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔

۵۔ لواطت سے تسکین نہیں ہوتی لواطت ایک از حد بُری عادت ہے' اس سے جنسی تسکین ہرگز ہرگز حاصل نہیں ہو سکتی' کیونکہ انسانی طبیعت کے تقاضوں سے اسے ہرگز مناسبت نہیں ہے' اعصابی نظام اس سے درہم برہم ہو جاتا ہے' عضلات اس سے بُری طرح متاثر ہوتے ہیں اور دیگر اعضاء جسم پر بھی اس کا نہایت بدترین اثر پڑتا ہے۔

اگر ہم مباشرت کا علم جنس کی روشنی میں جائزہ لیں اور اس طبعی عمل پر غور کریں جسے تناسلی اعضاء بوقتِ مباشرت انجام دیتے ہیں اور پھر اس عمل کا لواطت کے ساتھ مقابلہ کریں تو ہمیں ان دونوں حالتوں میں زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا اور پھر وہ مقام و محل جسے غیر فطری وضع کے لیے استعمال کیا جاتا ہے' وہ ہرگز اس لائق نہیں کہ اسے اس مقصد کی خاطر استعمال کیا جائے۔

۶۔ استرخاءِ اعصاب جب ایک اور جانب سے آپ لواطت کا جائزہ لیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس سے انسانی جسم کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اعصاب ٹوٹ پھوٹ جاتے ہیں۔ بعض اعضاء مفلوج ہو جاتے ہیں اور براز کا مواد کنٹرول میں نہیں رہتا۔ یہی وجہ ہے کہ اس مرض میں مبتلا فاسق و فاجر لوگ ہمیشہ گندے رہتے ہیں' غیر ارادی اور غیر شعوری طور پر ان کا بول و براز خارج ہوتا رہتا ہے۔

۷۔ لواطت کا اخلاق سے تعلق لواطت ایک اخلاقی اور خطرناک جنسی مرض ہے' اس مرض میں مبتلا لوگ انتہائی بد خلق اور گندی طبیعت کے مالک ہوتے ہیں' حتیٰ کہ یہ لوگ فضائل و رذائل میں تمیز ہی نہیں کر سکتے۔ یہ لوگ ضعیف الارادہ ہوتے ہیں' نہ تو ان کا وجدان انہیں ملامت کرتا ہے' نہ ضمیر روکتا ہے' حتیٰ کہ یہ بدبخت

چھوٹے چھوٹے بچوں پر بھی دست درازی سے باز نہیں آتے اور اس سلسلہ میں یہ ظالم انتہائی قدم اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تاکہ اپنی فاسد غرض کو پورا کر سکیں۔ اس سلسلہ میں یہ لوگ ہر قسم کے جرائم کے ارتکاب کی بھی جرأت کر لیتے ہیں جیسا کہ ہم اکثر سنتے اور اخبار و جرائد میں پڑھتے رہتے ہیں۔ اس قبیل کے جرائم کی تفصیلات عدالتوں سے اور دیگر نقصانات کتب طب سے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔

۸۔ لواطت اور عمومی صحت مذکورہ بالا امراض کے ساتھ ساتھ لواطت کے مریض ضیق الصدر اور خفقانِ قلب میں بھی مبتلا ہو جاتے ہیں اور ان کی عام صحت اس قدر گر جاتی ہے کہ مختلف علل و امراض جب چاہیں حملہ آور ہو سکتے ہیں۔

۹۔ اعضاءِ تناسل پر اثر اسی طرح لواطت سے جسم میں انزال کے بنیادی مرکز بھی کمزور ہو جاتے ہیں، ان میں مادۂ منویہ کم ہو جاتا ہے اور نہایت بُری طرح متاثر ہوتا ہے، حتیٰ کہ یہ ایجادِ نسل کے قابل ہی نہیں رہتا اور لواطت کے مرض میں مبتلا لوگ بانجھ ہو جاتے ہیں۔

۱۰۔ ٹائیفائڈ ان مذکورہ بالا امراض کے ساتھ ساتھ لواطت ٹائیفائڈ کا سبب ہے۔ علاوہ ازیں اس سے اور بھی بہت سے خبیث امراض پیدا ہوتے ہیں، جن کا سبب وہ جراثیم ہوتے ہیں جو مادۂ براز سے لوطی کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں۔ مادۂ براز ان جراثیم سے بھرا ہوتا ہے جو مختلف علل و امراض کا سبب بنتے ہیں۔

۱۱۔ امراضِ زِنا زنا سے جو امراض پیدا ہوتے ہیں، وہ سب لواطت سے بھی پیدا ہو سکتے ہیں اور جن میں یہ امراض پیدا ہو جائیں، ان کو تباہ و برباد کر دیتے ہیں۔ ان کے جسموں کو کھوکھلا اور ان کی رُوحوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔[1]

---

[1] کتاب الاسلام والطب، ڈاکٹر محمد وصفی و فقہ السنۃ، سید سابق، ص ۴۲۹/۲

حضرت اسماعیل علیہ السلام

- ولادت باسعادت
- روایت ابن عباسؓ
- تعمیر بیت اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَّبِيًّا ۝

سورۃ مریم ۵۴

کتاب میں اسمٰعیل کا بھی ذکر کرو' وہ وعدے کے سچے اور (ہمارے) بھیجے ہوئے نبی تھے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت باسعادت

حضرت سارہؑ عقیم تھیں۔ آپ کے بطنِ اطہر سے کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ جب آپ کے سر کے بال سفید ہو گئے اور بڑھاپا طاری ہو گیا، تو انہوں نے اپنے وفادار شوہر کی طرف محبت و شفقت کی نگاہوں سے دیکھا اور اس بات سے بڑی کوفت ہوئی کہ ان کے شوہر کو اپنی زمین اور مویشیوں کی دیکھ بھال کے سلسلہ میں بڑی مشقت و محنت کرنا پڑتی ہے۔ یہ دیکھ کر انہوں نے اپنی خادمہ ہاجرہ کو آپ کے حبالۂ عقد میں دے دیا۔ شاید اللہ تعالیٰ آپ کو ان کے بطن سے کوئی بچہ عطا فرمادے جو آپ کے مشن، دعوت اور نبوت کا وارث بنے، نیز زمینوں، مویشیوں اور دیگر امور کی نگرانی کے سلسلہ میں آپ کا دست و بازو بنے۔

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حضرت ہاجرہ کے بطنِ اطہر سے حضرت اسماعیل علیہ السلام عطا فرما دیئے، لیکن حضرت اسماعیلؑ کی ولادت کے بعد حضرت ابراہیمؑ کی فرحت و مسرت زیادہ دیر تک برقرار نہ رہی، کیونکہ حضرت سارہ کے دل میں غیرت و رقابت پیدا ہو گئی تھی، حتیٰ کہ وہ اب اس بچے اور اُس کی ماں کو دیکھ بھی نہ سکتی تھیں، لہٰذا انہوں نے اپنے خاوند سے یہ مطالبہ کر دیا کہ اس بچے اور اس کی ماں کو کسی ایسی دُور دراز جگہ چھوڑ آؤ تاکہ یہ ان کی شکل نہ دیکھ سکے، ان کی آواز نہ سُن سکے۔

اُدھر اللہ تعالیٰ کی مرضی و مشیت میں بھی ایک پروگرام تھا، جس کے باعث حضرت ابراہیمؑ نے اپنی بیوی کی بات کو قبول کر لیا۔ یہ بھی آپ کی بڑی چہیتی بیوی تھی، اس نے آپ کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے ایمان کو قبول کیا تھا۔ سرزمینِ بابل کی یہی وہ سعادت مند خاتون تھیں جس نے تنہا آپ کی دعوت پر لبیک کہا تھا، یہ آپ کے دُکھ سُکھ میں برابر کی شریک رہی تھیں، مشکلات کے دَور میں، کٹھن سفروں کو برداشت کر کے آپ کے ساتھ ہجرت کی تھی۔ آلام و مصائب کو

خندہ پیشانی سے گوارا کیا تھا، اپنی عزت و آبرو کی پوری پوری حفاظت فرمائی تھی۔ ان قربانیوں اور قربتوں کے باعث یہ سعادت مند خاتون حضرت خلیل الرحمٰن کی حیاتِ مبارکہ کا ایک جزوِ لاینفک بن گئی تھیں۔

اب ہم ذیل میں اس سفر کی تفصیل بیان کریں گے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے حضرتِ اسماعیل علیہ السلام اور اپنی بیوی حضرت ہاجرہ کے ساتھ شام سے شروع کیا تھا اور پھر اس سفر سے لے کر باپ بیٹے کے بیت اللہ شریف کو تعمیر کرنے تک کے واقعات بھی بیان کریں گے۔ اس سلسلہ میں میں نے حضرت ابن عباسؓ کی اس روایت کو جسے امام بخاریؒ نے اپنی "صحیح" میں بیان فرمایا ہے۔ کتبِ حدیث و تاریخ کی دیگر تمام روایات سے زیادہ صحیح و جامع پایا ہے، لہٰذا میں اس روایت کو بیان کروں گا اور حافظ ابن حجرؒ کے تعلیقات و شروح سے بھی استفادہ کروں گا، کیونکہ وہ میدانِ حدیث کے شہسوار ہیں۔ اس ضمن میں میری تعلیقات بہت ہی قلیل اور صرف بقدرِ ضرورت ہوں گی۔

۲۔ روایتِ ابن عباسؓ

عورتوں نے کمر کو باندھنے کے پٹکے کا استعمال سب سے پہلے اُمّ اسماعیلؑ سے سیکھا، انہوں نے اسے اس لیے اختیار کیا تھا تاکہ حضرت سارہ کو آپ کے قدموں کے نشانات کا پتہ نہ چل سکے۔ پھر انہیں اور اُن کے بیٹے کو جبکہ اسماعیلؑ ابھی شیر خوار ہی تھے، حضرت ابراہیمؑ لے آئے اور بیت اللہ کے قریب، بڑے درخت کے پاس، زمزم کے اوپر مسجد حرام کے بالائی جانبؒ انہیں بٹھا دیا۔ ان دنوں مکہ میں کوئی شخص نہ تھا، حتیٰ کہ پانی تک بھی نہ تھا، مگر ان دونوں ماں بیٹے کو یہاں چھوڑ دیا اور تھیلی دے دی جس میں کچھ کھجوریں تھیں اور ایک مشکیزہ دے دیا جس میں کچھ پانی تھا۔ انہیں یہاں چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ واپس لوٹ گئے، تو اُمّ اسماعیل بھی آپ کے پیچھے آئیں اور پوچھنے لگیں کہ اے ابراہیم! آپ ہمیں اس وادی میں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہیں جس میں نہ کوئی مونس و غمخوار ہے، اور نہ کچھ اور؟ حضرت ہاجرہ نے یہ بات کئی بار دہرائی، مگر حضرت ابراہیم علیہ السلام

ان کی طرف کوئی التفات نہ فرما رہے تھے۔ پھر حضرت ہاجرہ نے جب یہ پوچھا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ حکم دیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا ہاں! حضرت ہاجرہ نے کہا پھر وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا[1]

---

[1] غور فرمایئے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی حضرت سارہؑ کی خواہش کے مطابق کس طرح اپنے جگر گوشے اور نور نظر اسماعیل علیہ السلام کو ایک ایسے بے آب و گیاہ صحرا میں چھوڑ دیا، جس میں نہ کوئی مونس و غمخوار تھا اور نہ کوئی یار و مددگار؟ ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کا علم اور رقتِ قلب اور دوسری طرف اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؑ کے بارے میں یہ سخت موقف! آخر یہ کیوں؟ ان دونوں سوالوں کا جواب ہمیں حضرت ہاجرہؑ کے سوال اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب کی روشنی میں نہایت واضح طور پر مل جاتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ: ہاجرہؑ اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو اس قدر کسی دور جگہ چھوڑ دیں کہ وہ ان کی آواز کو بھی نہ سن سکے۔ ادھر اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ ہوا کہ حضرت ابراہیم اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو مکہ میں آباد کریں اللہ تعالیٰ کے اس ارادہ میں جو حکمتیں اور مصلحتیں مخفی تھیں، ان کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے رب کے حکم کو پورا کر دکھایا، اپنے اکلوتے اور ننھے بچے کو وادی غیر ذی زرع میں لا بسایا اور پھر خود واپس پلٹ آئے۔ واپسی کے وقت حضرت ہاجرہ کی طرف نہ دیکھ رہے تھے اور نہ ان کی کسی بات کا جواب دے رہے تھے، مبادا کہ بیوی اور بچے کی محبت کہیں امرِ الٰہی پر غالب نہ آ جائے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سخت موقف پر تو کوئی تعجب نہیں، تعجب تو حضرت ہاجرہؑ کی اس بات سے ہے کہ وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔ ایک عورت ذات ہے، بے آب و گیاہ چٹیل میدان ہے، رہنے بسنے کے لیے کوئی گھر نہیں، میل جول کے لیے لوگ نہیں، پانی کا کوئی چشمہ نہیں کہ خود پی سکے اور اپنے بچے کو پلا سکے۔ اور رزق کا کوئی ذریعہ نہیں!! مگر جب اس خاتون کو یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا ہے، تو انہیں اطمینان ہو گیا اور جنگل کے درندوں اور خونخوار جانوروں کا خوف دل سے نکل گیا، کیونکہ ان کا ایمان تھا کہ جس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ اٹھالیں، اسے کوئی موذی جانور تکلیف نہیں دے سکتا۔ آہ! کس قدر شدید ضرورت ہے اس بات کی کہ ہمارے دعاۃ و علماء کا ایمان بھی حضرت ہاجرہؑ کے ایمان کی طرح مضبوط ہو اور وہ حضرت ہاجرہؑ کی طرح سراپا انقیاد و اطاعت بن جائیں۔

اور پھر واپس لوٹ آئیں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام آگے ہی کی طرف رواں دواں رہے، حتیٰ کہ "ثنیۃ"[1] کے پاس پہنچ گئے کہ بیوی اور بچہ آپ کو اب دیکھ نہیں سکتے تھے، تو آپ نے بیت اللہ کی طرف اپنا منہ کیا[2] اور ہاتھ اٹھا کر یہ دعا مانگی،

---

[1] ابراہیم بن نافع کی کثیر بن کثیر سے روایت میں جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے۔ ثنیۃ کے بجائے "کدار" کا لفظ آیا ہے اور یاد رہے کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کو قدوم میمنت لزوم سے نوازا تھا۔

[2] آپ نے بیت اللہ شریف کی طرف اپنا منہ کیا "حدیث کے ان الفاظ نیز آیت مبارکہ "وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَاهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ" سے بعض علماء نے یہ سمجھا ہے کہ بیت اللہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے اور اسے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ بعض نے کہا ہے کہ اسے سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام نے بنایا تھا، مگر طوفانِ نوح کے باعث یہ ختم ہوگیا تھا، لیکن ان اقوال کی تائید میں کوئی صحیح اور قابلِ اعتماد دلیل نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی صحیح روایت میں یہ نہیں آیا کہ بیت اللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے قبل بنا ہوا تھا جس نے اس سلسلہ میں "مکان البیت" کے الفاظ سے استدلال کیا ہے، تو اس کا یہ استدلال نمایاں اور واضح نہیں ہے، کیونکہ اس مکان سے وہ جگہ مراد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے علم میں تھی۔

ہم نے یہ بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے بھی اس جگہ پر قبہ نصب کیا تھا اور فرشتوں نے آپ سے کہا تھا کہ آپ سے پہلے ہم بھی اس گھر کا طواف کر چکے ہیں اور کشتی بھی اس گھر کے گرد چالیس دن تک طواف کرتی رہی تھی، لیکن یہ سب اسرائیلی روایات ہیں، لیکن ان کے بارے میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ اسرائیلی روایات کی نہ تصدیق کی جاسکتی ہے نہ تکذیب اور نہ ان سے کسی قسم کا استدلال کیا جاسکتا ہے۔ قصص الانبیاء، ابن کثیر ۱/ ۲۲۲ نیز صاحب اضواء البیان ۵/ ۶۴ نے بھی اسی طرح بیان کیا ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ ...... یَشْکُرُوْنَ ؂

اے پروردگار میں نے اپنی اولاد (مکہ) میں جہاں کھیتی باڑی نہیں ہے، لابسائی ہے.. تاکہ (تیرا) شکر کریں۔

ام اسماعیل اب اپنے بچے کو دودھ پلاتی تھیں اور خود اس پانی کو پی کر گزارا کر رہی تھیں حتیٰ کہ جب پانی ختم ہو گیا، تو آپ کو پیاس لگی اور آپ کے بچے کو بھی پیاس ستانے لگی۔ آپ نے دیکھا کہ پیاس کی شدت کے باعث بچہ بے قرار اور بے حال ہو رہا ہے، تو آپ سے بچے کی یہ حالت دیکھی نہ گئی اور وہاں سے ایک طرف کو چل دیں۔ قریب ترین پہاڑ کوہ صفا تھا۔ آپ پہاڑ پر جا کھڑی ہوئیں اور وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آ جائے، مگر کوئی نظر نہ آیا۔ کوہ صفا سے آپ نیچے اتر آئیں اور وادی میں پہنچ کر قمیص کے دامن کو اٹھالیا اور دوڑ کر وادی کو طے کر کے کوہ مروہ پر پہنچ گئیں اور مروہ کی چوٹی پر جا کھڑی ہوئیں اور وادی کی طرف دیکھنے لگیں کہ شاید کوئی نظر آ جائے مگر کوئی بھی تو نظر نہ آیا۔ سات بار آپ نے اسی طرح کیا۔ ابن عباسؓ راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی وجہ سے لوگ (اس واقعہ کی یاد میں) صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔ ؎

؂ سورۃ ابراہیم آیت ۳۷ ؎ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی ملاحظہ فرمایئے کہ "اسی وجہ سے لوگ (اس واقعہ کی یاد میں) صفا و مروہ کے درمیان سعی کرتے ہیں۔" اس میں حضرت ہاجرہؓ کی کس قدر تکریم و تعظیم ہے کہ لوگ ہر سال صفا و مروہ کی سعی کرتے ہیں جیسا کہ آپ نے سعی کی تھی۔ شعوری مشارکت و وحدتِ اُمت کی یہ کس قدر روشن مثال ہے کہ اطراف و اکنافِ عالم کے مسلمان جب یہاں آتے ہیں، تو اُن کے دلوں میں بھی وہی جذبات ہوتے ہیں اور ان کی بھی اسی طرح کی حرکات ہوتی ہیں جیسے اس مقام پر حضرت ہاجرہؓ کے جذبات تھے اور جیسی یہاں حضرت ہاجرہؓ کی حرکات تھیں۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی لکھتے ہیں:

■ اللہ تعالیٰ نے اس اضطراری حرکت کو جو ایک مخلص ترمند سے صادر ہوئی، ایک اختیاری حرکت بنا دیا اور دنیا کے بڑے بڑے ذہین، عبقری اور فلسفی انسان کو بڑے سے بڑے فرماں روا اور بادشاہ کو اس کا پابند کر دیا، چنانچہ جب تک وہ ان دونوں پہاڑیوں کے درمیان سعی نہ کر لیں، ان کا حج بھی (بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۲۴۰ پر)

بالآخر حضرت ہاجرہؑ جب کوہ مروہ پر کھڑی تھیں، تو آپ نے ایک آواز سُنی، کان لگائے تو آپ کو پھر یہی آواز سنائی دی۔ آپ نے فرمایا کہ آواز تو آرہی ہے، لیکن اگر آپ کوئی مدد کر سکتے ہیں، تو کیجیے۔ چنانچہ آپ نے مقام زمزم کے قریب ایک فرشتے کو دیکھا[1] جس نے اپنی ایڑی یا پَر مارا اور اس سے پانی نکل آیا، آپ نے اسے حوض کی سی شکل دینا شروع کردی، پانی کو مشکیزہ میں بھرنا شروع کر دیا جیسے جیسے آپ اس چشمہ سے پانی لیتیں، وہ مزید اُبل اُبل پڑتا۔ ابن عباسؓ راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ تعالیٰ امّ اسماعیل پر رحم فرماتے، اگر وہ اس پانی کو اسی طرح چھوڑ دیتیں، تو زمزم ایک رواں دواں چشمے کی صورت اختیار کرلیتا۔ حضرت ہاجرہؑ نے پانی پیا اور بچے کو دودھ پلانا شروع کر دیا۔ فرشتے نے کہا ضائع ہونے کا خدشہ دل سے نکال دو[2] یہاں تو اللہ تعالیٰ کا گھر ہے جسے یہ بچہ اور اس کا باپ تعمیر کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ضائع نہیں کیا کرتے۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۳۹) پورا نہیں ہوسکتا، یہ دونوں پہاڑیاں دراصل ہر محب و مشتاق کی منزل ہیں اور یہ سعی اس دنیا میں مؤمن کے موقف کی بہترین تمثیل ہے، اس لیے کہ وہ بھی مثل جذبہ، احساس اور عقیدہ دونوں کا جامع ہوتا ہے، وہ عقل سے بھی پوری طرح کام لیتا ہے اور اپنی زندگی کے مصالح و ضروریات میں اس سے فائدہ اٹھاتا ہے، لیکن کبھی کبھی اپنے ان دلی جذبات کے سامنے بھی سر جھکا دیتا ہے، جن کی جڑیں عقل سے بھی زیادہ مضبوط اور گہری ہوتی ہیں، وہ ایک ایسی دنیا میں بستا ہے جو ترغیبات، جنسی خواہشات، زینت و آرائش اور مظاہر سے بھری ہوئی ہے، لیکن صفا و مروہ کے درمیان سعی کرنے والے کی طرح وہ کسی طرف نظر اٹھائے اور کبھی اور چیز میں اٹکے بغیر اور کسی اور جگہ ٹھہرے بغیر تیزی کے ساتھ وہاں سے گزر جاتا ہے، اس کو سب سے زیادہ فکر اپنی منزل اور اپنے مستقبل کی ہوتی ہے، وہ اپنی زندگی کو چند گنے چُنے چکروں کی طرح سمجھتا ہے، جو اپنے رب کی اطاعت اور اپنے اسلاف کی اقتدا میں لگاتا ہے، اس کا ایمان بحث و جستجو میں مانع نہیں ہوتا اور اس کی سعی اس کے توکل و اعتماد میں کوئی خلل نہیں ڈالتی۔ ایک ایسی حرکت جس کی ساری قیمت روح اور پیام کو دو لفظوں میں ادا کیا جا سکتا ہے، محبت اور تابعداری“ (الارکان الاربعۃ ص ۲۳۷) [1] ابراہیم و ابن جریج کی روایت میں ہے کہ جبریلؑ تھے، طبری میں باسناد حسن حضرت علیؓ کی حدیث ہے کہ جبریلؑ نے آواز دی کہ آپ کون ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ میں ہاجرہؑ حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے کی والدہ ہوں جبریلؑ نے پوچھا ابراہیمؑ تمہیں کس کے سپرد کر گئے ہیں؟ جواب دیا اللہ تعالیٰ کے تو جبریلؑ نے کہا کہ وہ تمہیں ایک ایسی ہستی کے سپرد کر گئے ہیں جو اپنے بندوں کے لیے کافی ہے [2] یعنی یہ خوف نہ کرو کہ تم ہلاک ہو جاؤ گے (باقی حاشیہ صفحہ ۲۴۱ پر)

بیت اللہ ٹیلے کی مانند اونچی جگہ پر تھا سیلاب کا پانی آتا، تو دائیں بائیں طرف سے ہو کر نکل جاتا۔

حضرت ہاجرہ یہیں فروکش تھیں، حتیٰ کہ آپ کے پاس سے خاندانِ جرہم کے ایک قافلے کا گزر ہوا۔ یہ قافلہ کدا کی طرف سے آرہا تھا اور مکہ کے زیریں حصہ میں آکر اس نے پڑاؤ ڈال دیا۔ قافلہ والوں نے جب ایک ایک پرندے کو گھومتے ہوئے دیکھا تو کہا کہ یہ پرندہ پانی پر گھوم رہا ہے، مگر ہم اس وادی کو جانتے ہیں یہاں تو پانی کا نام و نشان تک نہیں۔ انہوں نے صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے ایک یا دو آدمیوں کو بھیجا، تو انہوں نے واپس جا کر بتایا کہ پانی موجود ہے تو وہ سب لوگ یہاں آگئے۔ اس وقت ام اسماعیل پانی کے پاس ہی بیٹھی ہوئی تھیں۔ انہوں نے پوچھا کیا آپ ہمیں اس بات کی اجازت دیں گی کہ ہم بھی آپ کے پاس ٹھہر جائیں؟ آپ نے جواب دیا ہاں لیکن پانی پر قبضہ میرا ہوگا۔ انہوں نے بھی اس بات کو تسلیم کر لیا۔

حضرت ابن عباسؓ راوی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان لوگوں کی آمد کے باعث امّ اسماعیل نے بھی ماحول کو مانوس پایا، کیونکہ آپ کو انسانوں سے اُنس اور محبت تھی۔ خاندانِ جرہم کے لوگ یہاں فروکش ہو گئے اور انہوں نے پیغام بھیج کر خاندان کے دیگر لوگوں کو بھی یہاں بُلا لیا۔ حتیٰ کہ یہاں کئی گھر آباد ہو گئے۔ ادھر حضرت اسماعیل علیہ السلام بھی جوان ہو گئے اور آپ نے ان لوگوں سے عربی زبان کی تعلیم حاصل کی۔ جب آپ جوان ہوئے تو بنو جرہم بھی آپ سے بہت خوش تھے۔ جب آپ بالغ ہو گئے تو انہوں نے خاندانِ جرہم ہی کی ایک خاتون کے ساتھ آپ کی شادی کی۔ کچھ عرصہ بعد حضرت اسماعیل کی والدہ

بقیہ حاشیہ صــــ ســــ) حدیث ابی جہم میں ہے کہ یہ خوف نہ کرو کہ پانی ختم ہو جائے گا۔ فاکہی کی روایت جو علی بن وازع از الیوب ہے۔ اس میں ہے کہ اس وادی کے بسنے والوں کے لیے پیاس سے نہ ڈرو کیونکہ یہ ایک ایسا چشمہ ہے جس سے اللہ تعالیٰ کے مہمان پانی پیتے رہیں گے۔ لے جرہم کا سلسلۂ نسب یہ ہے، جرہم بن قحطان بن عامر بن شالخ بن ارفخشد بن سام بن نوح — ابن اسحاق لکھتے ہیں کہ جرہم اور اُن کے بھائی قطورا نے سب سے پہلے عربی میں گفتگو کی ہے۔ جرہم کے سربراہ مضاض بن عمرو اور قطورا کے رئیس سمیدع تھے، بلکہ سب پر جرہم کا اطلاق کیا جاتا ہے عطاء بن سائب کی روایت میں ہے کہ جرہم ان دنوں مکہ کے قریب ایک وادی میں تھے۔ ایک قول میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جرہم کا اصل تعلق عمالقہ سے ہے۔

کا انتقال ہوگیا۔ حضرت اسماعیلؑ کی شادی کے بعد حضرت ابراہیمؑ خبر گیری کے لیے آئے تو حضرت اسماعیلؑ گھر میں موجود نہ تھے۔ آپ نے آپ کی بیوی سے پوچھا تو اُس نے بتایا کہ ہمارے لیے رزق کی تلاش میں گئے ہوئے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا حال ہے؟ اُس عورت نے جواب دیا کہ بُرا حال ہے۔ ہم نہایت تنگی اور شدت کی زندگی بسر کر رہے ہیں، یعنی اُس نے شکوہ و شکایت کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا جب تمہارا شوہر آجائے، تو اُسے میرا سلام کہہ دینا اور یہ پیغام دے دینا کہ اپنے دروازے کی دہلیز کو بدل دو۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام جب گھر تشریف لائے تو آپ نے ماحول کو کچھ مانوس سا پایا تو فرمایا کیا کوئی شخص آیا تھا؟ عورت نے جواب دیا جی ہاں! اس شکل و صورت کے ایک بزرگ آئے تھے انہوں نے آپ کے بارے میں پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ گھر نہیں ہیں، انہوں نے حال پوچھا تو میں نے بتا دیا کہ ہمارا بُرا حال ہے، نہایت کلفت اور شدت سے زندگی بسر کر رہے ہیں۔

آپ نے فرمایا انہوں نے تمہیں کچھ کہا؟ بیوی نے جواب دیا جی ہاں آپ کو سلام کہتے تھے اور یہ پیغام دیتے تھے کہ اپنے دروازہ کی دہلیز کو بدل دو[1] آپ نے فرمایا کہ وہ میرے ابا جان تھے، اور مجھے حکم دے گئے ہیں کہ تم سے علیحدگی اختیار کر لوں، لہٰذا جاؤ تم اپنے والدین کے گھر چلی جاؤ۔ آپ نے اس عورت کو طلاق دے دی تھی۔

آپ نے خاندانِ جرہم کی ایک دوسری عورت سے شادی کر لی۔ کچھ مدت کے بعد حضرت ابراہیمؑ پھر تشریف لائے، تو پھر بھی انہوں نے آپ کو گھر موجود نہ پایا۔ آپ کی بیوی سے پوچھا تو اُس نے بتایا

---

[1] دروازے کی دہلیز کو بدل دینا، طلاق سے کنایہ تھا، چنانچہ حضرت اسماعیلؑ کی اس بات سے بھی اس کی وضاحت ہوتی ہے کہ "مجھے حکم دے گئے ہیں کہ تم سے علیحدگی اختیار کر لوں"۔ اس کا سبب یہ تھا کہ یہ عورت اللہ تعالیٰ کی قضا و قدر سے ناراض تھی حالانکہ مسلمان جب تک اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں رہے، تو پھر اُس کے لیے ہر حالت میں بہتری ہے، جبکہ کبھی کبھی دولت مندی انسان کیلئے بدترین بھی ثابت ہوتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انتقال فرمایا تو اُس وقت آپ کی ذرع ایک یہودی کے پاس رہن رکھی ہوئی تھی اور کئی دفعہ ایک ایک بلکہ دو دو ماہ گزر جاتے اور کاشانۂ نبوت میں آگ نہ جلتی۔ . . اور پھر اس کا ایک اور سبب یہ کہ خاتون مہمان سے اچھے طریقے سے پیش نہ آئی تھی۔ جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جود و سخا اور مہمان نوازی کا پیکر تھے۔ واللہ اعلم!

کہ ہمارے لیے کھانے پینے کا سامان لینے گئے ہیں۔ آپ نے پوچھا کیا حال ہے، زندگی کیسے بسر ہو رہی ہے؟
اُس عورت نے جواب دیا کہ ہم خیر و عافیت کے ساتھ ہیں اور زندگی بہت آسانی کے ساتھ بسر ہو رہی ہے اس
خاتون نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا بھی بیان کی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا، آپ لوگ کیا کھاتے ہیں؟
عورت نے جواب دیا "گوشت" پوچھا کیا پیتے ہیں؛ خاتون نے جواب دیا کہ "پانی"۔ آپ نے دُعا فرمائی: "اللہ!
ان کے لیے گوشت اور پانی میں برکت فرما۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ان دنوں مکہ میں دانے نہیں تھے۔ اگر ہوتے تو آپ ان کے
لیے بھی دُعا فرماتے۔ نیز فرمایا کہ صرف گوشت اور پانی مکہ کے علاوہ کسی اور جگہ موافق نہیں ہے۔ ۔ ۔ ۔
حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ جب تمہارا خاوند آئے تو اسے میرا سلام کہنا اور یہ پیغام دینا کہ اپنے
دروازے کی دہلیز کو برقرار رکھو۔ جب آپ آئے تو پوچھا کہ کوئی شخص آیا تھا؟ بیوی نے جواب دیا جی ہاں!
ایک خوبصورت شکل و صورت کے ایک بزرگ تشریف لائے تھے۔ بیوی نے حضرت ابراہیم علیہ السلام
کی تعریف کی اور انہوں نے آپ کے بارے میں مجھ سے دریافت فرمایا، تو میں نے بتایا۔ پھر انہوں نے
ہمارا حال پوچھا، تو میں نے جواب دیا کہ ہم خیر و عافیت سے ہیں۔ آپ نے پوچھا انہوں نے کوئی وصیت
بھی کی۔ تو عورت نے جواب دیا جی ہاں! آپ کو سلام کہتے تھے اور یہ پیغام دیتے تھے کہ اپنے دروازے کی
دہلیز کو برقرار رکھو۔ آپ نے فرمایا کہ یہ میرے ابا جان اور دروازے کی دہلیز سے مراد تم ہو۔ مجھے حکم دیے گئے
ہیں کہ میں تمہیں اپنی بیوی کی حیثیت سے اپنے پاس ہی رکھوں۔

کچھ دیر بعد پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام تشریف لائے تو حضرت اسماعیل علیہ السلام زمزم کے
قریب درخت کے نیچے اپنے تیر کو درست کر رہے تھے۔ والد محترم کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے اور باپ
بیٹے نے معانقہ و مصافحہ کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا، اسماعیلؑ! اللہ تعالیٰ نے مجھے ایک حکم دیا ہے۔ آپ نے
فرمایا اپنے رب کے حکم کی اطاعت کیجیے۔ فرمایا تم بھی تعاون کرو گے؟ عرض کیا ضرور تعاون کروں گا۔
فرمایا، اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ حکم دیا ہے کہ میں یہاں اس کا گھر تعمیر کروں۔ آپ نے بلند ٹیلے کی طرف

اشارہ کرتے ہوئے فرمایا، چنانچہ باپ بیٹے دونوں نے بیت اللہ کی بنیادیں اٹھانا شروع کر دیں۔ اسماعیل علیہ السلام پتھر لا رہے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس پر کھڑے ہو کر کام شروع کر دیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام اُٹھا اٹھا کر پتھر لا رہے تھے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام انہیں عمارت میں لگا رہے تھے اور دونوں باپ بیٹا ساتھ ساتھ رب کو بھی پکار رہے تھے:

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝

اے ہمارے پروردگار! ہم سے یہ خدمت قبول فرما بیشک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔

تعمیرِ بیت اللہ شریف

حضرت ابن عباسؓ سے مروی اس حدیث سے جسے امام بخاریؒ نے اپنی "صحیح" میں بیان کیا ہے۔ یہ واضح ہوا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنی اولاد کو وادی غیر ذی زرع مکہ مکرمہ میں بسا دیں تاکہ وہ فریضہ اقامتِ صلوٰۃ کی ادائیگی کریں اور اس پاک سرزمین میں اللہ تعالیٰ کی عبادت کریں جو اس بات کی ضرورت مند تھی کہ دُعاۃ یہاں ایمان کے بیج بوئیں۔ پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم ہوا کہ یہاں بیت اللہ کو تعمیر کرو اور اس کی بنیادوں کو استوار کرو۔ حضرت اسماعیلؑ نے اس حکمِ الٰہی پر لبیک کہنے میں بھی فوراً ہی آمادگی کا اظہار فرما دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهِيْمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠ وَاَرِنَا

اور جب ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں اونچی کر رہے تھے (تو دُعا کیے جاتے تھے کہ) اے پروردگار ہم سے یہ خدمت قبول فرما، بیشک تو سننے والا (اور) جاننے والا ہے۔ اے پروردگار ہم کو اپنا فرمانبردار بنائے رکھیو اور ہماری اولاد میں سے ایک

لہ فتح الباری ۷/۲۰۸–۲۱۵، مطبع البابی الحلبی

مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ ۱؎

گروہ کو اپنا مطیع بنائے رکھیو اور (پروردگار) ہمیں ہمارے طریق عبادت بتا اور ہمارے حال پر (رحم کے ساتھ) توجہ فرما۔ بیشک تو توجہ فرمانے والا مہربان ہے۔ اے پروردگار ان (لوگوں) میں انہیں میں سے ایک پیغمبر مبعوث کیجیو جو ان کو تیری آیات پڑھ پڑھ کر سنایا کرے اور کتاب اور دانائی سکھایا کرے اور ان (کے دلوں) کو پاک صاف کیا کرے، بیشک تو غالب (اور) صاحب حکمت ہے

بیت اللہ کی تعمیر پایۂ تکمیل کو پہنچ گئی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم ہوا۔

وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰي مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَاۗىِٕسَ الْفَقِيْرَ ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ۝ ۲؎

اور لوگوں میں حج کے لیے ندا کر دو کہ تمہاری طرف پیدل اور دبلے دبلے اونٹوں پر جو دور (دراز) رستوں سے چلے آتے ہوں (سوار ہو کر) چلے آئیں تاکہ اپنے فائدے کے کاموں کے لیے حاضر ہوں اور (قربانی کے) ایام معلوم میں چارپایاں مویشی (کے ذبح کے وقت) جو اللہ نے ان کو دیئے ہیں، ان پر اللہ کا نام لیں، اس میں سے تم خود بھی کھاؤ اور فقیر درماندہ کو بھی کھلاؤ۔ پھر چاہیے کہ لوگ اپنا میل کچیل دور کریں اور نذریں پوری کریں اور خانۂ قدیم (یعنی بیت اللہ) کا طواف کریں۔

۱؎ البقرۃ ۱۲۷ - ۱۲۹

۲؎ الحج ۲۷ - ۲۹

اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی دُعا کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا اور ان کے تعمیر کردہ گھر کو موحدین کا قبلہ، مومنین کے دلوں کا ٹھکانا اور خائفین کے لیے جائے پناہ بنا دیا اور اس کے گھر کے ساکنین کے لیے رزق اور امن کا ذمہ خود اللہ جل وعلا نے اُٹھایا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

اَوَلَمْ نُمَكِّنْ لَّهُمْ حَرَمًا اٰمِنًا يُّجْبٰٓى اِلَيْهِ ثَمَرٰتُ كُلِّ شَيْءٍ رِّزْقًا مِّنْ لَّدُنَّا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۔ [1]

کیا ہم نے ان کو حرم میں جو امن کا مقام ہے، جگہ نہیں دی، جہاں ہر قسم کے میوے پہنچائے جاتے ہیں (اور یہ) رزق ہماری طرف سے ہے، لیکن ان میں سے اکثر نہیں جانتے۔

نیز فرمایا،

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ ۙ الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ ڏ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ۔ [2]

(لوگوں کو) چاہیے کہ (اس نعمت کے شکر میں) اس گھر کے مالک کی عبادت کریں جس نے ان کو بھوک میں کھانا کھلایا اور خوف سے امن بخشا۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ اب ہجرت نہیں، البتہ جہاد اور نیت باقی ہے۔ جب تم سے جہاد کے لیے نکلنے کا مطالبہ کیا جائے تو نکل کھڑے ہو، فتح مکہ ہی کے دن آپ نے یہ بھی فرمایا کہ آسمان و زمین کی تخلیق کے دن ہی اللہ تعالیٰ نے اس شہر کو حرام قرار دے دیا تھا، تو وہ اس کے باعث قیامت تک حرام ہے۔ مجھ سے پہلے کسی کے لیے بھی اس شہر میں قتال حلال نہ تھا۔ میرے لیے دن کے کچھ حصہ میں قتال حلال ہوا۔ حرمتِ الٰہی کے باعث یہ شہر قیامت تک حرام ہے۔ اس شہر کے کانٹے نہ کاٹے جائیں، شکار کو نہ بھگایا جائے، لقطہ (گری ہوئی چیز) صرف وہ اُٹھائے جو اسے معلوم کرانا چاہتا ہو۔ حضرت عباسؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ! اذخر کی اجازت دے دیجیے، کیونکہ یہ لوہاروں اور گھروں میں جلانے کے کام آتا ہے۔ فرمایا ہاں اذخر کی اجازت ہے۔ [3]

---

[1] سورۃ القصص، آیت ۵۷ [2] سورۃ قریش، آیت ۳-۴

[3] صحیح مسلم، باب تحریم مکہ ۱۲۳/۹

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی اور رسول حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کو شرفِ قبولیت سے نوازا اور ان کی اولاد کو امتِ مسلمہ بنایا اور انہی کی اولاد میں سے امتِ عربیہ میں وہ رسولِ مقبول بھی مبعوث فرما دیئے جو انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے اور شرک اور دیگر تمام نجاستوں اور غلاظتوں سے پاک فرماتے تھے۔ یہ رسولِ مقبول حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے نبوت و رسالت کو ختم فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس محبوب پیغمبر کا انتخاب بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی کی اولاد سے فرمایا۔ چنانچہ آپ نے خود فرمایا ہے:

"میں اپنے باپ ابراہیمؑ کی دُعا، حضرت عیسیٰؑ کی بشارت اور اپنی ماں کا وہ خواب ہوں، جو انہوں نے دیکھا تھا۔" [1]

اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ان تمام اعمالِ حسنہ کو قبول فرمایا، انہیں تمام مناسکِ حج کی تعلیم فرمائی اور حکم دیا کہ لوگوں میں بھی حج کا اعلانِ عام کردو۔ لوگوں نے آپ کی اس صدا پر لبیک کہا اور وہ تا ایں دم پیادہ وسوار، اطراف واکنافِ عالم سے کشاں کشاں بیت اللہ کے حج کے لیے کھنچے چلے آرہے ہیں۔ حج کا وجود قبل از اسلام بھی تھا، یعنی اسلام سے قبل بھی عرب کے لوگ بیت اللہ کا حج کیا کرتے تھے اور اب اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک ہے، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اسلام کی بنیاد پانچ ارکان پر ہے:

(۱) کلمہ شہادت (۲) نماز (۳) زکوٰۃ (۴) حج اور (۵) رمضان المبارک کے روزے [2]

ہم آج بھی دیکھ رہے ہیں کہ دُنیا کے کونے کونے اور گوشے گوشے سے مسلمان ایک جیسے لباس میں، ایک جیسے جذبات کے ساتھ، ایک جیسے پروگرام کے ساتھ، ایک جیسا ترانہ:

لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ
إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ۔

---

[1] مسند امام احمد ۵/۲۶۲، طبع الحلبی، تفسیر قاسمی ۲/۲۵۸

[2] متفق علیہ، یہ الفاظ صحیح بخاری کی روایت کے ہیں۔

گاتے ہوئے کشاں کشاں مکہ مکرمہ کی طرف کھنچے چلے آتے ہیں کہ مدد اور نظام کے اعتبار سے اس جیسے پاک اجتماع کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی اور نہ تاریخ آئندہ کوئی مثال پیش کر سکے گی۔ ہر سال لاکھوں لوگ ۹ ذوالحجہ کو مقام عرفات میں کھڑے ہوتے ہیں۔ سب نے لباس اتار کر احرام زیب تن کیا ہوتا ہے اور یہ سب کے سب لوگ اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگ رہے ہوتے ہیں۔ پھر یہ لاکھوں لوگ غروبِ آفتاب سے قبل عرفات سے منتقل ہونا شروع ہو جاتے ہیں جیسا کہ نمازِ فجر کے بعد مزدلفہ سے منتقل ہوتے ہیں۔ اس نقل و حرکت اور حج کے ارکان میں سے ہر رکن اور شعائر میں سے ہر شعار سے ہمارے سامنے حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت محمد علیہم افضل الصلوٰۃ والسلام کی یادیں تازہ ہو جاتی ہیں۔ لوگ طواف کرتے ہوئے بیت اللہ کے بانی کو یاد کرتے ہیں اور وہ منظر یاد کرتے ہیں، جب حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ بیت اللہ کو تعمیر کرتے اور بیت اللہ کا طواف کرتے ہوئے اپنے رب کو بھی پکار رہے تھے، رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ۝

صفا و مروہ کے مابین سعی کرتے ہوئے لوگ حزیں و غمگین حضرت ہاجرہؑ کی سعی کو یاد کرتے ہیں، جبکہ آپ کسی ایسی ہستی کی جستجو میں تھیں جو آپ کی فریاد رسی کرے اور آپ کے بچے کو تباہی و ہلاکت کے منہ میں جانے سے بچالے۔

زمزم کو نوشِ جاں کرتے وقت لوگ یاد کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس مبارک چشمے کو کس طرح پیدا فرما کر اپنے بندے اور نبی حضرت اسماعیل علیہ السلام پر احسان فرمایا تھا۔

عقبہ کو رمی جمرات کرتے ہوئے حجاج کرام یاد کرتے ہیں کہ شیطان نے کس طرح حضرت ابراہیمؑ کو فتنہ میں مبتلا کرنا چاہا یا اُس نے کس طرح آپ کے حج میں شبہ پیدا کرنا چاہا اور حضرت خلیلؑ نے اسے کس طرح پتھر مار مار کر بھگا دیا اور اس کی امیدوں کو خاک میں ملا دیا تھا۔

ہدی کو ذبح کرتے ہوئے لوگ حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبیح کی قربانی کو یاد کرتے ہیں اور اس بات کو ذہن میں تازہ کرتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے فدیہ میں ایک عظیم الشان مینڈھے کو بھیج دیا تھا۔

حج کے تمام مناسک و ارکان میں یہ بات سب سے زیادہ نمایاں ہے کہ اس میں بندے کی طرف سے

اپنے رب کے حضور اطاعت اور تسلیم و رضا کا کامل درجے کا مظاہرہ ہے اور ضمناً مسلمان اس عہد کی تجدید بھی کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو اس بہترین امت کے روپ میں ڈھال لیں گے جسے اللہ تعالیٰ نے لوگوں کی بہتری و بھلائی کے لیے برپا کیا ہے۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رقمطراز ہیں:

"حج اپنے سارے ارکان و اعمال اور مناسک و عبادات کے ساتھ اطاعت محض، مجرد امتثال امر، بے چون و چرا حکم بجالانے اور ہر مطالبہ کے سامنے سر جھکا دینے کا نام ہے، حاجی کبھی مکہ میں نظر آتا ہے، کبھی منیٰ میں، کبھی عرفات میں، کبھی مزدلفہ میں، کبھی ٹھہرتا ہے، کبھی سفر کرتا ہے، کبھی خیمہ گاڑتا ہے، کبھی اکھاڑتا ہے، وہ حکم کا بندہ اور چشم و ابرو کا پابند ہے، اس کا خود نہ کوئی ارادہ ہوتا ہے، نہ فیصلہ، نہ انتخاب کی آزادی، وہ منیٰ میں اطمینان سے سانس بھی لینے نہیں پاتا کہ اس کو عرفات جانے کا حکم ملتا ہے، لیکن مزدلفہ میں رکنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ عرفات پہنچ کر وہ دن بھر دعا و عبادت میں مشغول رہتا ہے۔ غروب آفتاب کے بعد اس کو تقاضا ہوتا ہے کہ ذرا ستالے اور رات کو یہیں رہ جائے، لیکن اس کے بجائے اس کو مزدلفہ جانے کا حکم ملتا ہے، وہ زندگی بھر نماز کا پابند رہا تھا، لیکن عرفہ میں اس کو حکم ملتا ہے کہ مغرب کی نماز ترک کر دے، اس لیے کہ وہ اللہ کا بندہ ہے، نماز یا اپنی عادت کا بندہ نہیں۔ وہ یہ نماز مزدلفہ پہنچنے کے بعد عشاء کے ساتھ ملا کر پڑھتا ہے، مزدلفہ میں اس کا خوب جی لگتا ہے اور سوچتا ہے کہ یہاں جی بھر کر ٹھہرے، مگر اس بات کی اجازت بھی اس کو نہیں ملتی اور اس کو منیٰ کی طرف رخ کرنے کا حکم ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور سب انبیاء کرام اور ان کے بعد تمام عشاق و اہل محبت، اہل دل اور اہل طلب کی زندگی کا یہی طرز تھا، کبھی سفر، کبھی قیام، کبھی وصل، کبھی ہجر، نہ عادت کی غلامی، نہ ذوق کی اسیری، نہ خواہش کی تابعداری، نہ شہرت کے سامنے سپر اندازی۔"[1]

---

[1] الارکان الاربعۃ، ابوالحسن علی الحسنی الندوی، ص ۲۲۰، ۲۲۱، دار الفتح، بیروت

حضرت ذبیح علیہ السلام کا واقعہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ یاد رہے کہ حضرات انبیاء کرام کے خواب بھی وحی ہوتے ہیں[1] لہٰذا باپ نے فوراً اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ[2] کو اپنے رب کے حکم کی اطلاع دی تاکہ ان کے صبر و شجاعت کا بھی اندازہ ہو جائے۔ باپ کے حد درجہ فرماں بردار اور امر رب پر نثار ہونے والے سعادت مند اسماعیلؑ کا جواب یہ تھا،

قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝[3] انہوں نے کہا کہ ابا جو آپ کو حکم ہوا ہے وہی کیجیے خدا تعالیٰ نے چاہا آپ مجھے صابروں میں سے پائیے گا۔

يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ــــ قلم حیران ہے کہ وہ حضرت اسماعیلؑ کے اس جواب میں جو حسن ہے، جو بلاغت ہے جو بانکپن ہے اور جو بے ساختہ پن ہے، اسے قارئین کرام تک کیسے منتقل کرے۔

---

[1] ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباسؓ کی حدیث بیان کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انبیا کے خواب وحی ہوتے ہیں۔ امام بخاری اور دیگر ائمہ نے اسے بروایت عبید بن عمیر بیان کیا ہے۔ بحوالہ فتح القدیر ۴/۴۰۲ وہ دلائل جن سے علماء نے انبیاء کے خوابوں کے وحی ہونے پر استدلال کیا ہے۔ ایک یہی ارشاد باری تعالیٰ ہے "يٰبُنَيَّ اِنِّيْٓ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْٓ اَذْبَحُكَ" جس کا حضرت اسماعیلؑ نے یہ جواب دیا تھا "يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ" ام المؤمنین حضرت عائشہؓ سے مروی حدیث صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا جو سب سے پہلے آغاز ہوا وہ سچے خوابوں کی صورت میں تھا آپ جب بھی خواب دیکھتے وہ روز روشن کی طرح سچ ثابت ہوتا۔۔۔ فتح الباری ۱/۲۵، الروض الانف ۲/۱۹۲

[2] ہمارے خیال میں ذبیح حضرت اسحٰق نہیں، بلکہ حضرت اسماعیل ہیں تفصیل آگے آ رہی ہے [3] سورۃ الصافات، آیت ۱۰۲

اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ـــــ یہ ہے اسلام، انقیاد، استسلام، اطاعت، امتثال اور تنفیذ . . . . لیکن بادشاہوں یا ظالم حکمرانوں کے حکم کے لیے نہیں، بلکہ اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ اور اس کے انبیاء کرام علیہم افضل الصلاۃ والتسلیم کے لیے۔

اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ـــــ اباجان! آپ اگرچہ بڑے علیم، بُردبار اور مشفق ہیں، لیکن اس عارضی و فانی دنیا میں میری حیاتِ مُستعار سے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کہیں زیادہ اہم ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرِ اطاعت جُھکا دینے کے سلسلہ میں میری طرف سے کسی بھی تردد یا اضطراب کا اظہار ہرگز نہ ہوگا، بلکہ میں صبر کا مظاہرہ کروں گا اور اللہ تعالیٰ سے اس صبر کا اجر و ثواب حاصل کروں گا۔

اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ـــــ اللہ تعالیٰ کی نظرِ انتخاب جب ہم پر پڑی ہے کہ ہم اس کے پیغام کے حاملین بن جائیں، زمین میں ہدایت کے ستارے بن جائیں، بلکہ آفتاب جن کے سامنے ساری تاریکیاں اور ظلمتیں ماند پڑ جائیں، لہٰذا ہمیں اپنے خون، اپنے مال اور جو کچھ ہمارے قبضۂ اختیار میں ہے، اسے اللہ کی راہ میں نثار کرنے سے دریغ نہ کیا جائے۔

بہت سے لوگ میدانِ جنگ میں جامِ شہادت بھی نوش کرتے ہیں اور راہِ خدا میں مال و جان کی قربانی بھی دیتے ہیں، لیکن دنیا کی کوئی قربانی اور شہادت حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے اس عملِ عظیم کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ ملاحظہ فرمائیے کہ مشفق و مہربان باپ کس قدر رقت و شفقت کے ساتھ اپنے بیٹے سے کہتا ہے: یٰبُنَیَّ اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ۔ تو سعادت مند بیٹا بڑی محبت اور بڑے ادب کے ساتھ جواب دیتا ہے: یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ۔ اگر آپ اپنے بیٹے سے یہ فرماتے کہ بیٹا! جاؤ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو، امید ہے اللہ تعالیٰ مجھے ایک شہید کا باپ ہونے کا شرف عطا فرمائے گا، تو یہ بات بہت آسان تھی، کیونکہ اس صورت میں اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے ہاتھوں انہیں شہادت نصیب ہوتی، مگر یہاں صورتِ حال اس سے یکسر مختلف ہے۔ یہاں تو ایک مومن اور داعی باپ اپنے مومن اور

داعی صاحبزادے کے حلق پر چھری چلانے کے لیے تیار ہے، جبکہ بیٹے نے کسی ایسے جرم کا ارتکاب بھی نہیں کیا جس کے باعث اسے بطورِ حدِ قتل کیا جا رہا ہو۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ساری حیاتِ طیبہ اس بات سے عبارت ہے کہ آپ کے باپ نے جو بھی حکم دیا، اس کی اطاعت کے لیے فوراً سرِ تسلیم خم کر دیا، کیونکہ آپ بخوبی جانتے ہیں کہ باپ کی اطاعت درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی اطاعت ہے۔ آپ پیچھے پڑھ چکے ہیں کہ جب آپ کی بیوی نے آپ کے باپ کی طرف سے یہ پیغام پہنچایا کہ "آپ اپنے دروازے کی دہلیز کو بدل دو۔" تو آپ نے فوراً ہی اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور بیوی کی محبت یا بچوں کی مصلحت وغیرہ کسی کو بھی باپ کے حکم کی اطاعت کے لیے رکاوٹ نہ بننے دیا۔ اسی طرح آپ کے والدِ محترم نے جب آپ کو یہ حکم دیا کہ بیت اللہ کی تعمیر کے لیے تعاون کرو، تو بلا حیل وحجت باپ کی اعانت کے لیے تیار ہو گئے۔

ہم اس بات کو فراموش نہیں کریں گے اور فراموش کر بھی کیسے سکتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے نشأۃ وارتقاء کی منزلیں اور تربیت کی مسافتیں ایسی ماں کی گود میں طے کی تھیں، جن کا اللہ تعالیٰ کی ذاتِ اقدس پر اعتماد اور اس کے حکم کی اطاعت حدِ بیان سے باہر ہے، چنانچہ گزشتہ صفحات میں ہم یہ پڑھ آئے ہیں کہ جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ انہیں اور ان کے بچے کو ایک ایسی جگہ چھوڑ دے جہاں کوئی ٹھکانا نہیں، جائے امن نہیں، نیز وہاں کھانے پینے کا بھی کوئی ساز وسامان نہیں، تو انہوں نے ثبات وتوکل کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا:

"اگر یہ اللہ کا حکم ہے، تو وہ ہمیں ضائع نہیں کرے گا۔"

اسی خاتون کے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں، جنہوں نے باپ کی زبان سے حکمِ الٰہی سن کر جواب دیا: يَٰٓأَبَتِ ٱفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ۔

گفتگو اور نظری وفکری ہم آہنگی کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام اب اس حکمِ الٰہی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فَلَمَّآ اَسۡلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلۡجَبِيۡنِ ۚ

جب دونوں نے حکم مان لیا اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا۔

یعنی جب باپ بیٹا امرِ رب کی اطاعت کے لیے تیار ہو گئے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب سے یہ بھی نہ پوچھا کہ آخر ایسے عجیب و غریب حکم میں راز کیا ہے؟ اپنے اس اکلوتے لختِ جگر کو کیونکر ذبح کر دے جو بڑے انتظار اور بڑے ارمانوں کے بعد حاصل ہوا ہے اور حاصل بھی اس بڑھاپے کی عمر میں ہوا ہے، جبکہ سارا سر سفید ہو چکا ہے۔ آخر وہ یہ حوصلہ کیسے کرے جبکہ بڑھاپے سے کمر خمیدہ ہو چکی ہے اور بیٹا جوانِ رعنا ہے جو اس بڑھاپے میں باپ کا سہارا ہو گا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام نے بھی قطعاً یہ نہ کہا کہ ابا جان! آپ مجھے کیوں ذبح کرتے ہیں، حالانکہ زندگی بھر کبھی بھی میں نے آپ کی نافرمانی نہیں کی؟ امتحان کے لیے کیا اتنا ہی کافی نہ تھا کہ آپ مجھے شیرخوارگی کے عالم میں میری ماں کے ہمراہ اس بے آب و گیاہ وادی میں چھوڑ گئے تھے ممکن تھا کہ ہم جنگلی درندوں کے لیے لقمہ بن جاتے۔ معاذ اللہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی زبان پر ایسی کوئی بات آتی، کیونکہ آپ مومن تھے اور اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ آپ کے والدِ محترم اپنے ہر ہر عمل میں حکمِ الٰہی کی تنفیذ ہی کو پیشِ نظر رکھتے ہیں اور ایک سچے مسلمان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے قضا و قدر پر دل و جان سے راضی ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امرِ الٰہی کی تنفیذ کا آغاز کر دیا۔ بیٹے کو زمین پر لٹا دیا، اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے، چھری کو ہاتھ میں پکڑ لیا، گردن پر رکھ دیا اور پھر اسے لختِ جگر کی گردن پر چلانا شروع کر دیا کہ اسی لمحے حضرت خلیل علیہ السلام نے اپنے رب کی آواز کو سنا،

وَنَادَيۡنٰهُ اَنۡ يّٰۤاِبۡرٰهِيۡمُ ۙ قَدۡ صَدَّقۡتَ الرُّءۡيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجۡزِى الۡمُحۡسِنِيۡنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِيۡنُ ۝ وَفَدَيۡنٰهُ

تو ہم نے اُن کو پکارا کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی، اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ

بِذِبۡحٍ عَظِیۡمٍ[1] دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک سفید رنگ کا بہت بڑا مینڈھا موجود ہے تو آپ نے اسے ذبح کر دیا اور اسے گویا اپنے نورِ نظر اور لختِ جگر کے فدیہ کے طور پر قربان کر دیا اور قربانی سُننِ اسلام میں سے ایک نہایت اہم سُنّت قرار پائی اور مکہ میں قربانی تو حج کا گویا ایک نہایت اہم رُکن ہے۔

واللہ! یہ ایک بہت ہی زبردست آزمائش تھی۔ ابن قیم فرماتے ہیں:

"اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے انسانوں میں یہ بھی عادت پیدا فرما دی ہے کہ پہلی اولاد اپنے والدین کو زیادہ محبوب ہوتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے جب بچے کے لیے دعا مانگی تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو بچہ عطا فرما دیا اور دل کا ایک گوشہ بچے کی محبت سے لبریز ہو گیا جبکہ اللہ تعالیٰ نے بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنا دوست بنا رکھا تھا اور مقامِ خلّت کا تقاضا ہے کہ محبوب سے محبت میں کسی کو شریک نہ بنایا جائے تو جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دل میں بچے کی محبت پیدا ہوئی تو غیرتِ خلّت نے اسے گوارا نہ کیا اور حکم دیا کہ اے ابراہیم تم اپنے اس محبوب بیٹے کو ذبح کر دو۔ ابراہیم علیہ السلام جب حکم کی تعمیل کے لیے تیار ہو گئے اور ثابت ہو گیا کہ آپ کے دل میں بیٹے کے بجائے اللہ تعالیٰ کی محبت زیادہ ہے تو خلّت شرکت کے شائبوں سے پاک ہو گئی لہٰذا اب بیٹے کے ذبح کرنے میں کوئی مصلحت نہ تھی، مقصود حاصل ہو چکا تھا لہٰذا حکم منسوخ کر دیا گیا اور حضرت ذبیح علیہ السلام کا فدیہ دے دیا گیا۔ حضرت خلیل علیہ السلام نے اپنا خواب سچا ثابت کر دکھایا اور رب تعالیٰ کی مراد پوری ہو گئی۔"[2]

كَذٰلِكَ نَجۡزِی الۡمُحۡسِنِیۡنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الۡبَلٰٓؤُا الۡمُبِیۡنُ ۝

---

[1] الصافات: ۱۰۴ - ۱۰۷

[2] زاد المعاد، ابن قیم، تحقیق شعیب و عبد القادر ارنووط، ۱/۴۷

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے اطاعت شعار بندوں سے ناپسندیدہ امور اور مشکلات کو اسی طرح دور فرما دیتے ہیں اور ان کے لیے آسانی اور کشادگی کی راہیں کھول دیتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ [1]

اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا، وہ اس کے لیے (رنج و محن سے) مخلصی کی صورت پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے (وہم و) گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا، تو وہ اس کو کفایت کرے گا۔ اللہ اپنے کام کو (جو وہ کرنا چاہتا ہے) پورا کر دیتا ہے اللہ نے ہر چیز کا اندازہ مقرر کر رکھا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے محسن بندوں کو ابتلاء و آزمائش کے بعد ہی جزا و ثواب سے نوازا کرتے ہیں، ابتلاء و آزمائش میں صبر اور ثبات علی الحق کے بعد ہی اپنی نوازشوں سے سرفراز کرتے ہیں تو حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی ان آزمائشوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ انعام فرمایا کہ نبوت و حکمت کو ان کی اولاد کے لیے مخصوص کر دیا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی تعریف کی اور انہیں صادق الوعد کے لقب سے نوازا، ارشاد ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا ۝ [2]

اور کتاب میں اسمٰعیل کا بھی ذکر کرو وہ وعدے کے سچے اور (ہمارے) بھیجے ہوئے نبی تھے اور اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم کرتے تھے اور اپنے پروردگار کے ہاں پسندیدہ (و برگزیدہ) تھے۔

---

[1] سورۃ الطلاق ۔ ۲

[2] سورۃ مریم، ۵۴-۵۵

حضرت اسماعیل علیہ السلام رسول بھی تھے اور نبی بھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو قبائل جرہم، عمالقہ اور اہل یمن کی طرف مبعوث فرمایا تھا اور پھر یہ شرف بھی عطا فرمایا کہ خاتم الانبیاء والمرسلین علیہ افضل الصلوٰۃ والتسلیم کو آپ کی اولاد میں سے بنایا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے،

وَاذْكُرْ عِبَادَنَا إِبْرَاهِيمَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ۝ إِنَّا أَخْلَصْنَاهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ ۝ وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ۝ وَاذْكُرْ إِسْمَاعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِنَ الْأَخْيَارِ ۝[1]	اور ہمارے بندوں ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو یاد کرو جو قوت والے اور صاحب نظر تھے۔ ہم نے ان کو ایک (صفت) خاص (آخرت کے) گھر کی یاد سے ممتاز کیا تھا اور وہ ہمارے نزدیک منتخب اور نیک لوگوں میں سے تھے اور اسمٰعیل اور الیسع اور ذوالکفل کو یاد کرو وہ سب نیک لوگوں میں سے تھے۔

نیز فرمایا،

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِنْ بَعْدِهِ ۚ وَأَوْحَيْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ[2]	(اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح حضرت نوح اور ان سے پچھلے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی اور ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق اور یعقوب اور آلِ یعقوب ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کی طرف بھی ہم نے وحی بھیجی تھی۔

---

[1] سورۃ ص، ۴۵ — ۴۸

[2] سورۃ النساء، ۱۶۳

ذبیح کون ہیں؟

اُمت کے سلف اہلِ علم کا اس بارے میں اختلاف ہے کہ ذبیح کون ہیں حضرت اسحاقؑ یا حضرت اسماعیلؑ؟ فریقین کے دلائل کا جائزہ لینے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔ اب ذیل میں ہم ان لوگوں کے کچھ دلائل ذکر کریں گے جو اسی بات کے قائل ہیں کہ ذبیح اسماعیل علیہ السلام تھے۔

۱۔ محمد بن کعب قرظیؒ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے محمد بن کعب قرظیؒ کو بیان کرتے ہوئے سنا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے جس بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا، وہ حضرت اسماعیلؑ تھے، چنانچہ خود کتاب اللہ میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذبیح صاحبزادے کے تذکرہ کے بعد یہ فرمایا ہے

وَبَشَّرْنَاهُ بِإِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ ○ اور ہم نے ان کو اسحاق کی بشارت بھی دی (کہ وہ) نبی (اور) نیکوکاروں میں سے (ہوں گے)

نیز فرمایا ہے،

فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ ہم نے ان کو اسحاق کی اور اس کے بعد یعقوب

لہ محمد بن کعب بن سلیم بن اسد قرظی اوس کے حلیف تھے، ان کا باپ قریظہ کے قیدیوں میں سے تھا جو پہلے کوفہ اور پھر مدینہ میں سکونت پذیر تھا۔ انہوں نے کئی ایک صحابہ سے روایت کی ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ ثقہ، عالم، کثیر الحدیث اور متقی تھے۔ عجلی نے لکھا ہے کہ مدنی تابعی ثقہ، نیک آدمی اور عالم قرآن تھے۔ ابن حبان فرماتے ہیں کہ علم و فقہ کے اعتبار سے مدینہ کے فاضل لوگوں میں سے تھے۔ مسجد میں درس دیا کرتے تھے کہ مسجد کی چھت گرنے سے آپ اور آپ کے ساتھی جان بحق ہو گئے۔ یہ ۱۱۸ھ کا واقعہ ہے ابوبکر بن ابی شیبہ اور کئی دیگر حضرات نے اس کی تاریخ ۱۰۸ھ بیان کی ہے۔ یعقوب بن شیبہ نے ۱۱۷ھ بیان کیا ہے، جبکہ آپ کی عمر اٹھہتر برس تھی۔ تہذیب التہذیب ابن حجر عسقلانی۔

اِسۡحَاقَ یَعۡقُوۡبَ۔ کی خوشخبری دی۔

یعنی اس آیت میں بیٹے اور پھر اسی بیٹے کے بیٹے کی خوشخبری سنائی گئی تو جب اسی بیٹے سے آگے اولاد ہونا تھی، تو پھر اس کے ذبح کا حکم کیسے ہوتا' لہٰذا جس بیٹے کے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا، یقیناً حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی تھے۔ ابن اسحاق بیان کرتے ہیں کہ یہ میں نے آپ سے کئی بار سنا ہے۔

ابن اسحاق، بُریدہ بن سفیان سلمی کے واسطہ سے محمد بن کعب قرظیؒ سے بیان کرتے ہیں کہ انہوں نے اس بات کا تذکرہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ سے بھی کیا، جبکہ وہ خلیفہ تھے اور آپ کے ساتھ شام میں مقیم تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ تم درست کہتے ہو، پھر انہوں نے ایک آدمی کو پیغام بھیج کر اپنے پاس بلایا جو پہلے یہودی تھا' مگر بعد میں مسلمان ہو گیا تھا اور اچھا مسلمان ثابت ہوا۔ پہلے اس شخص کا یہودی علماء میں بھی شمار ہوتا تھا' تو حضرت عمرؒ نے میری موجودگی میں اس شخص سے پوچھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اپنے کس بیٹے کے ذبح کا حکم ہوا تھا؟ تو اس نے جواب دیا تھا کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بابت یہ حکم ہوا تھا۔ نیز اس شخص نے یہ بھی کہا کہ امیرالمؤمنین! بخدا! یہودی بھی اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں' لیکن وہ اس بات کی وجہ سے تم سے حسد کرتے ہیں کہ تمہارے باپ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا تھا' لہٰذا وہ دانستہ اس کا انکار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ حضرت اسحاقؑ تھے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ وہ کون تھے' تاہم دونوں ہی طاہر، طیب اور اللہ عزوجل کے صدور جہ اطاعت گزار تھے۔[1]

۲۔ سیوطیؒ علامہ سیوطیؒ "الاکلیل" میں بیان کرتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے، اُن کا استدلال ارشاد باری تعالیٰ وَبَشَّرۡنٰهُ بِاِسۡحٰقَ سے ہے۔ علماء کی ایک جماعت نے اسی کو ترجیح دی ہے اور کئی ایک دلائل سے استدلال کیا ہے۔ ایک تو یہ کہ ان کی صفت حلم بیان کی ہے اور پھر ان کے بعد

---

[1] تفسیر ابن کثیر ۴/ ۱۸، مطبعۃ البابی الحلبی۔

حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر ہے اور یہ حضرت اسحٰقؑ کے بعد حضرت یعقوبؑ کی بشارت ہے، لیکن یہ سب ظنی امور ہیں، قطعی نہیں۔ امام سیوطیؒ مزید فرماتے ہیں کہ میں نے قرآن کریم میں تامل و تدبر کے بعد اس بات کو اخذ کیا ہے جو قریباً قریباً قطعی ہے ــــ اور مجھ سے پہلے کسی نے بھی یہ استنباط نہیں کیا ــــ کہ بشارت دو دفعہ ہوئی ہے، ایک تو حسب ذیل ارشاد میں ہے:

وَقَالَ إِنِّي ذَاهِبٌ إِلَىٰ رَبِّي سَيَهْدِينِ ۝ رَبِّ هَبْ لِي مِنَ الصَّالِحِينَ ۝ فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ حَلِيمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يَا بُنَيَّ إِنِّي أَرَىٰ فِي الْمَنَامِ أَنِّي أَذْبَحُكَ۔	اور (ابراہیم) بولے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں، وہ مجھے رستہ دکھائے گا۔ اے پروردگار مجھے (اولاد) عطا فرما (جو) سعادتمندوں میں سے ہو۔ تو ہم نے ان کو ایک نرم دل لڑکے کی خوشخبری دی۔ جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا تو ابراہیم نے کہا کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) میں تم کو ذبح کر رہا ہوں

اس آیت سے قطعی طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس بچے کی بشارت دی جا رہی ہے، وہ ذبیح ہیں اور دوسری آیت جس میں بشارت ہے، وہ یہ ہے:

وَامْرَأَتُهُ قَائِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنَاهَا بِإِسْحَاقَ وَمِنْ وَرَاءِ إِسْحَاقَ يَعْقُوبَ۔	اور آپ کی بیوی کھڑی تھی جو ہنس پڑی تو ہم نے اس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی۔

اس آیت میں صراحت ہے کہ بشارت حضرت اسحٰق علیہ السلام کے بارے میں ہے اور یہ بشارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سوال کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ آپ کی بیوی نے کہا کہ وہ بڑھیا ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بہت بوڑھے ہیں اور یہ اُس وقت کی بات ہے جب حضرت ابراہیم علیہ السلام شام میں تھے اور قوم لوط کی تباہی کے سلسلہ میں فرشتے آپ کے پاس آئے تھے۔ بشارت کا تعلق اس دور سے ہے جب آپ عراق سے شام منتقل ہوئے اور اس عمر میں آپ کے گھر میں بچے کی ولادت

کوئی اچنبھے کی بات نہ تھی، اسی لیے آپ نے دُعا بھی کی تھی تو اس سے معلوم ہوا کہ یہ دو بشارتیں دو الگ الگ وقتوں میں الگ الگ بچوں کی بابت تھیں۔ ایک بشارت بغیر سوال کے تھی اور یہ بشارت صریحاً حضرت اسحاق علیہ السلام کی بابت تھی اور دوسری بشارت اس سے پہلے اور دُعا کے جواب میں تھی جو کہ قطعی طور پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی بابت تھی اور یہ بات بھی قطعی ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ذبیح ہیں۔ [1]

۲۔ محمد امین شنقیطیؒ شیخ محمد امین شنقیطیؒ نے اس مسئلہ سے متعلق بہت عمدہ گفتگو کی ہے۔ آپ نے سابقہ علماء محققین مثلاً ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور ابن کثیرؒ کے اقوال کا خلاصہ جمع کر دیا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں:

قرآن عظیم کے دو مقام اس بات پر دلالت کناں ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے حضرت اسحاق علیہ السلام نہیں تھے۔ ایک مقام تو سورۃ صافات میں ہے اور دوسرا سورۃ ہود میں سورۃ صافات کی آیات سیاق و سباق کے اعتبار سے اس سلسلہ میں ازحد واضح ہیں، چنانچہ ملاحظہ فرمائیں:

وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰی رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۝ رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ۝ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ	اور (ابراہیم) بولے کہ میں اپنے پروردگار کی طرف جانے والا ہوں، وہ مجھے رستہ دکھائے گا۔ اے پروردگار مجھے (اولاد) عطا فرما (جو) سعادتمندوں میں سے (ہو) تو ہم نے ان کو ایک نرم دل لڑکے کی خوشخبری دی۔ جب وہ ان کے ساتھ دوڑنے (کی عمر) کو پہنچا تو ابراہیم نے کہا کہ بیٹا میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ (گویا) تم کو ذبح کر رہا ہوں تو تم سوچو کہ تمہارا کیا خیال ہے؟ انہوں نے کہا کہ ابا جو آپ کو

---

[1] تفسیر القاسمی، محمد جمال الدین القاسمی ۱۴/ ۵۰۵۲ — ۵۰۵۷

سَتَجِدُنِیٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ہ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّہٗ لِلْجَبِیْنِ ہ وَنَادَیْنٰہُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰھِیْمُ ہ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا اِنَّا کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ہ اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ہ وَفَدَیْنٰہُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ ہ وَ تَرَکْنَا عَلَیْہِ فِی الْاٰخِرِیْنَ ہ سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ ہ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ہ

حکم ہوا ہے' وہی کیجیے' خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیے گا۔ جب دونوں نے حکم مان لیا اور باپ نے بیٹے کو ماتھے کے بل لٹا دیا تو ہم نے ان کو پکارا کہ اے ابراہیم! تم نے خواب کو سچا کر دکھایا۔ ہم نیکوکاروں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، بلاشبہ یہ صریح آزمائش تھی، اور ہم نے ایک بڑی قربانی کو ان کا فدیہ دیا' اور پیچھے آنے والوں میں ابراہیم کا ذکر خیر باقی چھوڑ دیا کہ ابراہیم پر سلام ہو' نیکوکاروں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

ان آیات کے ابتداء میں مذکور پہلی بشارت کے بعد ایک اور بشارت کا اس کے بعد اس طرح ذکر فرمایا ہے:

وَبَشَّرْنٰہُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ہ

اور ہم نے ان کو اسحاق کی بشارت بھی دی کہ وہ نبی اور نیکوکاروں میں سے ہوں گے۔

یہ دوسری آیت اس بات کی دلیل ہے کہ پہلی آیت میں جس بیٹے کے متعلق بشارت ہے' وہ اور بیٹا ہے اور یہ اور' کیونکہ پہلی آیت میں مذکور بشارت بھی اگر حضرت اسحاق علیہ السلام ہی سے متعلق ہوتی اور ذبح ہونے کے واقعہ کے ذکر کرنے کے بعد پھر یہ کہنا کہ ہم نے اسے اسحٰق کی بشارت دی' یہ بے فائدہ تکرار ہوتی جس سے کلام الٰہی پاک ہے' لیکن ان آیات سے یہ بات نہایت وضاحت کے ساتھ معلوم ہوئی کہ پہلی آیت میں جس بیٹے کی بشارت ہے اور جس کے عوض ذبح عظیم کا فدیہ دیا گیا ہے' وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں اور اس کے بعد ایک اور آیت میں جو بشارت ہے' وہ حضرت اسحاق علیہ السلام سے متعلق ہے جیسا کہ صریحاً ان کا نام مذکور ہے۔

ان دونوں بشارتوں کو بطریقِ عطف ذکر کیا گیا ہے اور عربی زبان کا یہ قاعدہ معلوم و معروف ہے کہ عطف کا تقاضا مغایرت ہوتا ہے، یعنی معطوف علیہ اور معطوف غیر ہوتے ہیں تو سورۃ صافات کی یہ آیت ایک منصف کے لیے اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیلؑ ہیں، حضرت اسحاقؑ نہیں اور دوسری بات یہ کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کا جہاں جہاں ذکر ہوا ہے، ان کی صفتِ علم مذکور ہوئی ہے جبکہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی صفتِ حلم کو نمایاں طور پر بیان کیا گیا ہے اور اس ذبح ہونے والے صاحبزادے کی صفت بھی یہاں حلم مذکور ہے علم نہیں۔

ہمارے اس موقف کی تائید ایک دوسری دلیل سے بھی ہوتی ہے اور وہ ہے سورۃ ہودؑ میں درجِ ذیل ارشادِ باری تعالیٰ:

وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ۔

اور آپ کی بیوی جو کھڑی تھی، ہنس پڑی، ہم نے اُس کو اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی خوشخبری دی۔

اللہ تعالیٰ کے پیامبر فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی اور یہ خوشخبری بھی دی کہ حضرت اسحاقؑ کے ہاں یعقوب نامی بچہ جنم لے گا تو یہ بات کیسے معقول ہو سکتی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اس بچے کے ذبح کرنے کا حکم دیا جائے جس کے بارے میں یہ بشارت دی گئی ہے کہ اس کے گھر یعقوب نامی بچہ پیدا ہوگا۔ یعنی یعقوب علیہ السلام کی ولادت تک تو وہ یقیناً زندہ رہے گا، تو یہ آیت بھی ہمارے موقف کی ایک زبردست دلیل ہے، لہٰذا ان واضح قرآنی دلائل کے ہوتے ہوئے کسی منصف کو اس کی خلاف ورزی کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔ واللہ اعلم عند اللہ تعالیٰ[1]

۴۔ حافظ ابنِ قیمؒ

امام ابن قیمؒ نے بھی اس موضوع پر اسی طرح کلام کیا ہے جس طرح علامہ شنقیطیؒ نے اپنی تفسیر "اضواء البیان" میں، البتہ

---

[1] اضواء البیان ۶/۱۹۱

ابن قیمؒ کے کلام میں یہ اضافہ بھی ہے کہ اگر یہ کہا جائے کہ اگر معاملہ اسی طرح ہو جس طرح تم نے کہا ہے، تو یعقوب' اسحاق پر عطف کے باعث مجرور ہوگا اور قرأت اس طرح ہوگی، وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ، یعنی یعقوب اسحاق کے بعد ہوں گے' تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ مرفوع ہونا اس امر سے مانع نہیں ہے کہ مبشر بہ یعقوب ہو کیونکہ بشارت قول مخصوص ہے اور ارشادِ باری تعالیٰ، وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ کا جملہ ان قیود کو متضمن ہے، لہٰذا در حقیقت بشارت یہ جملہ خبریہ ہی ہے اور جب بشارت قولاً تھی تو یہ جملہ حکایت بالقول کے باعث محلاً منصوب ہوگا اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کہا کہ اسحٰق کے بعد یعقوب ہوگا، یعنی جب کوئی قائل یہ کہے کہ میں نے فلاں شخص کو یہ خبر دی کہ اس کا بھائی آ رہا ہے اور ساتھ ہی اس کا ساز و سامان بھی آ رہا ہے، تو اس سے دونوں باتوں کی بشارت معلوم ہوتی ہے اور کوئی عقلمند اس بارے میں کسی شک و تردد کا اظہار نہیں کر سکتا۔ جر کو ایک اور امر بھی ضعیف قرار دیتا ہے، یعنی جب آپ یہ کہیں کہ مَرَرْتُ بِزَیْدٍ وَمِنْ بَعْدِہٖ عَمْرٍو تو قول ضعیف ہے، کیونکہ عاطف حرف جر کے قائم مقام ہوتا ہے، لہٰذا معطوف اور مجرور کے درمیان فاصلہ درست نہیں ہوتا، جس طرح حرف جر اور مجرور کے درمیان فاصلہ درست نہیں ہوتا۔[1]

۵۔ کچھ دیگر قرائن

کچھ دیگر قرائن بھی ہیں جو اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں حضرت اسحٰق علیہ السلام نہیں۔ ہم ان قرائن میں سے چند ایک ذیل میں بیان کرتے ہیں :

۱۔ اللہ تعالیٰ نے اسحاق کے بجائے اسماعیلؑ کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ صبر کرنے والوں میں سے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے :

وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِدْرِیْسَ وَذَا الْکِفْلِ	اور اسماعیل اور ادریس اور ذالکفل یہ سب
کُلٌّ مِّنَ الصّٰبِرِیْنَ ۝	صبر کرنے والوں میں سے تھے۔

---

[1] زاد المعاد فی ہدی خیر العباد ۱/۲۷، تحقیق شعیب وعبدالقادر الارنؤوط۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے وعدے کی سچائی کا بھی ذکر فرمایا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۝

اور کتاب میں اسمٰعیل کا بھی ذکر کرو، وہ وعدے کے سچے اور (ہمارے) بھیجے ہوئے نبی تھے۔

اللہ تعالیٰ نے آپ کے وصف صبر کا بھی ذکر فرمایا ہے، یعنی آپ نے بوقتِ ذبح صبر کا مظاہرہ کیا تھا،

اِفْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝

جو آپ کو حکم ہوا ہے، وہی کیجیے، خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابروں میں پائیے گا۔

۲۔ حضرت اسماعیل، حضرت اسحٰق سے بڑے تھے، ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ وَهَبَ لِيْ عَلَى الْكِبَرِ اِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ ۚ

اللہ کا شکر ہے جس نے مجھ کو بڑی عمر میں اسمٰعیل اور اسحاق بخشے۔

اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کردو۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے۔

۳۔ یہ ہم قبل ازیں بیان کرچکے ہیں کہ جس مقام پر ذبح کرنے کا حکم تھا، وہ بیت الحرام کے قریب تھی جو وہ بیت الحرام اسماعیل جس کی تعمیر میں اپنے باپ کے ساتھ شریک تھے، جبکہ حضرت اسحاق علیہ السلام ان دنوں بلادِ شام میں تھے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اس امت میں مبعوث فرمایا تھا جس کے لیے اللہ تعالیٰ کا ارادہ یہ تھا کہ وہ بھی اس دولت کی حفاظت کا اہتمام کرے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کا طرۂ امتیاز تھا اور پھر آپ کے بعد حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ کا طرۂ امتیاز تھا اور وہ ہے اللہ تعالیٰ سبحانہ کے حکم کی کامل و مکمل اطاعت!

۲- ایک دوسری رائے

جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں۔ انھوں نے ایسی روایات پر اعتماد کیا ہے جو منکر ہیں اور جن کی سند صحیح ہے اور نہ متن، ابن کثیرؒ فرماتے ہیں،

"سلف میں سے بہت سے لوگوں نے کہا ہے کہ ذبیح حضرت اسحٰق علیہ السلام ہیں انھوں نے اس بات کو کعب احبار سے لیا ہے یا صحائف اہل کتاب سے جبکہ پیغمبر معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بارے میں کوئی صحیح روایت منقول نہیں ہے' لہٰذا اہل کتاب سے مروی اس روایت کی بنیاد پر ظاہر کتاب اللہ کو کیسے ترک کیا جا سکتا ہے کیونکہ قرآن سے تو ایسا کوئی مفہوم اخذ نہیں ہوتا، بلکہ نص اس بات پر دلالت کناں ہے کہ ذبیح حضرت اسماعیل علیہ السلام ہیں" [۱]

حافظ ابن کثیر ایک دوسرے مقام پر رقم طراز ہیں،

"حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب کعب احبار مسلمان ہوئے تو وہ اپنی قدیم کتب سے حضرت عمرؓ کو مختلف واقعات سنایا کرتے تھے۔ آپ بھی کبھی کبھی اس کی بات کو سن لیتے، تو لوگوں نے سمجھا کہ ان کی باتوں کو سننا شاید جائز ہے' اس لیے کھری کھوٹی بات ہر وہ سنتے آگے بھی بیان کر دیتے، حالانکہ اس امت کو کعب احبار کے کسی ایک حرف کی بھی ضرورت نہ تھی" [۲]

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں،

"حضرات صحابہ کرام، تابعین اور علماء کے نزدیک صحیح قول کے مطابق حضرت اسماعیلؑ ہی ذبیح ہیں۔ حضرت اسحاقؑ کو ذبیح قرار دینے والا قول بیس سے زیادہ وجوہ و اسباب کے باعث باطل ہے۔ میں نے شیخ الاسلام ابن تیمیہ قدس سرہٗ کو بیان فرماتے سنا کہ یہ قول اہل کتاب سے ماخوذ ہے اور ان کی کتاب کی نص سے اس کا

---

[۱] البدایۃ والنہایۃ، ابن کثیرؒ ۱/۱۵۹ [۲] تفسیر ابن کثیر ۴/۱۷

باطل ہونا ثابت سے، چنانچہ ان کی کتاب میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ کو حکم دیا کہ وہ اپنے پہلوٹھی کے بچے کو اور ایک روایت میں ہے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کریں۔ اہلِ کتاب اور مسلمانوں میں سے کسی کو بھی اس بارے میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسماعیلؑ ہی حضرت ابراہیمؑ کے پہلوٹھی کے بیٹے تھے[1] ان لوگوں کو دھوکا اس بات سے ہوا کہ ان کے ہاتھوں میں جو توراۃ ہے، اس میں ہے کہ اپنے بیٹے اسحاقؑ کو ذبح کرو، حالانکہ یہ زیادتی ان کے تحریف و کذب کا شاہکار ہے، کیونکہ یہ اس قول کے متعارض ہے کہ اپنے پہلوٹھے اور اکلوتے بیٹے کو ذبح کرو۔ بات درحقیقت یہ ہے کہ یہودی بنو اسماعیل کے اس شرف سے حسد رکھتے تھے، اور چاہتے تھے کہ یہ شرف ان کے بجائے انہیں حاصل ہو جائے، مگر اللہ تعالیٰ تو یہی چاہتے ہیں کہ جو جس شرف و فضل کا مستحق ہو، وہ اُسے ہی حاصل ہو۔"[2]

---

[1] توراۃ کے بائیسویں باب میں ہے کہ رب تعالیٰ نے فرمایا کہ اپنے اکلوتے بیٹے اسحاق کو لے لو جس سے تمہیں محبت ہے اور اسے ارضِ موریا کی طرف لے جاؤ اور اسے کسی ایک پہاڑ پر چڑھا دو جس کا میں تمہیں نام بتاؤں گا۔

باب ۱۶ میں ہے کہ بات یہ شروع ہوگئی کہ حضرت سارہؑ، ہاجرہؑ کو حضرت ابراہیمؑ کے نکاح میں دے دیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ان کے گھر کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا اور پھر اس دوسری شادی کے بعد اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے، جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ برس تھی، جبکہ باب ۲۱ میں ہے کہ جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی تو اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۱۰۰ برس تھی۔ (بحوالہ قصص الانبیاء ص ۱۰۲)

[2] زاد المعاد ۱/۷۲، تحقیق شعیب عبدالقادر ارنؤوط

فضائل حضرت ابراہیم علیہ السلام

- ابراہیم علیہ السلام امت تھے
- ملت ابراہیم علیہ السلام
- وَاتَّخَذَ اللّٰہُ اِبْرَاہِیْمَ خَلِیْلًا
- فضائل ابراہیم علیہ السلام
- احادیث نبویہ کی روشنی میں
- بلادشام کی اہمیت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ
مِيْثَاقَهُمْ وَمِنْكَ وَمِنْ نُّوْحٍ
وَّاِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ۪ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ
مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۟

سورۃ احزاب ۷

اور جب ہم نے پیغمبروں سے عہد لیا اور تم سے اور نوح سے
اور ابراہیم سے اور موسیٰ سے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ سے
اور عہد بھی ان سے پکا لیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سیرت بیان کرتے ہوئے ہم اُن کے فضائل و مناقب اور مکارمِ اخلاق کا ایک حصہ بیان کر آئے ہیں۔ ان کے قوتِ ایمان اور شدتِ صبر کی روشنی میں عبرت و نصیحت کی بہت سی باتیں بھی بیان کر آئے ہیں اس کے باوجود آپ کے اعمالِ جلیلہ سے متعلق گفتگو کی ابھی بڑی گنجائش باقی ہے، چنانچہ ذیل میں اس سلسلہ میں کچھ مزید بیان کیا جاتا ہے:

۱۔ ابراہیمؑ اُمّت تھے

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ؕ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۙ شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ ؕ اِجْتَبٰهُ وَهَدٰهُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ وَاٰتَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً ؕ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ؕ [1]	بیشک ابراہیمؑ (لوگوں کے) امام (اور) اللہ کے فرماں بردار تھے جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے، اس کی نعمتوں کے شکرگزار تھے۔ اللہ نے ان کو برگزیدہ کیا تھا اور (اپنی) سیدھی راہ پر چلایا تھا اور ہم نے اُن کو دنیا میں بھی خوبی دی تھی اور وہ آخرت میں بھی نیک لوگوں میں ہوں گے۔

اُمّۃ ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو "اُمّت" کے لقب سے نوازا ہے، تو وہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو جو ایمان، ثابت قدمی اور صفاتِ حمیدہ سے سرفراز فرمایا تھا، ان کے اعتبار سے آپ تن تنہا ایک جماعت کے برابر تھے۔

---

[1] سورۃ النحل، آیات ۱۲۰ تا ۱۲۲

قَانِتًا لِّلّٰہِ حَنِیۡفًا وَّلَمۡ یَکُ مِنَ الۡمُشۡرِکِیۡنَ ۝

یعنی آپ امرِالٰہی کے قائم کرنے والے تھے اور ملتِ اسلامی کی طرف آپ کا میلان اس قدر شدید تھا کہ اس میں کسی لچک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ حافظ ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی شان میں جو یہ فرمایا ہے کہ اِنَّ اِبۡرٰہِیۡمَ کَانَ اُمَّۃً ؕ تو اس میں درحقیقت مدح وثنا کے چار پہلو ہیں۔ آغازِ کلام میں یہ فرمایا کہ وہ ایک "اُمت" تھے۔ اُمت اس مقتدا کو کہا جاتا ہے جس کی اقتدا کی جاتی ہو۔

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ امت کے معنی معلّمِ خیر کے ہیں، اُمَّۃٌ، اِئْتِمَام سے قُدْوَۃٌ کے وزن پر ہے۔ اس کے معنی اس مقتدا کے ہیں جس کی اقتدا کی جاتی ہو۔ اُمَّۃٌ اور امام میں فرق دو اعتبار سے ہے۔ ایک تو یہ کہ امام ہر اس چیز کو کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جاتی ہو، خواہ اس کے قصد و شعور سے ہو یا بغیر قصد و شعور کے، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ راستے کو بھی امام سے تعبیر کیا جاتا ہے، چنانچہ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَاِنۡ کَانَ اَصۡحٰبُ الۡاَیۡکَۃِ لَظٰلِمِیۡنَ ۝ فَانۡتَقَمۡنَا مِنۡہُمۡ ۘ وَاِنَّہُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِیۡنٍ ۝	اور بن کے رہنے والے (یعنی قومِ شعیب کے لوگ) بھی گناہگار تھے تو ہم نے ان سے بھی بدلہ لیا اور یہ دونوں شہر کھلے رستے پر (موجود) ہیں۔

یعنی وہ ایک واضح راستے پر ہیں جو راہ چلنے والے پر مخفی نہیں ہیں، لیکن یاد رہے کہ طریق یعنی راستہ کو امت کے نام سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ امت کے لفظ میں معنی کی زیادتی موجود ہے اور یہ کہ امت اُس کو کہا جاتا ہے جو علم و عمل کے اعتبار سے صفاتِ کمال کا جامع ہو اور وہ ان صفات میں یکتا ہو، یعنی تنہا اس کی شخصیت میں وہ صفات جمع ہیں جو دوسرے بہت سے لوگوں میں فرداً فرداً پائی جاتی ہیں، چنانچہ اُمت کا لفظ اسی مفہوم کی طرف اشارہ کرتا ہے، چنانچہ حدیث میں ہے: زید بن عمرو بن نفیل کو قیامت کے دن ایک

اُمت کی حیثیت سے اٹھایا جائے گا۔ اُمت کا لفظ واحد ہے اور اس کی جمع اُمم آتی ہے۔ ایک دین پر مجتمع یا ایک دور کے لوگوں کو اُمت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

قَانِتًا کی تفسیر میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مطیع اور فرماں بردار ہے۔ قنوت کی تفسیر میں اور بھی بہت کچھ کہا گیا ہے جن سب کا مفہوم دوام اطاعت ہے۔

حَنِیْفًا کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونے والا اور اسی کے مفہوم میں یہ بھی داخل ہے کہ وہ ماسوا اللہ سے بالکل الگ تھلگ ہو۔

شَاكِرًا لِّاَنْعُمِهٖ، نعمتوں کا شکر ادا کرنا تین ارکان پر مبنی ہے۔

(۱) یہ کہ نعمت کا اقرار کرے۔

(۲) منعم کی طرف نعمت کی اضافت کرے اور

(۳) نعمت کو منعم کی رضا کے کاموں میں صرف کرے اور اس نعمت کے سلسلہ میں جو امور واجب ہیں، ان کے مطابق عمل کرے۔

ان تین امور کو ملحوظِ خاطر رکھے، ان کے بغیر کوئی شخص شاکر نہیں کہلا سکتا۔

الغرض اس آیتِ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے خلیل کی چار صفتیں بیان فرمائی ہیں، جن میں علم، اس کے بموجب عمل اور خلقِ خدا کو اس کی طرف دعوت قدرِ مشترک ہیں۔ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام ایمان، اللہ تعالیٰ کی عبودیت اور اُس کی نعمتوں کے شکر کے اعتبار سے واقعی ایک اُمت تھے۔ ثبات علی الحق اور قوم کی تکلیفوں اور ظلم پر صبر کے اعتبار سے ایک اُمت تھے۔ حلم، سینہ کی کشادگی، نرمی اور حُسنِ خلق، قوتِ دلیل اور شدید ذہانت و فطانت کے اعتبار سے بھی ایک اُمت تھے۔ جود و سخا اور جان پہچان والے لوگ ہوں یا انجان سب پر خرچ کرنے کے اعتبار سے بھی ایک اُمت تھے۔ پوری کائنات سے کٹ کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے ہو کر رہ گئے تھے اور تمام امور میں سراپا اطاعت بن گئے تھے۔ اس اعتبار سے بھی آپ ایک اُمت تھے اور

---

[1] مفتاح دار السعادۃ، وجہ ۱۴۰، فضل العلم (بحوالہ فتح المجید، ص ۵۸)

مشرکین سے جو آپ اظہار برأت کرتے رہتے تھے، ان سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے اور ان سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے، اس اعتبار سے بھی آپ ایک اُمت تھے۔

۲۔ ملتِ ابراہیم

یہود و نصاریٰ ——— اپنے شرک و ضلالت کے علی الرغم اور مسلمان اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت ابراہیم ہدایت اور ہدایت یافتگان کے امام تھے۔ اسی سے یہودیوں نے یہ گمان کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی تھے جیسا کہ عیسائیوں نے گمان کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام عیسائی تھے۔ آپ کے علاوہ اہلِ کتاب مسلمانوں کے ساتھ کسی اور نبی کے علوشان پر متفق نہیں ہیں، حتیٰ کہ یہود و نصاریٰ خاتم الانبیا والمرسلین علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم کی نبوت کا بھی اعتراف نہیں کرتے۔ یہ امتیاز و انفرادیت صرف ابراہیم علیہ السلام ہی کا خاصہ ہے۔ یہود و نصاریٰ اگرچہ آپ کے بارے میں مدعی ہیں کہ آپ بھی انہیں میں سے تھے، لیکن حق بات یہ ہے جس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آپ یہود و نصاریٰ کے شرک سے بری تھے جیسا کہ آپ نے اپنے باپ اور قوم کے عقیدہ سے برأت کا اظہار کر دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ[۱]	ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی، بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (اللہ) کے ہو رہے تھے اور اسی کے فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

نیز فرمایا:

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ تَهْتَدُوا قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ[۲]	اور (یہودی اور عیسائی) کہتے ہیں کہ یہودی یا عیسائی ہو جاؤ، تو سیدھے رستے پر لگ جاؤ (اے پیغمبر ان سے) کہہ دو (نہیں) بلکہ (ہم) دینِ ابراہیم اختیار کیے ہوئے ہیں

یعنی آپ کا تعلق یہودیوں کے ساتھ نہ تھا جو کہ یہ عقیدہ رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتے ہیں کہ حضرت عزیر علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بیٹے ہیں اور نہ آپ کا تعلق عیسائیوں کے ساتھ تھا جو

---

[۱] سورۃ آل عمران، آیت ۶۷ [۲] سورۃ البقرۃ، آیت ۱۳۵

یہ عقیدہ رکھتے ہوئے شرک کرتے ہیں کہ حضرت مسیح، اللہ تعالیٰ کے بیٹے تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝	(اے یہود و نصاریٰ) کیا تم اس بات کے قائل ہو کہ ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اُن کی اولاد یہودی یا عیسائی تھے (اے محمد ان سے کہو کہ بھلا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی شہادت کو جو اس کے پاس (کتاب میں موجود) ہے چھپائے اور جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو، اللہ اس سے غافل نہیں۔

جب حق تعالیٰ و سبحانہ نے اس بات کی نفی فرمائی کہ ابراہیم یہودی و عیسائی نہ تھے تو بہت سارے مقامات پر یہ بات بھی بڑے زور دار انداز میں بیان فرمائی کہ آپ حنیف اور مسلم تھے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝	ابراہیم نہ تو یہودی تھے اور نہ عیسائی، بلکہ سب سے بے تعلق ہو کر ایک (اللہ تعالیٰ) کے ہو رہے تھے اور اسی کے فرمانبردار تھے اور مشرکوں میں نہ تھے۔

نیز فرمایا:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا ۝	اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے حکم کو قبول کیا اور وہ نیکوکار بھی ہے اور ابراہیم کے دین کا پیرو ہے جو یکسو (مسلمان) تھے اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا۔

حضرت ابراہیم خلیل الرحمٰن کے لیے یہی عزت اور فضل و کرم کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتِ ابراہیمی کے اتباع کا حکم دیا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ سے

---

[1] سورۃ البقرۃ، آیت ۱۴۰، [2] سورۃ آل عمران، آیت ۶۷

مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا،

ثُمَّ اَوۡحَيۡنَاۤ اِلَيۡكَ اَنِ اتَّبِعۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهِيۡمَ حَنِيۡفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝[1]

پھر ہم نے تمہاری طرف وحی بھیجی کہ دینِ ابراہیم کی پیروی اختیار کرو جو ایک طرف کے ہو رہے تھے اور مشرکوں میں سے نہ تھے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر فرماں بردار و وفاشعار مسلمان کے لیے آپ کو ایک اُسوۂ حسنہ قرار دیا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

قَدۡ كَانَتۡ لَكُمۡ اُسۡوَةٌ حَسَنَةٌ فِىۡۤ اِبۡرٰهِيۡمَ وَالَّذِيۡنَ مَعَهٗ ۚ اِذۡ قَالُوۡا لِقَوۡمِهِمۡ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنۡكُمۡ وَمِمَّا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ ۫[2]

تمہیں ابراہیم اور ان کے رفقاء کی نیک چال چلنی (ضرور) ہے۔ جب انہوں نے اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ ہم تم سے اور اُن (بتوں) سے جن کو تم اللہ کے سوا پوجتے ہو بے تعلق ہیں۔

ملتِ ابراہیمی سے صرف وہی شخص اعراض کر سکتا ہے جو بیوقوف ہو، اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک کرتا ہو اور گم گشتہ راہ ہو۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے،

وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصۡطَفَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ۝[3]

اور ابراہیم کے دین سے کون روگردانی کر سکتا ہے بجز اس کے جو نہایت نادان ہو، ہم نے ان کو دنیا میں بھی منتخب کیا تھا اور آخرت میں بھی وہ (زمرۂ) صلحاء میں ہوں گے۔

سَفِهَ نَفۡسَهٗ کے معنی ہیں کہ اس نے خود ہی اپنے نفس کو ذلیل و خوار کر لیا ہے جیسے یہودیوں عیسائیوں اور عرب کے بت پرستوں نے اپنے آپ کو ذلیل و خوار کر لیا تھا اور اس کے بعد والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ بلند و بالا اور ارفع و اعلیٰ مقام

---

[1] سورۃ النحل، آیت ۱۲۳ [2] سورۃ الممتحنہ، آیت ۴ [3] سورۃ البقرۃ، آیت ۱۳۰

و مرتبہ صرف اس لیے حاصل کیا تھا کہ انہوں نے اپنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے سپرد کر دیا تھا۔ استقامت کا مظاہرہ فرمایا اور اپنا تن من دھن نثار کر دیا تھا۔ اسی عقیدہ پر پابند رہنے کی انہوں نے اپنے بچوں کو وصیت بھی فرمائی تھی۔ قرآن مجید میں اس کا تذکرہ ان الفاظ میں ہے،

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهِيْمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ۭ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَاۗءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ۭ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَاۗىِٕكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰــهًا وَّاحِدًا ښ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝[1]

اور ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اسی بات کی وصیت کی اور یعقوب نے بھی (اپنے فرزندوں سے یہی کہا) کہ بیٹا اللہ نے تمہارے لیے یہی دین پسند کیا ہے تو مرنا تو مسلمان ہی مرنا۔ بھلا جس وقت یعقوب وفات پانے لگے، تو تم اس وقت موجود تھے، جب انہوں نے اپنے بیٹوں سے پوچھا کہ میرے (مرنے کے) بعد تم کس کی عبادت کرو گے تو انہوں نے کہا کہ آپ کے معبود اور آپ کے باپ دادا ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کے معبود کی عبادت کریں گے جو معبود یکتا ہے اور ہم اسی کے حکم بردار ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے ہاں نسب یا قبیلے کی کوئی اہمیت نہیں، ان کی بارگاہ میں پذیرائی ہے تو دین اور عقیدے کو ارشاد باری تعالیٰ ہے،

اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَھٰذَا النَّبِىُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ[2]

ابراہیم سے قرب رکھنے والے تو وہ لوگ ہیں، جو ان کی پیروی کرتے ہیں اور یہ پیغمبر (آخر الزماں) اور وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور اللہ مومنوں کا کارساز ہے۔

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۱۳۲۔ ۱۳۳

[2] سورۃ آل عمران، آیت ۶۸

قدیم و جدید زمانے میں جس نے بھی ابراہیم علیہ السلام کی اتباع کی اسے یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی نسبت آپ کی طرف کرے اور آپ زیادہ حق دار ہیں کہ آپ کی اتباع کی جائے۔ گزشتہ صفحات میں ہم یہ پڑھ آئے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ اور دیگر قریبی رشتہ داروں سے الگ تھلگ ہو گئے تھے، تو اس دور میں آپ ان لوگوں سے الگ کیوں نہ ہوں جو آپ کے باپ اور قوم عقیدہ سار کھتے ہیں۔ آپ ایسے لوگوں سے کیوں نہ اظہار برأت فرمائیں، جبکہ اللہ جل وعلا نے آپ کو یہ خبر دے دی تھی کہ آپ کی اولاد میں سے جو لوگ ظالم ہوں گے، وہ امام نہ ہوں گے اور نہ ان سے اللہ تعالیٰ کا کوئی عہد و پیمان ہے۔ آپ نے جب یہ خود ہی فرمایا تھا تو کیوں نہ ایسے لوگوں سے اظہار برأت کریں۔

فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ ۚ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ [1]

جس شخص نے میرا کہا مانا ہے، وہ میرا ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا مہربان ہے۔

۳- وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا:

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَمَنْ اَحْسَنُ دِیْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۗ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِیْمَ خَلِیْلًا [2]

اور اس شخص سے کس کا دین اچھا ہو سکتا ہے، جس نے حکم الٰہی کو قبول کیا اور وہ نیکو کار بھی ہے اور ابراہیم کے دین کا پیرو ہے جو یکسو (مسلمان) تھے اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا دوست بنایا تھا

غایت درجہ کی محبت کو خلت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خلیل کو خلیل اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی محبت دل میں اس قدر رچ بس جاتی ہے کہ وہ دل میں کوئی جگہ بھی خالی نہیں رہنے دیتی

---

[1] سورۃ ابراہیم، آیت ۳۶ [2] سورۃ النساء، آیت ۱۲۵

جیساکہ ایک عربی شاعر نے کہا ہے ؎

قد تخللت مسلك الروح منی
وبذا سمی الخلیل خلیلا

(تم مجھ میں رُوح کی طرح رچ بس گئے ہو اور جو اس طرح رچ بس جائے اسے خلیل کہا جاتا ہے)

کائنات میں سے یہ مقام حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت محمد مصطفٰے علیہ افضل الصلاۃ والسلام ہی کو ملا ہے جیساکہ صحیح بخاری، صحیح مسلم اور دیگر کتب حدیث میں بروایت جندب بجلی، عبداللہ بن عمرو اور ابن مسعود (رضی اللہ عنہم) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے:

"لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے بھی اپنا اسی طرح خلیل بنایا ہے جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اُس نے اپنا خلیل بنایا تھا۔"

ایک اور خطبہ کے آخر میں آپ نے فرمایا،

"لوگو، اگر میں اہلِ زمین میں سے کسی کو اپنا خلیل بناتا، تو ابوبکر کو خلیل بنالیتا، لیکن تمہارے ساتھی (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم) تو اللہ کے خلیل ہیں۔"

صحیح بخاری میں عمرو بن میمون کی روایت ہے کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب یمن گئے اور انہوں نے صبح کی نماز پڑھاتے ہوئے اس آیتِ مبارکہ "وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِيْمَ خَلِيْلًا" کی تلاوت فرمائی، تو قوم میں سے ایک شخص بے ساختہ پکار اُٹھا:

لقد قرت عین أُمّ ابراهیم۔ — پھر تو ابراہیم علیہ السلام کی ماں کی آنکھوں کو ٹھنڈک نصیب ہو گئی ہو گی۔

۴۔ فضائلِ ابراہیم ـــــ احادیثِ نبویہ کی روشنی میں

۱۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم روزِ قیامت ننگے پاؤں، برہنہ جسم، اور ختنہ کے بغیر اُٹھائے جاؤ گے۔ پھر آپ نے آیت مبارکہ ارشاد فرمائی:

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ	جس طرح ہم نے (کائنات کو) پہلے پیدا کیا تھا
نُعِيدُهُ ۚ وَعْدًا عَلَيْنَا ۚ	اسی طرح دوبارہ پیدا کردیں گے (یہ) وعدہ ہے
إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ ۝	جس کا پورا کرنا لازم ہے، ہم ایسا ضرور کرنے والے ہیں

قیامت کے دن سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ میرے کچھ ساتھیوں کو بائیں طرف لے جایا جائے گا۔ میں کہوں گا کہ یہ میرے ساتھی ہیں، یہ میرے ساتھی ہیں، تو مجھے بتایا جائے گا کہ جب سے انہیں آپ نے چھوڑا، یہ دین کو چھوڑتے رہے ہیں، تو میں بھی اسی طرح کہوں گا جس طرح ایک نیک بندے نے کہا تھا:

وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَا	اور جب تک میں ان میں رہا، ان کے حالات
دُمْتُ فِيهِمْ . . . . . الْحَكِيمُ	کی خبر رکھتا رہا . . . .

بیہقی نے ایک اور سند کے ساتھ بروایتِ ابن عباسؓ مرفوعاً بیان کیا ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جنت کا ایک حُلّہ زیب تن کیا جائے گا۔ عرش کے دائیں جانب آپ کے لیے ایک کرسی لائی جائے گی اور مجھے بھی جنت کا ایک ایسا حُلّہ پہنایا جائے گا جو کسی فردِ بشر کو بھی نصیب نہ ہوگا۔[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ خصوصیت اس لیے حاصل ہوئی کہ آپ کو عریاں آگ میں ڈالا گیا تھا۔ اس سلسلہ میں ایک قول یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس خصوصیت کا سبب یہ ہے کہ آپ نے سب سے پہلے شلوار پہننا شروع کیا تھا۔

۲۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ سب سے معزز کون ہے؟ آپ نے فرمایا جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ عرض کیا گیا کہ ہمارے سوال سے یہ مراد نہیں۔ فرمایا پھر اللہ کے نبی یوسف بن اللہ کے نبی، ابن اللہ کے نبی بن خلیل اللہ

---

[1] حدیث ابن عباس کو امام بخاری نے اپنی "صحیح" میں بیان فرمایا ہے۔ بیہقی کی روایت کو حافظ نے "فتح الباری" ۷/۱۹۰ میں ذکر کیا ہے۔

سب سے زیادہ معزز ہیں . . . . . الحدیث [1]

حضرت یوسف علیہ السلام کو جو سب سے زیادہ معزز قرار دیا گیا، اس کا ایک سبب تو وہ شرف ہے جو آپ کو اعمالِ صالحہ کے اعتبار سے حاصل تھا اور دوسرا سبب وہ تھا جو آپ کو نیک نسب کے باعث حاصل تھا۔

۳۔ امام مسلمؒ نے اپنی "صحیح" میں بروایتِ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اسراء و معراج کے سلسلہ میں ایک لمبی حدیث ذکر فرمائی جس میں یہ بھی ہے کہ پھر مجھے ساتویں آسمان پر لے جایا گیا، جبریل علیہ السلام نے دروازہ کھلوایا، تو پوچھا گیا کہ کون؟ جواب دیا کہ جبریل ہوں۔ پوچھا گیا کہ آپ کے ساتھ کون ہیں؟ جواب دیا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پوچھا گیا کیا انہیں مبعوث کر دیا گیا ہے؟ جواب دیا جی ہاں! مبعوث کر دیا گیا ہے۔ پھر ہمارے لیے دروازہ کھول دیا گیا تو میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا جو بیت المعمور[2] کے ساتھ ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ بیت المعمور میں ہر روز ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں، جن کی دوبارہ باری نہ آئے گی۔ [3]

ایک دوسری روایت میں ہے جسے امام مسلم نے بروایتِ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی تفصیل بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دیکھا کہ میں آپ کی ساری اولاد میں سے آپ سے زیادہ مشابہت رکھتا ہوں۔

ایک اور روایت میں ہے جسے بخاری نے اپنی "صحیح" میں بروایتِ مالک بن صعصعہ بیان کیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہمارے نبی علیہما افضل الصلاۃ والتسلیم سے فرمایا، "اے میرے بیٹے اور نبی تجھے خوش آمدید ہو!" [4]

---

[1] ان دونوں روایتوں کو امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے، فتح الباری ۱۹۸، ۲۲۵/۶، المطبی [2] مختصر صحیح مسلم للمنذری، باب الاسراء بالنبی، ۲۷/۱ [3] بیت المعمور ساتویں آسمان پر ہے جیسا کہ مسلم نے بروایت انس، بخاری نے بروایت مالک بن صعصعہ بیان کیا ہے۔ دوسری روایات جو اس گھر کی شکل و صورت سے متعلق ہیں وہ صحیح نہیں ہیں [4] اسے بخاری و مسلم نے بیان کیا ہے، زاد المسیر ۴۲/۸

ان سب روایات سے ہمارا استدلال یہ ہے کہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام ساتویں آسمان میں ہیں اور آپ اُن تمام انبیا کرام علیہم السلام سے افضل ہیں، جن کا آپ نے شبِ معراج دیدار کیا تھا۔

۴۔ قبل ازیں گزر چکا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی تردید فرمائی جنہوں نے یہ کہا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ایمان سے قبل اللہ تعالیٰ کی ذات کے بارے میں شک تھا، تو آپ نے حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کا یہ قول:

رَبِّ اَرِنِیْ کَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰی ؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْ ؕ قَالَ بَلٰی وَلٰکِنْ لِّیَطْمَئِنَّ قَلْبِیْ [1]

اے پروردگار مجھے دکھا کہ تو مُردوں کو کیونکر زندہ کرے گا۔ اللہ نے فرمایا کیا تم نے (اس بات کو) باور نہیں کیا۔ انہوں نے کہا کیوں نہیں، لیکن (میں دیکھنا) اس لیے چاہتا ہوں کہ میرا دل اطمینان کامل کرلے

پڑھ کر فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت ہم زیادہ حق دار ہیں کہ شک کریں۔ قبل ازیں ہم اس حدیث کے معنی بھی بیان کر آتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک ہوتا تو ہم آپ کی نسبت زیادہ شک کرنے والے ہوتے، لیکن جب ہمیں شک نہیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو شک کیسے ہو سکتا تھا۔

۵۔ حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب حضرت حسنؓ و حسینؓ کو دم کرتے تو فرماتے کہ تمہارے بابا اسماعیلؑ و اسحاقؑ کو یہ دم کیا کرتے تھے:

اعوذ بکلمات اللہ التامۃ من کل شیطان وھامۃ، ومن کل عین لامۃ۔ [2]

۶۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُس نے آپ سے مخاطب ہو کر کہا: "اے ساری مخلوق سے بہتر انسان!" آپ نے فرمایا: "وہ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔" [3]

---

[1] فتح الباری، ۴۲۲/۷ [2] فتح الباری ۲۲۱/۷ [3] مختصر صحیح مسلم، منذری ۱۸۵/۲

۷۔ عمرو بن سُلَیم زُرَقی سے روایت ہے کہ مجھے ابو حمید ساعدی رضی اللہ عنہ نے خبر دی کہ صحابہ کرام نے عرض کیا: "یارسول اللہ ہم آپ پر کیسے درود بھیجیں؟" فرمایا، یہ کہا کرو،

اللّٰھم صل علی محمد وازواجه وذریته
کما صلیت علی آل ابراھیم، وبارك علی محمد
وازواجه وذریته کما بارکت علی آل ابراھیم
انك حمید مجید۔

صلوٰۃ کے لفظ کی جب اللہ کی طرف اضافت ہو تو اس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کی فرشتوں کے پاس اپنے نبی کی تعریف اور جب اس کی فرشتوں کی طرف اضافت ہو تو اس سے مراد دُعا ہوتی ہے۔

ایک دوسری روایت میں ہے جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللّٰھم صل علی محمد وعلی اٰل محمد کما صلیت
علی ابراھیم وعلی اٰل ابراھیم انك حمید مجید[1]

یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے نبی اور خلیل حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تکریم ہے کہ مسلمان آپ کے لیے بھی اسی طرح دست بدعا رہتے ہیں جس طرح اپنے پیغمبر حضرت محمد مصطفےٰ علیہ افضل الصلاۃ والتسلیم کے لیے اور پھر اس درود اور دُعا کو دن رات میں کم از کم پانچ اوقات میں تو ضرور دوہرایا جاتا ہے۔

۸۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب بیت اللہ شریف میں تصویریں دیکھیں، تو آپ داخل ہی نہ ہوئے تاآنکہ آپ کے حکم سے انہیں محو کر دیا گیا۔ آپ نے حضرت ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام کی تصویروں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھوں میں قسمت آزمائی کے تیر ہیں۔ تو آپ نے فرمایا: "اللہ انہیں غارت کرے، واللہ! انہوں نے تو کبھی بھی

---

[1] فتح الباری ۱ ۲۲۰/۷ ‖ ۱۵۲/۱۰

قسمت آزمائی نہ کی تھی۔"

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک دوسری روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "انہیں کیا ہو گیا ہے، انہوں نے تو یہ بات سُنی ہوئی ہے کہ فرشتے اس گھر میں داخل نہیں ہوتے جس میں تصویر ہو، مگر انہوں نے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تصویر بنا رکھی ہے اور پھر تعجب کہ وہ تیر کے ساتھ قسمت آزمائی بھی کر رہے ہیں[1] (حالانکہ انہوں نے کبھی ایسا کام نہیں کیا تھا)

۹۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسیؓ برس کی عمر میں تیشے کے ساتھ اپنا ختنہ خود کر لیا تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانیؒ فرماتے ہیں کہ اور بھی بہت سے ایسے کام ہیں جن کے کرنے میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اولیت کا مقام حاصل ہے، مثلاً سب سے پہلے آپ نے مہمان نوازی کا آغاز فرمایا تھا۔ مونچھیں کٹوائی تھیں، ختنہ کیا تھا اور سفید بال بھی سب سے پہلے آپ ہی کے شروع ہوئے تھے۔[2]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں گفتگو کے آغاز میں ہم اس بات کا سبب بیان کر آئے ہیں کہ آپ نے تیشہ کے ساتھ اپنا ختنہ فوراً اس لیے کر لیا تاکہ آپ جلد از جلد اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت کر سکیں اور اس کے امر کو فوراً نافذ کر دیں، خواہ اس سلسلہ میں جان کی قربانی ہی کیوں نہ کرنی پڑے یا صحت کا خطرہ ہی کیوں نہ مول لینا پڑے، مونچھیں کٹوانا بھی اس بات کی دلیل ہے کہ آپ ہر چیز کو اس کا صحیح صحیح حق دینا چاہتے تھے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ جن احادیث میں یہ آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ساری مخلوق سے بہتر ہیں یا آپ سب سے زیادہ معزز ہیں یا سب سے پہلے روزِ قیامت آپ کو لباس پہنایا جائے گا، تو اُن کا یہ مطلب نہیں کہ آپ ہمارے نبی حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ افضل ہیں؛

---

[1] ان دونوں حدیثوں کو بخاریؒ نے اپنی صحیح میں بیان فرمایا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے فتح الباری ۱۹۰، ۱۹۸/۷

[2] حدیث ابوہریرہؓ کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے، فتح الباری ۱۹۹/۷

چنانچہ امام نوویؒ فرماتے ہیں: "علماء کا فرمانا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ ارشادات از راہِ تواضع اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خلت وابوّت کے احترام کے پیشِ نظر تھے، وگرنہ بحیثیتِ مجموعی ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سب نبیوں سے زیادہ افضل ہیں جیساکہ آپ کا ارشادِ گرامی ہے کہ میں ساری اولادِ آدم کا سردار ہوں۔ اس سے آپ کا مقصود فخر اور غرور نہ تھا بلکہ یہ آپ نے حقیقتِ حال کی وضاحت اور امرِ رب کی تبلیغ واشاعت کے نقطۂ نگاہ سے فرمایا، اسی لیے ساتھ آپ نے یہ وضاحت بھی فرمادی تھی کہ میں جو یہ بات کہہ رہا ہوں تو اس میں فخر کا ادنیٰ شائبہ تک بھی نہیں۔ آپ نے یہ وضاحت بھی اس لیے ضروری سمجھی تاکہ بعض ناقص عقلوں میں جو وہم وگمان پیدا ہو سکتا تھا، اس کی نفی کر دی جائے۔" [1]

حافظ ابن کثیرؒ بھی فرماتے ہیں کہ یہ سب کچھ اس کے منافی نہیں ہے جو آپ سے تواتر کے ساتھ منقول ہے کہ آپ روزِ قیامت ساری اولادِ آدم کے سردار ہوں گے، اسی طرح اس پر وہ حدیث بھی دلالت کناں ہے جو صحیح مسلم میں بروایتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہ مروی ہے کہ تیسری دُعا کو میں نے اس دن کے لیے مؤخر کرلیا ہے، جبکہ ساری مخلوق بشمول حضرت ابراہیمؑ میری طرف رغبت رکھتے ہوں گے، لیکن جب حضرت ابراہیمؑ، حضرت محمد صلوات اللہ وسلامہ علیہم اجمعین کے بعد افضل الرسل اور اولوالعزم تھے، تو نمازی کو حکم دیا گیا کہ وہ تشہد میں وہ دُعا پڑھے جو صحیحین میں کعب بن عجرہ اور کئی دیگر صحابہ کرام سے مروی ہے کہ ہم نے عرض کیا یارسول اللہ! آپ پر سلام کا طریقہ تو ہم نے معلوم کرلیا، لیکن یہ فرمائیے کہ آپ پر صلاۃ کس طرح بھیجیں؟ فرمایا، تم یہ کہو:

اللّٰھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وآل ابراھیم وبارك علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما بارکت علیٰ ابراھیم وآلِ ابراھیم انك حمید مجید ۝

---

[1] صحیح مسلم بشرح النووی، حاشیہ ۱۵/۱۲۱ - دار الفکر، بیروت

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وَ اِبْرَاهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰى۔ — اور ابراہیم جنہوں نے (حقِ طاعت و رسالت) پورا کیا۔

یعنی انہیں جو حکم دیا گیا اسے انہوں نے پورا کر دیا' ایمان کی تمام خصال اور شاخوں کے مطابق عمل کیا، امرِ قلیل کی مصلحت کے قیام کے سلسلہ میں بڑی سے بڑی مشغولیت بھی ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بن سکتی تھی اور نہ چھوٹی چھوٹی مصلحتیں انہیں بڑے سے بڑے کام سرانجام دینے سے مانع ہو سکتی تھیں۔ [1]

۵ - بلادِ شام کی اہمیت

اس بحث کے گزشتہ صفحات میں یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کس طرح اپنی قوم سے علیحدگی اختیار کی، جبکہ انہوں نے آپ کی دعوت سے اعراض کیا تھا اور کوئی وعظ و ارشاد انہیں فائدہ نہیں پہنچا رہا تھا، تو آپ نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں ہجرت کرتے ہوئے اپنے وطن مالوف کو خیرباد کہہ دیا اور بجز تقویٰ اور حسنِ طاعت کے اس کٹھن اور دشوار گزار سفر کے لیے کوئی زادِ راہ ساتھ نہ لیا۔

مصر میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو آزمائش میں ڈالا اور حضرت سارہؑ کا طاغوت کے ساتھ معاملہ پیش آیا' یہ الگ بات کہ اس آڑے وقت بھی آپ کو آپ کے رب نے نہ چھوڑا اور تکلیف دہ صورتِ حال ختم کر کے آپ کے عزت و ناموس کی حفاظت فرمائی۔ کچھ عرصہ بعد آپ کو پھر مشکلات کا سامنا کرنا پڑا' یہ مشکلات حاسدوں کے حسد اور مجرموں کے مکر و فریب کی صورت میں تھیں، لہٰذا آپ مصر کو خیرباد کہنے پر بھی مجبور ہو گئے اور بابرکت سرزمین یعنی قدس اور اس کے قرب و جوار کے علاقے بلادِ شام کی طرف تشریف لے آئے۔

سرزمینِ قدس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح کی قدرے راحت محسوس کی جس طرح

---

[1] صحیح مسلم، از ابی ہریرہ، کتاب الفضل، مختصر صحیح مسلم ۱۶۲/ ۲

کی راحت آپ بابل یا مصر میں محسوس فرماتے تھے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ رب تعالیٰ نے آپ کو فتوحات سے نوازا اور آپ کو وسیع زمینوں، بے شمار مویشیوں اور بے شمار مال و دولت کے مالک بھی بن گئے تھے اور اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم کا اتمام اس طرح فرمایا کہ آپ کو اسماعیل جیسا لختِ جگر عطا فرمایا، مگر یہاں پھر ایک مشکل پیش آ گئی اور یہ حضرت سارہؑ اور ہاجرہؑ کے باہمی تعلقات میں آویزش تھی، تو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ سارہؑ کی دلجوئی کرو، لہٰذا آپ اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کو لے کر گھر سے نکل پڑے اور انہیں ایک ایسی وادی غیر ذی زرع میں لا بسایا جس میں دُور دُور تک نہ کوئی انسان تھا اور نہ پانی کا نام و نشان، لیکن پھر دُعائے خلیلؑ کو شرفِ قبولیت سے سرفراز فرما کر اللہ تعالیٰ نے مکہ کو انسانوں سے شاد و آباد کر دیا۔ اسماعیل علیہ السلام نے عربوں کے ایک قبیلہ بنو جرہم جو یہاں آ کر آباد ہو گیا تھا، میں نشاۃ و ارتقاء کی منزلیں طے کیں، جوان ہوئے تو اسی خاندان کی ایک خاتون سے شادی کر لی۔ آپ کے والد ماجد وقتاً فوقتاً ملاقات کے لیے تشریف لاتے رہتے تھے اور پھر جب اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ تعمیر کرنے کا حکم دیا تو دونوں باپ بیٹا نے حکم الٰہی کی تعمیل میں بیت اللہ تعمیر کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مناسک حج کی تعلیم دی اور بس اسی وقت سے لوگ اطراف و اکنافِ عالم سے کشاں کشاں مکہ مکرمہ کی طرف کھنچے چلے آ رہے ہیں۔

سبحان اللہ! حضرتِ ابراہیم علیہ السلام جب عراق سے نکلے تو آپ کو قطعاً علم نہ تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے کیا کیا شاہکار دکھانے والے ہیں، بس آپ کو اسی قدر معلوم تھا کہ آپ اللہ کے حکم کے پابند ہیں۔ آپ کا دل کسی زمین یا وطن سے اٹکا ہوا نہ تھا، اللہ تعالیٰ کی مشیت تھی کہ آپ بلادِ شام میں توحید کا ایک مینار قائم کر دیں، لہٰذا آپ کے صاحبزادہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو بھی وراثتِ نبوت ملی اور پھر ان کے بعد ان کے بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام نبوت سے سرفراز ہوئے حتیٰ کہ باپ سے بیٹے کی طرف نبوت منتقل ہوتے ہوتے حضرتِ سلیمان علیہ السلام تک پہنچ گئی جنہوں نے یہاں مسجد اقصیٰ تعمیر فرمائی۔

مکہ مکرمہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی مصری بیوی حضرت ہاجرہؑ کو لا بسایا اور اللہ تعالیٰ نے اس سعادت مند خاتون کو سارے عرب کی ماں ہونے کا شرفِ عطا فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیلؑ

کو عربِ حجاز اور یمن کے لوگوں کی ہدایت کے لیے مبعوث فرمادیا۔ آپ نے انہیں دینِ حنیف کی دعوت دی جس پر انہوں نے لبیک کہا، اس دعوت کے آثار ابھی تک بالکل منقطع نہ ہوئے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اولادِ اسماعیلؑ میں سے خاتم الانبیاء والمرسلین حضرت محمد مصطفےٰ علیہم افضل الصلوٰۃ والتسلیم کو مبعوث فرمایا۔

اس طرح بلادِ شام کا جزیرۃ العرب سے رشتۂ اتحاد قائم ہوا کہ اوّل الذکر علاقہ میں حضرت اسحاق علیہ السلام نے توحید کی دعوت دی، جبکہ جزیرۃ العرب میں ان کے برادرِ اکبر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے توحید کے ترانے گائے۔ حضرت ابراہیم خلیل اس وحدتِ کریمہ کے قائد تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے دو گھر بنا دیئے تھے۔ ایک قدس میں اور دوسرا مکہ میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ان دونوں گھروں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سارا علاقہ دراصل ایک ہی ہے جسے مختلف حکومتوں اور سلطنتوں میں تقسیم نہیں کیا جانا چاہیے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوا کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسراء مکہ سے بیت المقدس تک تھا، جہاں آپ نے تمام انبیاء کرام و مرسلین عظام کی امامت کے فرائض سرانجام دیتے ہوئے انہیں نماز پڑھائی اور پھر وہیں سے معراج کے لیے آپ کو آسمانوں پر لے جایا گیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

سُبْحٰنَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ[1]

وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس) تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، لے گیا۔

اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو آپ کو مقدس کے بجائے مکہ ہی سے معراج کے لیے آسمانوں پر لا سکتا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت نے اس بات کو پسند فرمایا کہ پہلے آپ کو مکہ اور قدس کی سیر کرائی جائے اور پھر قدس سے معراج کے لیے لے جایا جائے، اس بات میں بھی اس امر کی ایک نہایت قوی دلیل ہے کہ قدس کا مکہ کے ساتھ ایک گہرا ربط اور تعلق ہے، چنانچہ حضرات صحابہ کرام کو بھی اس حقیقت کا ادراک

---

[1] سورۃ بنی اسرائیل،

تعیب ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بلادِ شام کو فتح کرنے کے لیے بڑی سرعت کا مظاہرہ دکھایا اور انہوں نے اقصیٰ کو بُت پرستی کی نجاست سے پاک صاف کر دیا۔ ادھر دشمنانِ خدا نے بھی کئی بار قدس کو مسلمانوں سے چھیننے کی کوشش کی، لیکن ان کی یہ کوششیں مسلمانوں کی قوت اور شان و شوکت کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہو سکیں۔ صاحب "خطط الشام" لکھتے ہیں،

"دنیا کو زمانہ قدیم ہی سے بلادِ شام کی اہمیت کا احساس ہو گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ علاقہ جنگجوؤں اور فاتحین کا بطورِ خاص ہدف بنتا رہا۔ بحر و بر کو عبور کرتے ہوئے فرعونی یہاں آئے، مشرق اور شمال کی جانب سے بابلیوں اور فارسیوں نے حملے کیے، مشرقی جانب سے غازان، ہلاکو اور تیمور لنگ حملہ آور ہوئے۔ جنوب مغربی بحری علاقے کی طرف سے نابلسیوں نے چڑھائی کی، مغرب اور جنوب مغربی بری و بحری راستوں سے ابراہیم پاشا مصری نے تسلط جمانے کی کوشش کی۔ انگریزوں، فرانسیسیوں اور عربوں ــ عربوں سے مصنف کی مراد فیصل بن حسین کے لشکروں سے ہے، ـ کے حلیف لشکروں نے جنوب مغرب کی طرف سے حملہ کر کے اسے زیرِ نگیں کرنے کی کوششیں کیں۔ شام نے حضرت عمر بن خطابؓ، حضرت ابو عبیدہ بن جراحؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، موسیٰ بن نصیرؒ، نور الدین زنگیؒ، صلاح الدین ایوبیؒ اور سلطان سلیم جیسے فاتحین کا جاہ و جلال، عمر بن عبد العزیزؒ اور ابن تیمیہؒ جیسے مجددین کی شان و شوکت اور بخت نصر، ہلاکو خان، چنگیز، غازان اور تیمور جیسے تخریب کاروں کی بھی تباہ کاریوں کا مشاہدہ کیا ہے۔" [1]

بلادِ شام کے مسلمانو! تم اس امر سے بخوبی آگاہ ہو کہ تمہارا یہ مقدس علاقہ مہبطِ وحی، حضرات انبیاء کرامؑ کا مسکن اور حضرت خلیل علیہ السلام کا مستقر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اوپر سے اس کی برکت کا اعلان فرمایا،

---

[1] خطط الشام، محمد کرد علی ۱/۱۲ــ۱۶

سُبۡحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا	وہ (ذات) پاک ہے جو ایک رات اپنے بندے کو
مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ	مسجد الحرام (یعنی خانہ کعبہ) سے مسجد اقصیٰ (یعنی بیت المقدس)
الۡاَقۡصَا الَّذِیۡ بٰرَکۡنَا حَوۡلَہٗ[1]	تک جس کے گرداگرد ہم نے برکتیں رکھی ہیں، لے گیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ارشادِ گرامی ہے:

طوبیٰ للشام ان ملائکۃ الرحمٰن	شام کے لیے خوشخبری ہو کہ رحمٰن کے فرشتے
باسطۃ اجنحتہا علیہ۔[2]	اس پر پرفشاں رہتے ہیں۔

اور پھر آخر الزماں میں تمہارا یہ شہر حضرت مسیح علیہ السلام کے نزول کا مشاہدہ بھی کرے گا جبکہ وہ امام مہدی کی امامت میں نماز پڑھیں گے۔ زمین میں شریعتِ الٰہی نافذ کریں گے اور اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے خلاف جہاد کر کے ان پر فتح و نصرت حاصل کر لیں گے۔

تو اے شام کے مسلمانو! تمہیں یہ کیا ہو گیا ہے کہ تم نے زمامِ اقتدار وطنیت و قومیت کے پرستاروں، عیسائیوں، ملحدوں اور باطنیوں کے سپرد کر رکھی ہے؟ آخر تم نے یہ کیسے باور کر لیا کہ یہ ملحد اور بے دین لوگ فلسطین کو یہود مردود کے پنجۂ ظلم و استبداد سے آزاد کرا سکیں گے؟؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں یہی سزا کافی ہے کہ تم نصف صدی سے یہودیوں کے آلام و مصائب کا تختۂ مشق بنے ہوئے ہو۔ آہ! کیا ابھی وقت نہیں آیا کہ تم اس حقیقت سے آگاہ ہو جاؤ ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی   نہ ہو جس کو خیال خود اپنی حالت کے بدلنے کا

اب بھی وقت ہے کہ تم صدقِ دل سے اللہ کی طرف رجوع کرو لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے پرچم تلے متفق و متحد ہو جاؤ۔ اُن تمام اسباب و وسائل کو استعمال میں لاؤ جن سے تمہارے شہروں کو وہ عظمتِ رفتہ حاصل ہو جائے جو کبھی حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام کے ایام میں حاصل تھی یا جو عظمت انہیں فتحِ اسلامی کے عہدِ زریں میں حاصل تھی ــــ وَمَا ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیۡزٍ!

---

[1] بنی اسرائیل ۱/۱   [2] ترمذی ۲/۲۳، امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث حسن ہے۔ مستدرک حاکم ۲/۱۸۴۔ علامہ البانی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث صحیح ہے۔ ملاحظہ فرمائیے سلسلۃ الاحادیث الصحیحۃ ۵/۵۰۳

دعوت الی اللہ

اور

انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کا طریقِ کار

تصنیف

الاستاذ محمد سرور بن نایف زین العابدین

ترجمہ

محمد خالد سیف

طارق اکیڈمی

ایس اے سنٹر چنیوٹ بازار فیصل آباد

☎ 34307-642958